ارضِ سمرقند و بخارا

وسطی ایشیا کی سوشلسٹ جمہوریتوں کا سفرنامہ اور تاریخ

عبداللہ ملک



ارضِ سمرقند و بخارا

وسطی ایشیا کی سوشلسٹ جمہوریتوں کا سفرنامہ اور تاریخ

عبداللہ ملک

باراوّل ______ ۱۹۸۰
تعداد ______ دوہزار
صفحات ______ ۲۸۰
[redacted] ______ [redacted]
ناشر ______ کوثر پبلشرز
طابع ______ پریمیئر پرنٹرز لاہور

کوثر پبلشرز - ۴۶ شوکت حیات کالونی
فون ۸۵۱۴۰ -- ماڈل ٹاؤن لاہور

انتساب

تاشقند یونیورسٹی کے

اُردو اساتذہ

طاش مرزا اور رحمان بردی محمد جانوف

کے نام

ایک نظم

ہنسو، کھیلو، مناؤ جشن، دورِ سوویت آیا
وہ امن و عافیت کا مژدہ راحت اثر لایا
جو خوں تم نے لٹایا، اسکی اک اک بوند کے بدلے
متاعِ علم و عرفاں خوابِ نازِ حریت پایا

رہے قائم و دائم اقتدارِ سوویت اپنا
زمانہ آگیا اب سر اٹھا کر اپنے جینے کا
دکھا دو اپنا جوہر آج اے مزدور کے بیٹو!
زمانے بھر میں دو اپنے جنوں کی داستاں پھیلا

ذرا سوچو غلامی تھا مقدر دورِ شاہی میں
ملی ہے اب جو آزادی کو اس کی قدر پہچانو
بناؤ اپنے ہاتھوں سے تم اپنا قصرِ خوش حالی
کہ اب ہر شے تمہاری ہے، یہ سمجھو اور یہی مانو

گراں خوابی سے جاگو اور آنکھیں کھول کر دیکھو
کہ اب محنت کا وقت آیا چڑھالو آستیں یارو!
مٹا دو ہر نشانِ جبر پچھلی زندگانی کا!
اٹھا کر پھینک دو ہر سنگِ مجبوری کہیں یارو

پرانی زندگی کے باغ ویراں ہیں انھیں چھوڑ دو
وہاں الو مچائیں شور یا زاغ و زغن بولیں
جو تم چاہو نئے گلشن کھِلیں اور ہر خیاباں میں
نشاط و شادمانی کے نئے غنچے دہن کھولیں

ترتیب

ان اوراق کے بارے میں

۱۹۷۸ء کے وسط میں سوویت یونین سے متعلق میری کتاب "ارض جنت" شائع ہوئی تھی، اس کے پیش لفظ میں اپنے عزائم کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ "یہ کتاب دراصل سوویت یونین سے متعلق میری تین کتابوں کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے دوسری کتاب سوویت یونین کی ایشیائی جمہوریتوں کی ترقی اور وہاں کے حالات سے متعلق ہوگی، ان جمہوریتوں کی مادی اور روحانی ترقی کا تذکرہ ہوگا۔ کیونکہ ہمارا خطہ وسطی ایشیا کی تہذیبوں سے بہت متاثر رہا ہے اور آج بھی ان خطوں سے ہمارے بہت گہرے نسلی اور لسانی روابط ہیں اس لئے ان خطوں کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ مالدار اور صاحبِ زر لوگوں اور ان کے حواریوں نے ان خطوں کے حوالے سے ہی سوشلزم اور سوویت یونین پر بہت کیچڑ اچھالا ہے اس لئے ضروری ہے کہ پاکستانی عوام تک ان خطوں کی صحیح صورت حال پہنچے" آج جب ۱۹۷۹ء کا نصف ختم ہونے کو ہے تو میں اپنے اس عزم، اس دعوے اور اس ارادے کی تکمیل کر رہا ہوں، ایسے موقع پر انسان کتنا مسرور و شادماں ہوتا ہے، میں بھی آج مسرور و شادماں ہوں کہ میں دو برس کے عرصے میں ہی اپنے اس عزم کی تکمیل میں کامیاب ہو گیا ہوں لیکن اس عرصے کے دوران میری دنیا ہی بدل گئی ہے۔

دراصل سوویت یونین سے متعلق کتابوں کا یہ سلسلہ میرے اس تفصیلی سفر کا نتیجہ تھا

جو میں نے اور میری بیوی نے اکٹھے کیا تھا۔ اس زمانے میں بھی میں نے وسطی ایشیا کی دو جمہوریتوں کا تفصیلی دورہ کیا تھا اور ازبکستان اور تاجکستان کے شہروں اور دیہات میں گھوما تھا اور ان سے متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ واپسی پر میں نے جب ان کتابوں کے سلسلے کا آغاز کیا تو پہلی کتاب سوویت یونین کے آئین سے متعلق ضروری سمجھی کیونکہ میرے سوویت یونین کے قیام کے دوران سوویت یونین کا نیا آئین زیر بحث آ رہا تھا جو پھر میری موجودگی میں ہی سپریم سوویت یونین کی طرف سے منظور کیا گیا اور اب وہ نافذ العمل ہے۔ چنانچہ "ارض جنت" میں سوویت یونین کے نئے آئین کی داستان بیان کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک طرح سے سوویت یونین کے انقلاب سے لے کر اب تک آئینی سطح پر جو تبدیلیاں سوشلزم کی اس وسیع و عریض تجربہ گاہ میں رونما ہوئی ہیں ان سب کا تذکرہ تفصیلی طور کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان موجودہ اوراق میں وسطی ایشیا کی مسلم جمہوریتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

یہ موجودہ اوراق شاید اتنی جلدی پایہ تکمیل کو نہ پہنچتے اگر ان جمہوریتوں کے متصل علاقوں میں زبردست تبدیلیاں اور انقلابات رونما نہ ہوتے۔ کیونکہ پاکستان، ایران اور افغانستان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے مغربی اور ان کے دیکھا دیکھی ہمارے ذرائع ابلاغ نے بھی پوری توجہ سوویت یونین کی ان جمہوریتوں کی طرف مبذول کر دی ہے اور مسلسل اس امر پر اصرار کیا جانے لگا کہ "اسلامی احیاء" کی تحریکیں سوویت یونین کی مسلم جمہوریتوں میں انقلاب بپا کر دیں گی اور وہاں سوشلسٹ نظام زندگی سے بغاوت کی تحریکیں اٹھنی شروع ہو جائیں گی۔

اس پراپیگنڈے نے میری ان جمہوریتوں میں پرانی دلچسپی پھر تازہ کر دی اور میں دوسری بار ان جمہوریتوں کے تفصیلی دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ مجھے ویسے بھی ان جمہوریتوں سے گہری دلچسپی ہے اور ان دلچسپیوں میں اکیلا میں ہی نہیں بلکہ پاکستان کیا اس پورے برصغیر کے شمالی علاقوں کے بسنے والے بالخصوص مسلمان ان علاقوں میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ ہم میں سے اکثر کے آباؤ اجداد انہی ازبک اور تاجک جمہوریتوں سے آئے تھے

آج بھی ان سے ہمارے تہذیبی رشتے موجود ہیں، سمرقند بخارا کے نام ہمارے اندر ایک رومان پرور ماضی کی یادوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں لکھنے کو میرا بہت جی چاہتا تھا اور اب تو اسلامی تحریکوں سے متعلق ان سوالوں کے جواب کی تلاش بھی ضروری تھی گو مجھے معلوم تھا کہ مغرب میں جو یہ پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے وہ غلط ہے۔ کیوں؟ اولاً جن تحریکوں کو اسلامی احیاء کی تحریکیں کہا جا رہا ہے وہ ہر ملک کے اپنے حالات کا نتیجہ ہیں اور یہ تحریکیں اپنی مخصوص معروضی حالات کی پیداوار ہیں ان میں بعض تحریکیں عوام کو آگے لے جاتی ہیں بعض ان کو رجعت کی طرف دھکیلتی ہیں لیکن اس کے باوجود میں یہ چاہتا تھا کہ میں خود ان نئے حالات میں جا کر دیکھوں، سنوں اور محسوس کروں کہ وہاں کے بسنے والے اپنے اردگرد رونما ہونے والی تبدیلیوں سے کیا تاثر لے رہے ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ میں پچھلی دفعہ جب تاشقند بخارا و سمرقند اور دوشنبے میں مہینہ بھر گھوما تھا تو اس وقت بھی مجھے ایک ہی جستجو تھی کہ میں یہ معلوم کر پاؤں کہ ایک ترقی یافتہ سوشلسٹ ملک میں جہاں سوشلزم کے تجربے کو ساٹھ برس سے زیادہ گذر گئے ہیں اور جہاں سے پسماندگی غربت اور جہالت کا قلع قمع ہو گیا ہے اس کی بجائے زندگی کی تمام آسائشیں میسر آگئی ہیں، قوت خرید کی فراوانی ہے۔ علم کی دولت بے پایاں ہے، روٹی روزگار کے مواقع ان گنت ہیں۔ بیروزگاری کا نام و نشان مٹ گیا ہے، زندگی کی بے سکونی ختم ہو گئی ہے اور سرمایہ داری نظام میں عدم تحفظ کی فضا جو ہم کو کھائے جاتی ہے وہ وہاں مفقود ہے اس لئے ایسی فضا میں یہاں کے بسنے والوں پر تہذیبی ردعمل کیا ہوا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ سوشلزم کے تحت رہتے ہوئے جہاں کا نظام سیکولر ہے اور جہاں حکومت کی طرف سے مذہب کی سرپرستی آئین کی رو سے نہیں ہو سکتی وہاں پر باشندوں کے اپنے مذہبی رویوں پر کیا بیتی ہے؟ اور ان تمام مادی تبدیلیوں آسائشوں اور فراوانیوں نے ان کا اپنے ماضی کے ساتھ کتنا ربط ضبط برقرار رکھا ہے اور کتنا ان کو اس ماضی سے دور کر دیا ہے؟

یہ سوالات بہت گنجلک ہیں، رویوں کو جاننا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ مادی تبدیلیوں

اور فراوانیوں کی کوکھ سے جنم لینے والے تہذیبی اثرات کا اندازہ لگانا خاصا صبر آزما ہوتا ہے کیونکہ مادی تبدیلیاں سامنے ہوتی ہیں، کارخانے اور کھیتوں کی ہریالی اعداد و شمار سے ناپی جا سکتی ہیں لیکن ان کے نتیجے میں جو تہذیبی اور روحانی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ اتنی آہستہ اور دبے پاؤں رونما ہوتی ہیں کہ ان کو سمجھنا اور پھر احاطہ تحریر میں لانا خاصا دقت طلب کام ہوتا ہے۔ اس لئے میں ان خطوں میں بار بار گھوما ہوں، یہاں کے اہل علم و دانش سے گھنٹوں مصروف گفتگو رہا ہوں، ان کے گھروں میں گیا ہوں ان کی بیویوں، بیٹیوں سے ملا ہوں، پرانی نسل سے بھی متعارف ہوا ہوں اور نوجوان نسل سے بھی گھلا ملا ہوں تب جا کر میں اپنے کو اس قابل پا رہا ہوں کہ میں یہ اوراق لکھ پاؤں۔ وگرنہ ایک طرف ہمارے ہاں سوویت یونین اور سوشلزم کے مخالف یہ کہہ کر آگے گذر جاتے ہیں کہ سوویت یونین کی ان وسطی ایشیا کی جمہوریتوں میں اسلام ختم ہو گیا ہے، مساجد ختم کر دی گئی ہیں، قرآن کی اشاعت ممنوع ہے وغیرہ وغیرہ اور ان جمہوریتوں کی حکومتیں جب امیر خسرو، ابن سینا اور امام بخاری کی یادیں مناتی ہیں۔ پندرہویں ہجری کے آغاز کے موقع پر تقریبات کا اہتمام کرتی ہیں یا پھر اپنی مساجد میں نماز ادا کرتے ہوئے نمازیوں کی تصاویر بھی شائع کرتی ہیں تو پھر بھی ہم کم ہی اعتبار کرتے ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ سب پراپیگنڈہ ہے، یہ سب ہم کو دکھانے کے لئے کیا جاتا ہے ورنہ حقیقت کچھ اور ہے غرضیکہ سوویت یونین کے خلاف ہمارے ذہنوں پر غلط فہمیوں کی اتنی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہیں کہ وہ اترتی ہی نہیں اور اس پر مغربی ذرائع ابلاغ اور اب ان کی رفاقت میں عالمی اسلامی کونسل والے بڑھ چڑھ کر سوشلسٹ دنیا کے خلاف پراپیگنڈہ میں مصروف ہیں کہ ان ممالک میں مذہب کو ختم کر دیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

یہ ہیں وہ مسائل جن کو میں ان صفحات زیر بحث لایا ہوں، ان کے لئے میں نے تاریخ کھنگالی ہے اور سماجی علوم بھی، اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان جمہوریتوں کی ترقیوں کی روئیداد بھی بیان کی ہے اور اپنا روزنامچہ بھی ان اوراق میں شامل کر دیا ہے لیکن سب سے پہلے میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ سوویت یونین کے خلاف ہمارے

ہاں جو ایک اجنبیت اور تلخی پائی جاتی ہے ان کی وجوہات اور ان وجوہات کی پشت پر کام کرنے والی روایات اور نفسیات پر کچھ روشنی ڈالی جائے اور اس عمل پر تفصیلی روشنی وسطی ایشیا کے تاریخی ارتقا اور روس کے تسلط کے ابواب میں کیا گیا ہے کیونکہ اس خطے میں زارشاہی اور برطانوی شہنشاہیت کی رقابت نے بھی ہماری خاص قسم کی نفسیات کی تخلیق اور نشو نما میں اہم رول ادا کیا ہے جن شکوک و شبہات کی فضا کے بارے میں پہلے باب میں اجمالاً تذکرہ ہے اس کا تفصیلی مطالعہ میری آئندہ کتاب کا موضوع ہے۔

عبداللہ ملک

تاریخی پس منظر

شکوک و شبہات

آج ۱۹۸۰ء کے ابتدائی مہینوں میں جب یہ سطور سپرد قرطاس کی جا رہی ہیں تو پاکستان کی حکومت اور سوویت یونین کے تعلقات میں خاصی تلخی پائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی حکومتیں اور ان کے حامی طبقے آج ہی نہیں بلکہ شروع دن سے کسی نہ کسی انداز میں سوویت یونین سے ایک حد تک نفرت کرتے رہے ہیں اس لحاظ سے پاکستان اور سوویت یونین کے تعلقات کی تاریخ خاصی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہے اور ہم شروع دن سے سوویت مخالف کیمپ میں کسی نہ کسی انداز میں رہے ہیں کیونکہ جب پاکستان وجود میں آیا تو دوسری جنگ عظیم کے شعلے تو بجھ چکے تھے لیکن سرد جنگ کی چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہو رہی تھیں اور امریکہ کی قیادت میں سرمایہ اور سامراجی ممالک سوشلزم کی مقبولیت اور مشرقی یورپ میں سوشلسٹ نظام کی استواری کو اپنے لئے ایک زبردست چیلنج تصور کر رہے تھے چنانچہ ہم بھی بدقسمتی سے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی اس سرد جنگ کی لپیٹ میں آ گئے اور جب سوویت یونین کی طرف سے ہمارے پہلے وزیر اعظم کو سوویت یونین کے دورے کی دعوت ملی حالانکہ یہ دعوت بھی ہم نے خاصی تگ و دو کے بعد حاصل کی تھی تو بجائے اس کے کہ ہم اس دعوت سے شریفانہ طور پر استفادہ کرتے ہم نے امریکہ سے محبت والفت کے رشتے استوار کرنے کی بنیاد ڈالنے کے لئے استعمال کیا اور اس طرح سے غلط فہمیوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کو جنم دیا اور جوں جوں ہم سرد جنگ میں ملوث ہو کر امریکہ کی طرف جھکتے گئے سوویت یونین کی دوری بھی بڑھتی

گئی حالانکہ اگر ہم غیر جذباتی سطح پر ذرا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ سوویت یونین نے متعدد بار ہماری طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ سب سے پہلے ہماری غذائی ضرورت کے لئے سوویت یونین ہی تھا جس نے ہمیں امداد دی یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے پھر اسی زمانے میں دو طرفہ تجارت کے لئے سوویت یونین نے راہ ہموار کی پھر ۱۹۵۶ء میں باقاعدہ تجارتی معاہدہ ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں تیل کی تلاش کا معاہدہ ہوا ۱۹۶۹ء میں سٹیل مل کے تنصیب کا معاہدہ ہوا۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دور اقتدار میں دو بار سوویت یونین کا دورہ کیا لیکن اس کے باوجود ہمارے اندر سوویت یونین کے بارے میں تلخیاں اور غصہ ہے کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا اور اب افغانستان کے قبضے نے تو غصہ اور بھی بڑھا دیا۔ لیکن آخر ایسا کیوں ہے یہ بہت ہی اہم موضوع ہے اور اس موضوع پر میں اپنی تیسری کتاب "پاکستان اور سوویت یونین کے تعلقات" کے ضمن میں تفصیل سے روشنی ڈالوں گا لیکن یہاں پر میں صرف چند اہم نفسیاتی پہلوؤں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔

سوویت یونین کے خلاف محاذ آرائی اور نفسیاتی فضا بنانے میں نوائے وقت پیش پیش رہا ہے اور سوشلسٹ دشمنی اس کا خاصہ ہے چنانچہ وہ اپنی سوویت یونین دشمنی کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے اداریے میں لکھتا ہے یہ ۱۲ نومبر ۱۹۷۶ء کو رقم ہوا تھا اس میں نوائے وقت لکھتا ہے۔

"روس اور پاکستان کے باہمی تعلقات کی تاریخ کافی طویل ہے اگرچہ اب پاکستان کی طرف سے دوسرے ملکوں کی طرح روس سے بھی دو طرفہ تعلقات کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن بھارت کے معاندانہ عزائم نے پاکستان کے لئے ایک اور جہت سے بھی باہمی تعلقات کے ضمن میں بھی یہ "اور جہت" ہمیشہ پس منظر میں رہتی ہے سیدھی ہے اور عام فہم الفاظ میں اس "اور جہت" کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح عالمی حالات اور اپنے مفادات کی وجہ سے روس ہر معاملے میں امریکہ کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح اہل پاکستان بھی اپنے حالات اور بھارت کے ہاتھوں لگنے چرکوں کی وجہ سے بھارت کے حالات خاص طور پر ایسے اقدامات سے بے نیاز ہونے کی غلطی کے روادار نہیں ہو سکتے جو پاکستان پر بھی اثر انداز

ہو سکتے ہیں۔"

یہ دراصل اسی روایت کا حصہ ہے جو ہمیں قریب قریب دو نسلوں سے ورثے میں ملی ہے اور ہم نے اس کو اپنے لاشعور میں اس طرح رچا بسا لیا ہے کہ اب ہم کو حقائق جب خلاف بھی نظر آتے ہیں تو ہم ان کے جواز کے لئے دوسرے جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہم آج کی عالمی ضرورتوں اور تاریخ کے جبر کے تحت تو سودیت روس کے ساتھ دوطرفہ تعلقات کی بات کرتے ہیں۔ لیکن عملاً ایسا کرنے کو ہمارا دل نہیں چاہتا اور جب ہم اس کے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں تو ہمیں سودیت روس کا کشمیر کے بارے میں رویہ یاد آجاتا ہے۔ چنانچہ سودیت روس کے انہی رویوں کا ذکر "روس سے تعلقات" کے عنوان سے لکھے ہوئے ۸ نومبر ۷۶ء کے نوائے وقت کے اداریے میں لکھا ہے۔

"اس معیار پر روس اور پاکستان کے تعلقات کا جائزہ لیں تو کوئی خوش گوار منظر نہیں ابھرتا کشمیر کے مسئلے پر روس نے کھل کر بھارت کی غیر منصفانہ اور جارحانہ پالیسی کی حمایت کی بھارت نے سازش و جارحیت سے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی تو اسے یہ جرأت بھی روس کی پوری اعانت حاصل کر لینے کے بعد ہوئی، اہل پاکستان اپنے صدموں کو جو روس کی وجہ سے انھیں پہنچے ہیں۔ کس طرح بھلا سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں ان کے دلوں میں جو تلخی اور رنجش ہے اسے اب روس ہی اپنی پالیسی میں خوش گوار تبدیلی سے دور کر سکتا ہے۔"

اب اگر نوائے وقت کے بیان کردہ حقائق کو بغیر کسی تجزیے کے درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ صورت حال پیدا ہونی چاہیئے کہ جب سودیت روس نے بھارت کو فوجی امداد اور اسلحہ مہیا نہیں کرنا شروع کیا تھا تو ہمارے سودیت روس کے تعلقات بہتر تھے اور غیریت و اجنبیت کی کوئی دیوار۔ سدِ راہ نہ تھی اگر واقعی ایسا تھا تو ہم نے ۱۹۴۹ء میں سودیت روس کے دورے کی دعوت کو قبول کر کے امریکہ کا دورہ کیوں شروع کر دیا؟ آج تو یہ امر کوئی وجہ نزاع نہیں ہے لیکن اس وقت پاکستان کے کتنے اخبارات نے اس مہلک غلطی پر اداریے رقم کئے تھے اس وقت تو سودیت روس بھارت کی طرف نہیں جھکا تھا! کشمیر کے معاملے میں اس نے کسی جانب داری کا اظہار نہیں کیا تھا اور ریڈکلف ایوارڈ سودیت روس نے تو نہیں دیا تھا، گورداسپور کا علاقہ سودیت روس کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بھارت کا حصہ تو نہیں بنا تھا اور امریکہ نے بھی

ان ریشہ دوانیوں کا کوئی پردہ چاک نہیں کیا تھا۔ اس لئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ سوویت روس سے ہماری اتنی غیریت کیوں چلی آرہی ہے؟ اور یہ کہنا کہ صرف لیاقت علی خاں کی غلطی تھی۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارے عام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت اس سوویت دشمنی کی روایت میں جکڑی ہوئی تھی اور تو اور قیام پاکستان سے بھی پہلے مسلم لیگ کے بعض بہت ہی اہم رکن سوویت دشمنی میں پیش پیش تھے۔ لطف یہ ہے کہ ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو پنڈت نہرو نے ایک تقریر کی جس میں کہا گیا کہ ہندوستان کو سوویت روس سے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن اس کے دوسرے دن فیروز خاں نون نے پنڈت نہرو کے جواب میں بیان دیا کہ ہندوستان کو اگر کسی سے خطرہ ہے تو وہ سوویت روس ہے اور پھر اگست ۱۹۴۷ء کو نوائے وقت کے اداری صفحہ پر "نہرو، نون اور روس" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر ہندوستان کو کسی ملک سے خطرہ ہے تو وہ روس ہے اور پنڈت نہرو کے اس موقف کا مذاق اڑایا گیا تھا یہ تمام ماضی کی باتیں ہیں لیکن ماضی کی باتیں ہماری ایک روایت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اور یہ روایت اکثر و بیشتر پاؤں کی زنجیر ہوتی ہیں ترقی اور آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ورنہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر سوویت روس سے ہماری اتنی غیریت کیوں چلی آرہی ہے؟ لطف یہ ہے کہ برطانیہ جس کے ہاتھوں ہم نے صدیوں مظالم سہے اس سے تو ہمارے تعلقات بہتر ہوں۔ اس کے خلاف قطعاً کوئی نفرت نہ ہو، کسی قسم کا ظلم بھی یاد نہ ہو اگر یاد ہو بھی تو وہ ہماری روایت کا حصہ نہ بن پائے اور تو اور ہم قومی پیمانے پر جلیانوالہ باغ کا یوم منانے تک سے گریز کریں۔ امریکہ کی چیرہ دستیاں، اس کے مظالم سی آئی اے کی طرف سے آزاد حکومتوں کے تختے الٹنا ان سب کا تذکرہ ہم اپنے اداریوں میں کرنے سے گریزاں ہوں لیکن سوویت روس جو ہمارا قریبی ہمسایہ ہے، جو ایک عظیم طاقت بھی ہے اس کے خلاف ایک گونہ نفرت، یا پھر خوف اور ڈر کے جذبات موجود ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا یہ غیریت صرف انکی بھارت دوستی کی وجہ سے ہے، یا پھر اس لئے ہے کہ وہاں سوشلسٹ نظام ہے اور وہاں پر اراضی ہو یا کارخانے، کاروبار ہو یا تجارت تمام ذرائع پیداوار محنت کشوں اور ان کی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ یہ درست ہے کہ اس برصغیر کے انگریز حکمرانوں نے ہمارے امراء

جاگیردار، زمیندار اور سرمایہ دار طبقے کو مدتوں سوویت روس کے کمیونزم اور بولشویزم کا ہوا دکھا کر ڈرایا گیا تھا اور مدتوں بولشویک کے نام سے سہمے رہے۔ لیکن اب تو صورت حال مختلف ہے آج ہم عوامی جمہوریہ چین سے گہری دوستی رکھتے ہیں اور اس کے سوشلزم کے نظریے اس کے نظریات کے باوجود رائے عامہ میں محبت اور تعریف کے جذبات موجود ہیں تو پھر سوویت روس سے غیریت کا کلیتہً وجہ یہ سوشلسٹ نظام تو نہ ہوا۔ تو کیا پھر سوویت روس سے ہماری غیریت اس لئے ہے کہ وہ ایک لادین ریاست ہے جو مارکسزم، لینن ازم کے اصولوں پر کاربند ہے جو مذہب کو ایک نجی حیثیت دیتے ہیں تو یہ صورت حال تو بہت سے ممالک میں ہے برادر چین میں بھی یہی ہے، ماؤزے تنگ اس صدی کے عظیم کمیونسٹوں میں سے تھا۔ اور اس کی تعریف اور خراج عقیدت پیش کرنے میں ہمارے عوام اور قائدین اور اخبارات نے کوئی پس و پیش نہیں کی۔

تو پھر اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ سوویت روس کے خلاف جو شکوک شبہات ہیں ان کی وجہ صرف سوویت روس کے اعتقادات یا سوشلزم پر اس کا ایمان اور ان اصولوں کے تحت اپنی زندگی اور نظام کو ڈھالنا ہی نقطہ وجہ نفرت ہے لیکن وہ اس نفرت کو بہت سے لبادوں میں ڈھال کر ہماری روایت اور نفسیات کا حصہ بنانا چاہتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سوویت روس میں مذہب سے بیگانگی اور لاتعلقی بھی وجہ نفرت نہیں بن سکتی کیونکہ عوامی جمہوریہ چین کون سا مذہب پرست ملک ہے برطانیہ اور امریکہ میں کون کون سی اسلام دوستی کی نہریں بہہ رہی ہیں جو سوویت روس سے وجہ نفرت بنے تو پھر آخر شکوک و شبہات کیوں ہیں؟ ممکن ہے بہت سے لوگ اس سوال کا جواب پچھلے دو تین برس کے واقعات کی روشنی میں ڈھونڈنے کی کوشش کریں کہ اولاً سوویت روس نے ہندوستان سے معاہدہ کیا، دوئم بنگلہ دیش کی تخلیق میں ان کے نزدیک سوویت روس کی عملی حمایت بھارت کو حاصل تھی۔ اور اب افغانستان کا معاملہ ہے۔ اگر یہ باتیں درست بھی ہوں تو کیا ان واقعات سے پہلے سوویت روس سے ہمارے تعلقات کوئی زیادہ بہتر تھے۔ کیا اس سے پہلے غیریت و اجلیت نہ تھی کیا اس سے پہلے شکوک و شبہات نہ تھے۔ میرے نزدیک تھے جب معاہدہ تاشقند ہوا اور اس کے خلاف یہاں آواز اُٹھی اور باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کی۔ تو اس کی تہہ میں بھی سوویت روس کے خلاف شکوک و شبہات کو بہت بڑا

دخل تھا۔ یہ درست ہے کہ جس طرح ہم شکوک و شبہات کا شکار رہے ہیں اور اب بھی ہیں اسی طرح سوویت روس ہمارے رویے سے شاکی رہا ہے اور ممالک کی خارجہ پالیسی اور تعلقات کی عمارت کا ڈھانچہ بھی اسی طرح استوار ہوتا ہے جس طرح انسانی تعلقات پروان چڑھتے ہیں جس طرح انسانی تعلقات میں ہزار ہا پیچ و خم رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ممالک کے تعلقات بھی کبھی ہاتھ کی لکیر کی طرح ہمیشہ قائم و دائم نہیں رہتے۔ ان میں بھی گریز، قربت اور غیریت رونما ہوتی رہتی ہے اس لئے ہمیں کسی بھی ملک سے اپنے تعلقات کا تجزیہ کرنے سے پہلے تاریخ کے دھارے اور ان روابط کے پس منظر کو پوری طرح جاننا چاہیئے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر حاکم طبقے اپنے خصوصی مفادات کے پیش نظر رائے عامہ کو مختلف نوع کے تعصبات، شکوک و شبہات اور نفرت کے جذبات میں الجھا دیتے ہیں اور یہ الجھاؤ صدیوں تک پاؤں کی زنجیر اور روح کی گھٹن بنے رہتے ہیں۔ چنانچہ سوویت روس کے خلاف نفرت بھی اسی الجھاؤ اور انہی تعصبات کا شاخسانہ ہے اور لطف یہ ہے کہ ان تعصبات اور غلط فہمیوں کی تاریخ قریب قریب سوا سو برس پرانی ہے۔

نفرت کی طویل داستان

برطانوی حکومت نے جب اس برصغیر کو اپنے تسلط میں لینے کے طویل عمل کو مکمل کیا تو اس وقت تک وہ تمام یورپی طاقتوں کو جو اس برصغیر کے تسلط کے سلسلے میں اس کی حریف ہو سکتی تھیں؛ شکست دے چکی تھی کیونکہ یہ تمام کی تمام طاقتیں سمندر کے ذریعے ہی اس برصغیر پر قدم جمانے کے منصوبے لے کر نکلی تھیں چنانچہ ولندیزی ہوں، پرتگیزی یا فرانسیسی وہ سب کے سب برطانیہ کے ہاتھوں پٹ چکے تھے لیکن جب ۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پنجاب اور برصغیر کی شمالی سرحد کو اپنے قبضہ میں لیا تو اس کو ایک نئے حریف سے پالا پڑا۔ یہ حریف تھا زار روس جو وسطی ایشیا تک اپنے پاؤں جما چکا تھا اور برطانیہ کو یہ مستقل خطرہ تھا کہ زار کا روس ہندوستان کی طرف بڑھنے کے ارادے رکھتا تھا۔ چنانچہ پچھلی صدی کے نصف سے یہ وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جب برطانوی حکومت کو ہندوستان کی حفاظت کے لیے شمالی سرحدوں پر

ہر وقت نگاہ رکھنی پڑتی ہے اور افغانوں کے خلاف کئی جنگیں لڑی گئیں۔ وہ دراصل زارشاہی کے مقابلہ میں اپنی طاقت کو مضبوط بنانے کے لئے تھیں۔ چنانچہ یہ وہ دور تھا جب برطانیہ نے شمالی ہندوستان کے علاقوں میں بالخصوص روس کے خلاف ایک زبردست ذہنی اور جسمانی فضا تیار کرنی شروع کی اور ہر وقت روس کا ہوّا کھڑا کر کے فوجوں کو تیار رکھا جاتا۔ چنانچہ والی افغانستان امیر عبدالرحمٰن نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے "افغانستان چکی کے دو پاٹوں میں پھنسا ہوا ہے اور پس رہا ہے اور پس پس کر اس کا ملیدہ ہو رہا ہے"۔ اپنی ان ہی یادداشتوں میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے "میرے ملک کی مثال اس بھیڑ کی مانند ہے جس پر شیر اور ریچھ دونوں کے پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور یہ بھیڑ خدائے ذوالجلال کے فضل و کرم کے بغیر زندہ نہیں بچ سکتی"۔ چنانچہ پچھلی صدی میں کئی ایک مواقع ایسے آئے جب روسی فوجیں افغان سرحد پر جمع ہونی شروع ہو گئیں۔ اور اس کے جواب میں ہندوستان کے اندر بھی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ چنانچہ روس کی فوجی تیاریوں کو ماننے اور وہاں پر اپنے حق میں فضا پیدا کرنے کے لئے انگریز حاکم مسلسل یہاں پنجاب اور سرحد ہی نہیں بلکہ پورے شمالی ہند سے مسلمان عالموں اور دانشوروں کو ان خطوں کے حالات جاننے اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کو اکسانے کے لئے بھیجتے رہے اب جب یہاں سے عالموں اور دانشوروں کو بھیجا جا رہا ہو تو یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کو اس امر پر بھی تو قائل کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ روس کے عزائم صرف خطرناک ہی نہیں بلکہ اس کی ایک ایسی تصویر کھینچی جائے گی جو ہمارے دلوں میں نفرت پیدا کرے جو غیض و غضب کو ہوا دے۔ چنانچہ جب شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اسی مقصد کے لئے وسطی ایشیا گئے تو ان کے دل میں کچھ اس قسم کے تاثرات تھے۔ غرضیکہ پہلی جنگ عظیم تک زارشاہی کے مسلسل خطرے نے برطانوی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کے اندر روس کے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ کرے چنانچہ یہی پراپیگنڈہ اور یہی نفرت کی فضا تھی جس نے جاپان اور روس کی جنگ میں روس کی شکست پر ہم نے خوشی کے شادیانے بجائے اور اس کو اپنی فتح سمجھا۔ چنانچہ اس دور میں دو سامراجی ممالک کے تضادات تھے اور ان تضادات میں ہم ذہنی اور روحانی طور پر برطانوی سامراج کے حامی تھے اور روس کے متنفر برطانیہ کے مسلسل پراپیگنڈہ نے روس سے نفرت کو ہماری نفسیات

اور روایات کا حصہ بنا دیا۔ اور برطانوی حکومت نے زارِ شاہی اور روس کے خلاف نفرت کی۔ اس فضا کو پورے برصغیر میں بالالتزام پھیلانے کی کوشش کی لیکن نفرت کے اس پروپیگنڈہ کا سب سے زیادہ زور شمالی ہندوستان کے ان خطوں میں روا رکھا گیا جہاں اوّلاً مسلمان بہت بڑی تعداد میں بستے تھے۔ دوئم سرحدی علاقے تھے۔ سوئم چونکہ خطرہ یہ درپیش تھا کہ زار روس اپنے وسطی ایشیا کے خطوں کے ذریعے ہی ہمارے خطوں میں توسیع کی مہم شروع نہ کرے اور کہیں سوشلزم کے حوالے سے شمالی ہند کے مسلمانوں کو متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے اس لئے شمالی ہند کے مسلمانوں کو اس سے پہلے کہ روس متاثر کرے پہلے ہی نفرت کے حصار میں گھیر لینا چاہیئے۔ چنانچہ روس کے خلاف یہ نفرت کی فضا تھی جس میں روس انقلاب سوویت یونین اور ۱۹۱۷ء کا انقلاب کی زد میں آگیا۔

مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جب پاکستان اور سوویت روس کے تعلقات کے متعلق بحث و تمحیص ہوتی ہے تو سوویت روس کے انقلاب اور اس انقلاب سے پیدا شدہ صورت حال کو ملحوظ خاطر ہی نہیں رکھا جاتا اور جب ہم دو عظیم (SUPER POWERS) طاقتوں کی بھی بات کرتے ہیں تو یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ امریکہ اور روس کی عظمت کا ڈھانچہ مختلف بنیادوں پر ایستادہ ہے اس لئے جب تک سوویت روس کے انقلاب اور اس انقلاب کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے نظام مملکت کے بارے میں ہم نہ جانیں اس وقت تک کسی ملک کی خارجہ پالیسی اور اس کے خدوخال کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ اصل میں خارجہ پالیسی اندرونی صورت حال کا ہی پرتو ہوتی ہے بقول لینن، "سماج کے وہ طبقے جو آج حکمران ہیں ان کے اقتصادی اور معاشی مفادات ہی ملکوں کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں کی بنیاد بنتے ہیں"۔ اس لئے سرمایہ داری نظام کے حامی ممالک اور سوشلزم کے حامی ممالک کی خارجہ پالیسیوں کو اس نظر سے بھی دیکھنا چاہیئے کیونکہ ان دونوں نظاموں کے بنیادی اختلافات کی بنا پر خارجہ پالیسیوں میں بھی نمایاں فرق ہوتا ہے اور بعض حالات میں بظاہر دونوں نظاموں کے ممالک ایک ہی سمت سفر کر رہے ہوتے ہیں لیکن اپنی بظاہر ہم آہنگی کے باوجود ان کے طریق کار اور عزائم میں ایک بنیادی فرق بدستور قائم رہتا ہے اور

نتائج بھی مختلف بر آمد ہوتے ہیں اس لئے کہ جہاں تک سرمایہ داری نظام کے حامل ممالک کا تعلق ہے وہ ہر حال میں لوٹ کھسوٹ کی پالیسی پر کاربند نظر آتے ہیں اور یہ لوٹ کھسوٹ اندرون ملک بھی ہوتی ہے اور بیرون ملک بھی۔ کیونکہ اگر کسی ملک کے نظام کی بنیاد نجی ملکیت کا تحفظ اس میں اضافہ اور منافع خوری ہو تو ظاہر ہے کہ جہاں اندرون ملک استحصال ہوگا وہاں ہر وقت خواہش یہی ہوگی کہ ہر باہر کی دنیا پر بھی اس کا تسلط ہو، اس کی تیار کردہ اشیاء زیادہ سے زیادہ منافع پر فروخت ہوں اور خام مال سستے سے سستے داموں ملے چنانچہ مغربی ممالک کی ایشیاء میں یلغار کی پشت پر بھی یہی جذبہ کارفرما تھا اور آج بھی ہے جب مغربی ممالک امداد و اعانت کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں تو اس کی پشت پر بھی یہی خواہش پوشیدہ ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوویت روس اور دوسرے سوشلسٹ ممالک بھی امداد و اعانت دیتے ہیں تو کیا ان کی امداد و اعانت کی پشت پر بھی یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے؟ نہیں۔ اس کی وجوہات ہیں اور سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ سوویت روس جس کی بات ہو رہی ہے کو لیجئے وہاں ۱۹۱۷ء میں جب سوشلسٹ انقلاب کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ذرائع پیداوار خواہ وہ کارخانے ہوں ہو یا زمین کاروبار ہو یا تجارت ان سب پر حکومت کا قبضہ ہوگا اور یہ حکومت مزدوروں، کسانوں، عام فوجیوں اور ذہنی کام کرنے والے لوگوں کی پنچایتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی اسی کو پرولتاریہ کی آمریت کہا جاتا، اور سوویت روس اور کمیونسٹ نظریات کے مطابق جمہوریت کی اعلیٰ ترین یہی صورت ہے کیونکہ ان کے نزدیک زمیندار اور مزارع کارخانے کے مالک اور اس میں کام کرنے والے مزدور کو ووٹ کا حق دے کر بھی صحیح معنوں میں جمہوریت قائم نہیں ہو پاتی یہ زیادہ سے زیادہ بورژوا جمہوریت ہو سکتی ہے یعنی اوپری طبقے کی جمہوریت جو دکھاوے کی جمہوریت ضرور ہوتی ہے لیکن صحیح جمہوریت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جب تمام ذرائع پیداوار نجی ملکیت سے نکل کر وسیع پیمانے پر محنت کشوں کے قبضے میں چلے جائیں گے تو پھر دوسرے ممالک پر قبضہ کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی اور نوآبادیاتی نظام اور دوسرے ممالک پر دھونس اور دھاندلی کا رجحان بھی ختم ہو

جائے گا۔ چنانچہ سوویت روس کے انقلاب کے قائد لینن نے ۸ر نومبر ۱۹۱۷ء کو جو پہلا فرمان جاری کیا تو اس میں نوآبادیاتی نظام کی شدید مذمت کی گئی، ۳ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو روسی حکومت نے روس اور مشرق کے تمام مسلمانوں کو ایک پیغام بھیجا جس میں ان پر زور دیا گیا تھا کہ وہ صدیوں پرانی غلامی کا جوا اتار پھینکیں اور جدوجہد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ بہترین وقت ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب غیر ملکی غلامی میں جکڑے ہوئے ہندوستانی مسلمان جابروں اور سامراجیوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز کر رہے تھے اور ہمارے ہاں ہجرت کی تحریک زوروں پر تھی اور جب افغانستان نے مہاجروں کو اپنے ملک سے نکال دیا تو سوویت روس نے ان کو پناہ دی۔ سوویت روس نے مسلمانوں کے نام پیغام میں ان کے مذہب، ان کی روایات، ان کی قومی وثقافتی اقدار کی آزادی کی ضمانت دی تھی۔ اس پیغام میں مسلمانوں کو کہا گیا تھا کہ انہیں آزادانہ ماحول میں اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے آزادی ہوگی۔ چنانچہ سوویت روس نے انقلاب کے فوراً بعد زار روس کی طرف سے کئے گئے تمام خفیہ معاہدوں کو نہ صرف شائع کر دیا بلکہ ان تمام علاقوں سے دستبرداری کا اعلان کر دیا جو ان خفیہ معاہدوں میں زار روس نے ہتھیائے ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان مشکل کے دنوں میں جب خود سوویت روس سامراجیوں کے نرغے میں تھا تو اس وقت بھی اس نے دوسرے ممالک کی آزادی کی جدوجہد میں بھرپور امداد کی، ترکی جو اسی دور میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور اتاترک کی قیادت میں آزادی کے لئے شمشیر بدست لڑ رہا تھا تو سوویت روس نے اس کو "سونا" بھیجا تاکہ وہ اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پا سکے، ہتھیار بھیجے دوائیں بھیجیں تاکہ یونانیوں اور رجعت پسند ترکوں کو شکست دے کر ترکی اپنی آزادی برقرار رکھ سکے۔ ۱۹۲۱ء میں اتاترک نے سوویت کے سوشلسٹ انقلاب کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ اس انقلاب کے نتیجہ میں مشرق کے عوام کو آزادی نصیب ہوئی اور ترکی کے قائد مصطفےٰ کمال اتاترک نے برملا اس امر کا اعتراف کیا کیونکہ سوویت روس کے سوشلسٹ انقلاب کی وجہ سے وہ آزادی حاصل کرنے کے قابل ہوئی۔

مارچ ۱۹۱۹ء میں سوویت روس پہلا ملک تھا جس نے افغانستان کی آزادی کے اعلان کا خیر مقدم کیا، ۱۹۲۱ء میں سوویت روس نے ترکی، ایران اور افغانستان کے ساتھ دوستی کا

معاہدہ کیا۔ چنانچہ ان سب باتوں اور واقعات کے سرسری تذکرے کا مقصد صرف یہ بات ذہن نشین کرانا ہے کہ سوویت روس کا یہ سوشلسٹ انقلاب اور نئے نظام کا قیام پچھلے تمام انقلابوں اور نظاموں سے مختلف تھا۔ اس سے صرف حکمران نہیں بدلے بلکہ طبقات کی بالادستی اور ان کے توازن میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی، پہلی بار تاریخ میں زیردست، نجی ملکیت اور ذرائع پیداوار سے محروم طبقوں کی بالادستی حاصل ہوئی اور یہ ذرائع پیداوار مشترکہ ملکیت میں چلے گئے یہ تبدیلی، یہ انقلاب سامراجی ممالک جن کا انحصار ہی نوآبادیاتی نظام پر تھا کو کسی صورت میں گوارا نہ تھا اور وہ اس انقلاب کو کسی بھی صورت میں کامیاب و کامران نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ اس انقلاب کو ناکام بنایا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سوویت انقلاب کے فوری بعد سوویت روس کو سامراجی ممالک کا تختۂ مشق بننا پڑا اور تمام سرمایہ دار اور سامراجی ممالک کی افواج نے اس انقلاب کو ناکام بنانے اور زار کے حامیوں کی امداد و اعانت کے لئے بھرپور کوشش کی اور باقاعدہ فوجیں اتار دیں لیکن سوویت روس کے انقلاب نے مزدوروں کسانوں اور فوجیوں کے اندر ان پالیسیوں اور ان اقدام سے ایک نیا جذبہ بیدار کر دیا تھا اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں اس پہلے انقلاب کی مدافعت کے لئے روس کے محنت کشوں کو ایک ایسی طاقت میں تبدیل کر دیا جو ناقابل تسخیر ثابت ہوئی اور انہوں نے اپنی بہادری، جرأت اور جیالے پن سے اس سوشلسٹ انقلاب کو محفوظ رکھا۔ انقلاب کی اس حفاظت اور مدافعت میں دنیا بھر کے مزدوروں کا بھی حصہ ہے مختلف ملکوں بالخصوص ان سامراجی ممالک کے مزدوروں نے جو سوویت روس میں فوجیں اتار رہے تھے نے اپنے حاکموں کی پالیسیوں اور سوویت روس میں فوجی مداخلت کے خلاف زبردست مظاہرے کئے۔ انقلابیوں کی فتح کے لئے دعائیں مانگیں، بندرگاہوں پر گودی مزدوروں نے ہڑتالیں کیں اور فوجی سامان لادنے سے انکار کر دیا، یہ سب تاریخ کے واقعات ہیں جن کو کوئی صاحب علم جھٹلا نہیں سکتا لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ ایک طرف اس انقلاب نے سامراجی ممالک کو چونکا دیا اور وہ پریشان ہونے لگے کہ اگر دنیا کے چھٹے حصے میں سوشلسٹ انقلاب کامیاب و کامران ہو گیا تو پھر اس کے دیکھا دیکھی انقلابی تحریکوں کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلے گا جو ان

سامراجی نظام کی پوری عمارت کو تہس نہس کر دے گا اس لئے سامراج اور سرمایہ داری نظام کی زندگی اور بقا کا تقاضا تھا کہ یہ تمام ممالک ایسا قدم اٹھائیں جو اس سوشلسٹ انقلاب کو ایسے دور میں ہی کچل دیں جب وہ ابھی گھٹنوں کے بل ہی چل رہا ہو۔ اب ہماری آنکھوں کے سامنے ویت نام، یا کیوبا میں کیوں امریکیوں نے مداخلت کی اور ویت نام میں طویل جنگ جاری رکھی تاکہ وہاں سوشلسٹ انقلاب کامیاب وکامران نہ ہونے پائے، یہی صورت حال ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ میں تھی لیکن مداخلت کے خلاف جس طرح آج ویت نام کے حامی دنیا بھر میں اس کے حق میں آواز بلند کرتے رہے اسی طرح اسی روسی انقلاب نے دنیا بھر کے مجبور و مقہور محنت کشوں کے اندر امید و یقین کی جوت جگا دی کہ اگر ایک ملک میں سرمایہ داری نظام کا تختہ الٹا جا سکتا ہے تو دوسرے ملکوں میں بھی یہ انقلاب بپا کیا جا سکتا ہے چنانچہ اس عمل نے طبقاتی کش مکش کو قومی حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا یعنی ایک طرف دنیا بھر کے سرمایہ دار ممالک کا تقاضا یہ تھا کہ انقلابی تحریکیں ابھرنے نہ پائیں اور جس انقلاب روس سے ان تحریکوں کو انگیخت ملتی ہے وہ پنپنے نہ پائے؛ دوسری طرف دنیا بھر کے غریب عوام کا قدرتی ردّ عمل یہ ہوا کہ سوویت روس کا انقلاب محفوظ و مامون رہے تاکہ اس سے دوسرے ممالک کے مزدوروں، کسانوں کی تحریکوں کی رہنمائی اور اعانت ملے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے اکثر ملکوں میں سوویت روس کے اس انقلاب کی وجہ سے زبردست تحریکیں اٹھیں اور کئی ایک ممالک جرمنی، ہنگری، اسٹریا وغیرہ میں تو باقاعدہ سوویت انقلاب کی طرز پر محنت کشوں نے ریاست کے ڈھانچے پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن یہ تحریکیں بالآخر ناکام ہوگئیں اسی طرح پورے ایشیا کے نوآبادیاتی نظام میں بھی زبردست تہلکہ مچ گیا اور ان نوآبادیات میں بھی اپنی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لئے زبردست تحریکیں اٹھیں اور ان کو جس تشدد کے ساتھ کچلا گیا وہ سامراج کی پریشانی کا غماض تھا۔ اس برصغیر کی تحریک خلافت و ہجرت اور اس پر سوویت روس کے انقلاب کے اثرات پر کوئی واضح کام نہیں ہوا۔ لیکن جب بھی کسی مورخ نے اس پر تحقیق کی تو بے پناہ نئے واقعات

سامنے آئیں گے، مہاجرین کا سودیت روس جانا۔ وہاں کے انقلابی مدارس میں تعلیم حاصل کرنا، پھر واپس آکر کمیونسٹ افکار اور انقلاب کے لئے کام کرنا یہ تمام اسی کی باتیں ہیں۔ پھر کمیونسٹ انٹرنیشنل کا قیام اور اس کا ایشیا کے غلام ممالک کی تحریک آزادی کی حمایت کا اعلان چنانچہ یہی وہ دور تھا جب لینن نے ہندوستان کے محنت کشوں کو پیغام بھیجا تھا

ان حالات و واقعات نے برطانوی حکومت کو خاصا پریشان کیا چنانچہ اس دور کی سودیت روس کے اندر فوجی مداخلت سے لے کر نوآبادیوں میں آزادی کی تحریکوں کے کچلنے تک برطانوی شہنشاہیت کا ایک ہی مقصد تھا کہ سودیت روس کے انقلاب کو جلد سے جلد شکست ہو اور اگر شکست میں تاخیر ہوتی ہے تو کم از کم اس انقلاب کے اثرات برصغیر میں پھیلنے نہ پائیں چنانچہ اس دور میں برطانوی حکومت کا اس برصغیر کے اندر سب سے اہم نشانہ سودیت روس کے انقلاب کے خلاف زبردست فکری یلغار تھا۔

لیکن یہ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ فکری یلغار کی مقبولیت کی نوعیت بھی مختلف خطوں، مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہے اب جب سودیت روس کا انقلاب ہوا اور اس نے یورپی روس سے مکمل وسطی ایشیا کے مسلم خطوں میں کامیابی و کامرانی کے جھنڈے گاڑنے شروع کئے تو اس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی اور یہ صورت حال تھی کہ وسطی ایشیا جو ایک زبردست پسماندہ فیوڈل نظام کی زنجیروں میں جکڑا ہوا خطہ تھا وہاں انقلاب کا مطلب امراء اور بڑے بڑے زمینداروں اور ان کی جاگیروں اور زمینداریوں کا خاتمہ تھا۔

لیکن یہ سب امراء یہ سب جاگیردار۔ سب زمیندار مسلمان تھے اور ان کے ساتھ مذہبی پیشواؤں، مولویوں ان ملاؤں کی ایک فوج ظفر موج ان اوپری طبقوں سے منسلک اور وابستہ تھی چنانچہ جب انقلاب کی ہوائیں ان خطوں میں پہنچنی شروع ہوئیں تو یہ امراء کے طبقے جو ڈاڑھیاں بھی رکھے ہوئے تھے، جبے اور عمامے بھی پہنے ہوئے تھے، ماتھوں پر نمازوں کی وجہ سے گٹے بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب اپنے خطوں کو چھوڑ کر بھاگنا شروع ہوئے۔ ان میں سے بہت سے اس برصغیر میں بھی پہنچے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو اپنے خطوں میں بھی انقلاب کے خلاف برطانیہ کی پشت پناہی اور امداد کے بل پر لڑتے

تھے اور جب وہاں سے بھاگے تو بھی ان کو برطانیہ کی پشت پناہی حاصل رہی برطانیہ نے ان عناصر کو مختلف ملکوں میں پناہ دلوائی اور برصغیر میں بھی ان کو پناہ دی گئی۔ چنانچہ اگر اس زمانے کے اخبارات کی فائلیں دیکھی جائیں تو ان میں بخارا و سمرقند کے لوگوں کی تصویریں ان کی پریس کانفرنسیں جلی سرخیوں کے ساتھ چھپی ہوئی نظر آئیں گی اور اس میں تان اسی بات پر ٹوٹتی تھی کہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تہذیب و علم کے گہوارے لٹ گئے بوشویکوں نے مساجد کو مسمار کر دیا، نماز پر پابندی لگا دی ہے قرآن کا پڑھنا ممنوع قرار دیا ہے مسلمانوں کی زمینیں چھین لی ہیں وغیرہ وغیرہ اور یکطرفہ پراپیگنڈہ سالہا سال جاری رہا اور پچھلے ۶۰ برس سے ہنوز جاری ہے۔ آج بھی ہمارے صحافی دانشور بہت حد تک اسی راگ کو الاپ رہے ہیں اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آج جب اس جہاں رنگ و بو میں آزادی اور سوشلزم کی تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہیں تو سوویت روس اور سوشلسٹ ممالک اور دنیا کی کمیونسٹ تحریک ہی وہ قلعے ہیں جہاں سے ہر ملک کی ترقی پسند تحریک کو کمک حاصل ہو رہی ہے اس پر ہمارے ملک کے ترقی پسندوں اور روشن خیال لوگوں کو ان باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ ہمارے ملک کو سیاسی طور آزاد ہوئے تیس برس ہونے کو آ رہے ہیں اور ہم پہلے دن سے اپنی صنعتی ترقی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، پہلے دن سے ہمارے ہاں کے ایسے ماہرین اقتصادیات نے جن کو کمیونسٹ تحریک سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا وہ یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے فولاد کے کارخانہ کا قیام لازمی و لابدی ہے اور ان تمام سالوں میں ہم نے مغرب کے ہر دروازے پر دستک دی اور فولاد کے کارخانے کے قیام کے لئے امداد چاہی لیکن کوئی سرمایہ دار اور سامراجی ملک آگے نہ بڑھا بلکہ ان ممالک نے پاکستان میں اپنے دوستوں کے ذریعے اس بات کا پراپیگنڈہ کیا کہ ہمیں فولاد کے کارخانہ لگانے کی عیاشی نہیں کرنی چاہیئے لیکن جب سوویت روس سے تعلقات سے بھی استوار ہوئے تو انہوں نے فولاد کے کارخانے کی پیشکش کی اس پیشکش کو ٹھکرانے کے لئے ہمارے ہاں بھرپور کوششیں ہوئیں لیکن بالآخر یہ پیشکش قبول کرنی پڑی اس لئے کہ ہماری معیشت کے لئے یہ لازمی تھا۔

آخر اس پر غور تو کیجئے کہ کیوں ایک طرف سرمایہ دار ممالک کی یہ خواہش کہ ان نوآزاد ممالک میں فولاد کے کارخانے نہ لگنے پائیں۔ اور دوسری طرف سوشلسٹ ممالک اور سوویت روس کی یہ خواہش کہ ان نوآزاد ممالک میں فولاد کے کارخانے ضرور لگیں اور اس کے لیئے یہ سوویت روس ہر قسم کی امداد دینے کے لیئے بے تاب ہے۔ ہندوستان ہو ترکی ہو، ایران ہو، مصر ہو پاکستان ہو ان سبھی ممالک میں فولاد کے کارخانے سوویت روس کی امداد سے ہی لگے ہیں۔

دراصل فولاد کے کارخانے میں رکاوٹیں ڈالنا سامراجی ممالک کی بنیادی پالیسی ہے کیوں تاکہ یہ نوآزاد ملک صنعتی ترقی نہ کر پائیں اور اگر کریں بھی تو اس کی رفتار سست رہے اور وہ اپنی صنعتی ترقی کے لیئے سرمایہ دار ممالک کے دست نگر بنے رہیں۔

سوویت روس فولاد کے کارخانے نصب کر کے ان ممالک کو سرمایہ دار اور سامراجی ممالک کی دست نگری اور انحصار سے آزاد کروانا چاہتا ہے اور اس طرح ان کو سامراج دشمن پالیسی اور غیر سرمایہ دارانہ نشو و نما کی راہ پر ڈالنے کے لیئے راہ ہموار کرتا ہے۔

اس واسطے یہ ضروری ہے کہ ہم سوویت روس کے بارے میں اپنے سوسالہ توہمات، خوف اور خدشوں کا تجزیہ کریں، کیونکہ برطانوی سامراج نے سوویت روس کے انقلاب سے بھی پہلے ہمارے اندر ایک شدید خوف روس کے خلاف پیدا کر رکھا تھا اور جب وہاں سوشلسٹ انقلاب بپا ہو گیا تو اس خوف کو مذہب۔ اور نجی ملکیت خاندانی زندگی کی تباہی و بربادی کے من گھڑت افسانوں کے حوالے سے اور بھی ہوا دی اور اس طرح سوویت روس دشمنی ہماری قومی نفسیات اور روایت کا حصہ بن گئی ہے اور یہ روایت قیام پاکستان سے پہلے کی ہے ۱۲ر نومبر ۷۶ء رفوائے وقت میں بی اے ام طوسی صاحب کا ایک مضمون قائد اعظم کے بارے میں ان کی یادوں پر مبنی ہے۔ اس میں انہوں نے ایک واقع لکھا ہے کہ طوسی صاحب نے ۱۹۴۵ء کے زمانے میں قائد اعظم سے ڈان کی پالیسی کے متعلق نکتہ چینی کی تو قائد اعظم رح نے فرمایا کہ اپنی نکتہ چینی ضبط تحریر میں لا کر جناب لیاقت علی کو دے دی جائے، چنانچہ طوسی صاحب نے ڈان کے بارے میں جو نکتہ چینی رقم کی اس میں سرفہرست ڈان پر یہ اعتراض تھا کہ اس میں سوویت روس کے حق میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔

یہ عام شواہد ہیں جن سے میرا موقف ثابت ہوتا ہے کہ سوویت روس کے خلاف ہم پچھلے سال ہا سال بہر حال نصف صدی سے شدید تعصب کا شکار رہیں، اس لئے اگر ہم سوویت روس کی پالیسی میں تبدیلی چاہتے ہیں اور وہاں کی رائے عامہ کو متاثر کرنا چاہتے ہیں تو اس سمت ہمیں بھی مثبت قدم اٹھانا ہوگا کیونکہ یہ ہمارے دوطرفہ تعلقات کی بہتری کے لئے ضروری ہے، اگر ہم دوسروں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ہماری ضرورتوں اور تقاضوں کو جاننے کے لئے ایک بحث وتمحیص کی فضا پیدا کرنی چاہیئے اسی نقطہ نظر سے میں نے یہ سطور قلم بند کی ہیں، اور امید ہے کہ اسی انداز سے ان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی، دگرنہ سوویت دوستی سے مجھے انکار نہیں ہے لیکن میں سوویت انقلاب کا موید بھی اس لئے ہوں کہ ہمارے ملک اور ہمارے لوگوں کی بہتری کے لئے اس انقلاب اور اس نظام میں کئی ایک روشن سبق موجود ہیں۔

وسطی ایشیا کی مملکتوں کا ارتقاء
اور
تاریخی پس منظر

ہمارے برصغیر کی طرح یہ وسطی ایشیا کا خطہ بھی تہذیب کا قدیم ترین گہوارہ رہا ہے اور اب جیسے جیسے آثار قدیمہ کا علم ترقی کر رہا ہے ویسے ہی اس خطے کی قدامت اور یہاں کی تہذیب اور ترقیوں کا اندازہ ہو رہا ہے چنانچہ سوویت یونین کے ماہرین آثار قدیمہ نے ایسی کئی نشانیاں دریافت کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پتھر کے زمانے میں یہاں پتھروں سے اعلےٰ قسم کے برتن بنائے جاتے تھے اور اسی زمانے میں کئی ایک علاقوں میں کاشت کاری بھی ہوتی تھی لیکن مجموعی طور پر اگر ہم اس خطے کے ارتقا کا ابتدائی سرا ڈھونڈنے لگیں تو مختلف مورخ ایک بات پر قریب قریب متفق ہیں کہ مسیح کی پیدائش سے ایک ہزار برس پہلے وسطی ایشیا کے پہاڑی اور میدانی علاقے کے لوگ زیادہ تر خانہ بدوش تھے جن کا گذر بسر بھیڑ بکریاں پال کر ہوتا تھا۔ البتہ دریاؤں کے دہانوں پر کاشت کاری ہوتی تھی اس طرح سے مختلف علاقوں میں تہذیبی تفوق پیدا ہو گیا تھا، یہ غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں بھیڑ بکریاں پالنے اور خانہ بدوشی کی زندگی سے بسر اوقات ہو گی وہاں کی تہذیبی زندگی کاشت کاری کر کے گزر بسر کرنے والے لوگوں سے کم درجہ پر ہو گی۔ لیکن بیشتر اس کے کہ میں اس خطے کے مختلف تاریخی ادوار کا تذکرہ کروں یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں وسطی ایشیا کے خطے کی آج کے دور کے مطابق وضاحت کر دوں۔

یہ ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وسطی ایشیا کا پورا علاقہ جو تصور ہوتا ہے اس میں اس وقت سوویت یونین میں شامل پانچ جمہوریتیں آتی ہیں ان کے نام ہیں۔

۱۔ ازبکستان

۲۔ تاجکستان

۳۔ قزاخستان

۴۔ قرغیزیہ

۵۔ ترکمانیہ

یہ پانچ جمہوریتوں پر مبنی علاقہ نہایت وسیع و عریض ہے اس کے حدود اربعہ پر اگر غور کریں تو ہمیں اس کی وسعتوں کا اندازہ ہو سکے گا اور یہ بھی پتہ چل سکے گا کہ یہ خطہ ازمنہ قدیم کی تہذیبوں اور علم و رشد کا گہوارہ کیونکر بنا۔ چنانچہ وسطی ایشیا کی شمالی سرحدیں مغربی سائبیریا کو چھو رہی ہیں تو جنوب میں افغانستان اور ایران کو مس کرتی ہیں، مغرب میں اس خطے کی سرحدیں دریائے والگا اور بحیرہ کیسپین کی موجوں کی زد میں آتی ہیں۔ غرضیکہ اس پورے خطے میں قریب قریب ۴ کروڑ انسان بستے ہیں، یہ سوویت یونین کی کل آبادی کا تقریباً ۷واں حصہ بنتا ہے اور اس علاقے کا مجموعی رقبہ ۴۰ لاکھ کلومیٹر ہے اور سوویت یونین کے کل رقبے کا چھٹا حصہ۔ اس علاقے کا رقبے کے لحاظ سے سوویت یونین کے پورے رقبے سے وہی تناسب ہے جو سوویت یونین کے مجموعی رقبے کا کل دنیا کے رقبے سے ہے، یعنی سوویت یونین کا رقبہ پوری دنیا کے چھٹے حصے پر محیط ہے اور سوویت یونین کے چھٹے حصے پر وسطی ایشیا چھایا ہوا ہے اس لئے وسطی ایشیا کے خطے کی سوویت یونین میں ہر لحاظ سے زبردست اہمیت حاصل ہے۔ اس پورے وسطی ایشیا کا جب ذکر ہوتا ہے تو ایک سوال ہمیشہ اٹھایا جاتا ہے کہ آیا قزاخستان جو ان پانچوں جمہوریتوں میں رقبے کے لحاظ سے سب سے وسیع ہے یعنی اس کا مجموعی رقبہ ہی کوئی ۲۷ لاکھ مربع کلومیٹر ہے واقعی وسطی ایشیا کا حصہ شمار بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ خود سوویت افریقہ دان اور مغرب کے جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ قزاخستان کو وسطی ایشیا میں شامل نہیں کیا جا سکتا یہ درست ہے کہ قزاخستان کی زبان اور یہاں کے بسنے والوں کی شکلوں اور دوسری وسطی ایشیا کی جمہوریتوں کی زبانوں میں ایک گونہ مشابہت موجود ہے لیکن ان مشابہتوں کے باوجود اس جمہوریہ کے علاقے کو وسطی ایشیا کا حصہ تصور نہیں کیا جاتا بلکہ اسٹیپسی میدانوں کا

علاقہ تصور ہوتا ہے۔ میں ان بحثوں میں نہیں الجھنا چاہتا۔ مجھے بہر حال اس خطے کی تاریخ کے اجتماعی خدوخال بیان کرنے ہیں۔

موسم علاقوں کو جاننے کے لئے وہاں کی سماجی تاریخ کا ادراک حاصل کرنے کے لئے موسم کا جاننا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ جغرافیہ یا کوئی اور پس منظر! ہاں تو یہ پورا علاقہ موسم اور قدرتی حالات کے اعتبار سے انتہائی گوناگوں ہے، ایک طرف اگر مغرب اور شمال میں وسیع و عریض میدان پھیلے ہوئے ہیں تو مشرق اور جنوب کا بیشتر خطہ پہاڑی ہے۔ پہاڑوں کا ایک عظیم سلسلہ جو جنوب مغرب کوپت داغ سے شروع ہو کر مشرق میں پامیرا اور تیان شان پر ختم ہوتا ہے وسطی ایشیا کو باقی براعظم سے جدا کرتا ہے اس علاقے میں ہمارے برصغیر کے اکثر علاقوں کی طرح موسموں میں خاصی شدت پائی جاتی ہے یعنی اگر سردی شدید پڑتی ہے تو گرمی بھی جان لیوا ہوتی ہے۔

اس وسیع و عریض علاقے کو جغرافیائی اعتبار سے چار مختلف نوعیت کے علاقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ استیپی کا میدان جو شمالی قزاختستان پر مشتمل ہے۔

۲۔ اچھوتی زمین کا علاقہ یعنی نیم ریگستان کا وہ علاقہ جو باقی قزاختستان کو محیط کئے ہوئے ہے۔

۳۔ جنوب میں ریگستانی علاقہ جو مغرب میں ایران کی سرحد تک اور مشرق میں چین کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔

۴۔ پامیرا اور تیان شن کا پہاڑی سلسلہ

وسطی ایشیا جہاں کی آبپاشی کا انحصار دریاؤں پر ہے اور ان دریاؤں کا انحصار برف پر ہے چنانچہ اس خطے کے چھوٹے بڑے درجنوں دریاؤں کا سرچشمہ برف ہے اور یہی دریا ہیں جو نخلستانوں کو زندگی بخشتے ہیں ان دریاؤں میں دو سب سے بڑے دریا ہیں۔

۱۔ آمو دریا ——— جس کا منبع پامیر ہے۔

۲۔ سیر دریا ——— جو تیان شان سے نکلتا ہے۔

ان کے بعد مقابلتاً چھوٹے دریاؤں میں زرافشاں، چو، عرغاب، تجن اور اتریک ہیں۔ جہاں تک قزاختستان کا تعلق ہے وہاں کے دریاؤں میں ایرتیلش، ایلی، اورال اور ایشیم شامل ہیں۔ وسطی ایشیا کی جھیلوں میں بحیرہ اورال سب سے بڑی جھیل ہے چونکہ یہ جھیل بہت وسیع و عریض ہے اس لئے اسے عام طور پر سمندر ہی تصور کیا جاتا ہے اور اسی لئے یہ سمندر ہی کہلاتی ہے، اس کے علاوہ جھیل بلخش اور جھیل الیسق کول ہیں۔

یہ موسم، یہ جغرافیہ، یہ برفیلے پہاڑ اور یہ خشک ریگستان کسی نہ کسی انداز میں وسطی ایشیا کی معاشی اور ثقافتی ترقی میں ممد ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ان علاقوں میں قدیم زمانے سے انتہائی ترقی یافتہ زرعی تہذیب قائم رہی ہے اس تہذیب کی بنیاد یہاں کی آبپاسی کے ذرائع پر تھی اس کے علاوہ اچھے قدرتی حالات، طویل گرمیاں، زرخیز زمین مصنوعی آبپاشی کا نظام یہ سب عناصر تھے جنہوں نے یہاں کی معاشی سرگرمیوں کو خاصی تقویت بخشی۔ یہی نہیں بلکہ جغرافیائی حالات نے اس خطوں کو تجارت کے لئے بھی خاصا موزوں بنایا تھا۔ چنانچہ بحری راستے دریافت ہونے سے پہلے تمام خاص اور اہم تجارتی راستے انہی علاقوں سے گذرتے تھے اور آج بھی فضائی اور خشکی کے راستے جو سوویت یونین کو ایران، افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور چین سے ملاتے ہیں وہ وسطی ایشیا اور قزاختستان سے ہی ہو کر جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ خطے مختلف تہذیبوں کا چونکہ مرکز رہے ہیں اس لئے ان کی تہذیبوں پر مختلف ادوار اور لوگوں کے اثرات آج بھی ملتے ہیں چنانچہ ان علاقوں میں کام کرنے والے آثار قدیمہ کے ماہرین نے قزاختستان کے علاقوں "تلاش" اور "مجبول" میں جو کھدائی کی ہے اسی طرح جنوبی ازبکستان کے علاقے "تاشک تاسن" میں جو دریافتیں ہوئی ہیں ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ وہاں پتھروں کے برتن بنائے جاتے تھے اور ان کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں کئی علاقوں میں گلہ بانی اور کاشت کاری ہوتی تھی غرضیکہ مسیح کی پیدائش تک کی یہاں کی تہذیب کو کاشت کاری اور گلہ بانی کی تہذیب کہنا درست ہوگا کیونکہ اس زمانے میں بندوں کا جو نظام تھا وہ بھی خاصا ماہرانہ دکھائی دیتا تھا۔ جہاں تک ابتدائی آبادیوں کا تعلق تھا۔ وسطی ایشیا اور استیپی میدان کی قدیم آبادی ایران نژاد تھی۔ وسطی ایشیا کے قدیم ترین لوگ ——

زرافشاں وادی کے دبائی اور آمو دریا کے کنارے رہنے والے خوارزمیائی اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا علاقہ تاریخ میں پہلی عالمی بادشاہت ۔ ہنحامنشی سلطنت کا حصہ تھا۔ شاہ دارا (۴۸۶ ۔ ۵۲۲ ق۔م۔) نے اپنے کتبوں میں سوگ دیائی اور خوارزمیائی لوگوں کو اپنی رعیت لکھا ہے۔ انہوں نے یونان کی مہم میں حصہ لیا تھا۔

جب سکندر نے حملہ کیا تب خوارزم ایرانی صوبہ نہیں رہا تھا۔ لیکن سوگ دیائی ایرانی بادشاہ کے تحت تھے، اور وہ سکندر کے خلاف لڑے۔ ہنحامنشی سلطنت کو سکندر نے تباہ کر دیا اور اس کا علاقہ یونان۔ مقدونیہ کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اسی صدی میں جب سکندر کی سلطنت نے بھی دم توڑ دیا تو وسطی ایشیا کا فی علاقہ سلوکسی ریاست کا حصہ بن گیا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں مقامی بغاوتوں کے سبب وسطی ایشیا کے مغربی خطے میں سلوکسیوں کا اقتدار ختم ہو گیا اور ان کی جگہ پارتھیا والوں نے لے لی۔ لیکن پارتھیا والوں کے مسلسل حملوں کے باوجود یونانی باختریائی ریاست ۱۳۰ ۔ ۱۴۰ قبل مسیح تک قائم رہی۔ کچھ مدت کے بعد کوشانی یونانی باختریائی ریاست کے جانشین بن گئے۔ اس کوشاں عہد میں وسطی ایشیا نے ثقافت اور معیشت کے میدانوں میں بڑی ترقی کی۔ اس علاقے کی خوش حالی میں اس کی جغرافیائی حالت کا بھی دخل ہے۔ یہ "عظیم ریشمی شاہراہ" پر واقع تھا جو چین کو ایران اور روما سے ملاتی تھی۔

تیسری صدی میں کوشاں سلطنت کو زوال آنے لگا۔ اور چوتھی صدی میں ایک متعلقہ افتھلی قبیلے نے جسے سفید ہن بھی کہا جاتا ہے اور جو پہلے کوشانیوں کے تحت تھا باختریا کو فتح کر لیا۔ یہیں سے وسطی ایشیا میں کوشاں راج بھی ختم ہو گیا۔ لیکن سفید ہنوں کی حکمرانی عرصے تک قائم نہیں رہی۔ ۵۶۷ء ۔ ۵۶۳ء کے درمیان افتھلی قبیلے پر سمی رتیچ یے کے ترکوں نے قبضہ کر کے اسے عظیم سلطنت خاقان میں شامل کر لیا جو منچوریا سے بحیرہ اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔ چھٹی صدی کے آخر تک سلطنت خاقان دو حصوں میں بٹ گئی۔ بعد میں اس کے مغربی حصے پر عرب قابض ہو گئے۔

وسطی ایشیا میں عرب آٹھویں صدی کی ابتدا میں داخل ہوئے۔ اس کی رہنمائی خراسان کے صوبے دار ابن مسلم نے کی تھی۔ تھوڑی ہی مدت میں وہ تمام علاقے پر چھا گئے۔ اس عمل

میں بے بہا ثقافتی چیزیں تباہ ہوئیں جیسے پنجی کینٹ کے مندر، تگ کا محل اور کئی قیمتی یادگاریں البیرونی نے عربوں کے ہاتھوں اس توڑ پھوڑ کو غصے سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سپہ سالار ابن مسلم نے ان تمام عالموں کو قتل کر ڈالا جو خوارزم کی تاریخ اور زبان جانتے تھے اس طرح پہلے کی تاریخ سیکھنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔ مقامی لوگوں نے عربوں کی مزاحمت کی، اس میں انھیں ترکی قبائل کی حمایت حاصل تھی۔ عربوں کو ساسانی ایران پر فتح حاصل کرنے میں صرف ۱۰ سال لگے تھے لیکن وسطی ایشیا میں لوگوں کی مزاحمت تقریباً نصف صدی تک جاری رہی۔ نئے حکمرانوں کی ملک گیری ظاہر ہے سخت تھی۔ کسانوں کو بھاری ٹیکس ادا کرنا پڑتے تھے لیکن دیہی اشرافیہ کو بڑی بڑی رعایتیں حاصل تھیں۔ عربوں نے تمام وسطی ایشیا میں اسلام پھیلایا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بکھری ہوئی مقامی آبادی ایک مشترکہ نظریہ حیات کی بنیاد پر متحد ہوگئی۔ مذہب کے ساتھ ساتھ عربی زبان نے بھی فروغ پایا جو نظم و نسق، ادب اور علم کی زبان بن گئی لیکن لوگ فارسی اور ترکی کی مقامی بولیوں میں بات چیت کرتے رہے۔ عوام کی نسلی ساخت پر عربوں نے کوئی اہم اثر نہیں ڈالا۔ وسطی ایشیا میں آج کل جو عرب رہتے ہیں وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جو بہت بعد میں تیمور کے زمانے میں وہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔

قزاخستان کا صرف جنوبی حصہ عربوں کی فتح سے متاثر ہوا۔ استیپی میدانوں میں ترکی قبائل آزاد رہے۔ انھوں نے آٹھویں صدی میں سیمی ریچیے میں تیورگیشیوں کے ساتھ اتحاد کیا اور پھر بعد میں (آٹھویں سے دسویں صدی تک) کارلوکوں کے ساتھ۔ مغرب کی طرف سیر دریا کے نشیب میں ترکی قبائل اور اوگوزیوں کے درمیان زبردست اتحاد رہا۔ یہ قبیلے مویشیوں کو پالنے کے علاوہ فصلیں بھی پیدا کرتے تھے۔ شہروں میں ان کے تجارتی مرکز بھی تھے۔ اوگوزیوں کا مرکز یانگی کینٹ شہر تھا۔ یہ افتھلی قبیلے کے جانشین تھے۔ جن پر چھٹی اور ساتویں صدیوں میں ترکوں کا اثر کافی ہوگیا۔ آٹھویں صدی سے دسویں صدی تک افتھلی ترک نسل کے علاوہ اوگوزیوں کی ساخت میں ہند یورپی قبائل کا خون شامل ہوگیا جیسے توخار، یا سو و آلن۔

اوگوزیوں کے پڑوس میں بحیرہ ارال کا علاقہ تھا۔ یہاں اسی زمانے میں پے چے نیگ کے قبائل ایک دوسرے سے مل جل گئے۔ ان کا نسلی شجرہ پرانے سلکائی ماساگیتی قبائل سے ملتا ہے

جنھوں نے ترکوں کا کافی اثر قبول کر لیا تھا۔

نویں اور دسویں صدی میں ایک نئی سامانی ریاست (۸۷۴ء-۹۹۹ء) وجود میں آئی جس نے ایران اور وسطی ایشیا کو پھر ملا دیا۔ اس کا مرکز بخارا تھا۔ سامانی ریاست میں ماوراءالنہر، خوارزم، سیر دریا کا علاقہ، ترکمانیہ کا ایک حصہ، ایران اور افغانستان شامل تھے۔ اس ریاست نے اس علاقے کی نسلی اور ثقافتی تاریخ میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ سامانیوں کے عہد میں تاجک فارسی زبان عام ہوئی۔ اسی عہد کی پیداوار عظیم شاعر رودکی اور فردوسی ہیں جن کے شاہکار آج بھی زندہ ہیں۔ عربی زبان علمی زبان کی حیثیت سے جاری رہی۔

آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے شروع میں وسطی ایشیا میں بڑی ادبی ہل چل رہی۔ ابن موسیٰ الخوارزمی، عرب ریاضی کے بانی کی تصانیف کا اسی دور سے تعلق ہے۔ ان کی تصنیف "الجبر" سے دنیا نے الجبرا کا لفظ اخذ کیا۔ وہ صرف ریاضی داں ہی نہ تھے بلکہ عالم فلکیات، جغرافیہ داں اور مورخ بھی تھے۔ ان کی تخلیقات ہندستانی الجبرا اور یونانی اقلیدس کا امتزاج ہیں اور موجودہ ریاضیات کی بنیاد کہی جا سکتی ہیں۔ خوارزم صدیوں پرانی ریاضی کی روایات کا گہوارہ رہا ہے جن پر ہند و یونان کی ثقافت کی چھاپ تھی اور جو آبپاشی، سفر، تجارت اور تعمیر جیسی عملی ضروریات کی وجہ سے پروان چڑھی تھیں۔ الخوارزمی نے ان ہی سے استفادہ کیا۔

ابو نصر الفارابی (انتقال ۹۵۰ء) نے کئی فلسفیانہ تبصرے لکھے۔ اسی بنا پر انھیں مشرق کا ارسطو کہا جاتا ہے۔ ان کے فلسفے پر مادیت کا رنگ غالب ہے، اسی لئے ملاؤں نے انھیں اپنا نشانہ بنایا۔ الفارابی کے عقل پسند خیالات نے وسطی ایشیا کے ممتاز عالم ابو علی ابن سینا (۹۸۰ء-۱۰۳۷ء) میں بڑا وجدان پیدا کیا جو طب اور فلسفے پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی طبی تصنیفات میں کافی مشہور "علم طب کی قواعد" ہے۔ اس کا بارہویں صدی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا تھا۔ مشرق اور مغرب کے حکما اور ڈاکٹر تقریباً ۶ صدیوں تک اسے طب پر ایک مستند کتاب کی طرح استعمال کرتے رہے ہیں۔

خوارزم کے آسمان ثقافت کے ایک اور درخشندہ ستارے البیرونی (۹۷۳-۱۰۴۸ء)

ہیں۔ یہ ابن سینا کے ہم عصر تھے۔ وہ اس گاؤں میں پیدا ہوئے تھے جو اب قاراقلپک سوویت خود مختار ریپبلک ہے۔ انھوں نے "تاریخ ہند" لکھی جو ازمنہ وسطی کے ادب میں ایک تاریخی علم انسان کی تصنیف کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ وہ چوٹی کے قاموس نگار، جغرافیہ داں، ماہر فلکیات، ماہر ارضیات، ماہر علم انسان، تاریخ داں اور شاعر بھی تھے۔ وہ ایک عظیم اور جری محب وطن تھے جو حملہ آور کی تنقید کرنے پر کبھی نہیں چوکے۔ ساتھ ہی وہ دوسرے لوگوں کی ثقافت کی توصیف اور عزت بھی کرتے تھے۔ البیرونی کا نقطۂ نظر فلسفی طور پر مادیت پسند تھا، اور وہ فطری دنیا کے مظاہر اور قوانین کو سمجھنے کے لئے انسانی دانش کے استعمال پر زور دیا کرتے تھے۔ لیکن اسے زمانے کی ستم ظریفی کہئے کہ ابن سینا اور البیرونی کے علمی اور عالمانہ خیالیات کو رجعت پرست ملاؤں نے پھیلنے سے روکا جو اس وقت وسطی ایشیا پر چھائے ہوئے تھے۔ گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں ماوراءالنہر کے علاقے میں تصوف کے خیالات مقبول ہوئے۔ یہاں یہ عراق سے پہنچے تھے

دسویں اور گیارہویں صدیوں میں جاگیردارانہ تعلقات وسطی ایشیا پر غالب ہو گئے تھے۔ یہ اس علاقے کی نسلیاتی تاریخ کے ارتقا کی ایک نئی منزل تھی۔ اسی وقت سے قومی گروپوں کی تشکیل شروع ہوئی۔ نویں اور دسویں صدی کے درمیان "تاجک لوگوں کی تشکیل ایک قومی گروپ کی شکل میں ہوئی، یہ وسطی ایشیا میں پہلا قومی گروپ تھا۔ ان کی زبان نے سامانی ریاست میں کافی ترقی کر لی تھی۔ سوگدیائی اور باختری ان کے جدامجد تھے۔

تاجک علاقے سے قریب کی سرزمین پر ایک اور قومی گروپ ظہور میں آیا۔ یہ تھا ازبیک ازبیکوں کے جدامجد وسطی ایشیا کے مقامی لوگ تھے۔ خوارزمی، سوگدیائی، ماساگیتی اور ساکائی۔ پرانے زمانے میں ترکی قبائل اسٹیپی میدانوں کو چھوڑ کر زرافشان، فرغانہ، چاچ، خوارزم اور ماوراءالنہر کے دوسرے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ مقامی زراعت پیشہ لوگوں کے ساتھ شیروشکر ہو کر ترکوں نے ان کا معاشی طریقہ زندگی اور ثقافت اپنائی اور مقامی لوگوں نے جو فارسی بولتے تھے۔ ترکوں کی زبان اختیار کر لی۔ گیارہویں صدیوں میں یہ نسلی امتزاج تیزی سے بڑھتا رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ترکی بولنے والے لوگوں کی قوم کی بنیاد پڑی جو بعد میں ازبیکوں کے نام

سے مشہور ہوئے۔ یہ آمو دریا اور سیر دریا کے درمیان علاقے میں ہوا۔

دسویں صدی کا اختتام سامانی سلطنت کے آخری دن تھے۔ صوبائی گورنر مرکزی حکومت کے احکام ماننے سے انکار کرنے لگے اور طوائف الملوکی چھانے لگی۔ سلطنت کو ایک اور گہرے معاشرتی بحران نے گھیر لیا جو کسانوں کی بے چینی کا نتیجہ تھا۔ یہ حالت بھاری لگان عائد کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں سبکتگین نے غزنی سلسلہ سلاطین کی بنیاد ڈالی۔ اور کاشغر اور سیمی زریچیے کے علاقے میں قارا خانیدیوں کی مضبوط ترک سلطنت بغرا خاں نے قائم کی علم انسان اور ثقافت کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے قارا خانیدیوں کی وسطی ایشیا پر حکمرانی بہت اہم ہے۔ اسی دور میں مشرقی ترکستان اور وسطی ایشیا کے مختلف نسلی گروہوں کی باہمی آمیزش ہوئی جس سے ثقافتیں بھی ایک دوسرے سے مالا مال ہوئیں۔

اس زمانے میں ترکی قبائل سیمی رزیچ یے میں اور سیر دریا کے کنارے آباد تھے جو چاچ کی سرحد سے ملا ہوا تھا۔ ان میں سب سے طاقتور کارلوک قبیلہ تھا جس نے تلاش دریا کی وادی سے لے کر مشرقی ترکستان میں تاریم دریا تک قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ مہذب لوگ تھے، شہروں اور دیہات میں بسے ہوئے تھے اور ان کے خاص پیشے مویشی بانی، کاشت کاری اور شکار تھے۔ دوسرا بڑا ترک قبیلہ چیگل تھا جو تاراز میں آباد تھا، خاص کر جھیل ایسیق کول کے شمال مشرق میں۔ مورخوں کا بیان ہے کہ اس قبیلے کے پاس گھوڑوں، بھیڑوں اور مویشیوں کی بڑی دولت تھی۔ اور کارلوکوں کی طرح وہ بھی گاؤں اور شہروں میں رہتے تھے ایک اور ترک قبیلے کا نام ای آگما تھا جو زیادہ تر شکار اور مویشی بانی پر گذر بسر کرتا تھا۔ اس کی بود باش ایسیق کول جھیل کے جنوب میں مشرقی ترکستان میں تھی۔ تیور گیش کے قبائل تکشی اور آرگی پر مشتمل تھے۔ ان کی ریاست کا ظہور آٹھویں صدی میں ہوا۔ بعد میں کارلوکوں نے انھیں مفتوح کر لیا۔ ان قبائل کی ماوراءالنہر کے لوگوں کے قریبی ثقافتی رشتے تھے اور ان کی ترکی زبان میں سوگ دیا کی آمیزش تھی۔

اس دور میں وسطی ایشیا کے لوگوں اور قارا خانید کی ریاست کے ترک قبائل کے درمیان سیاسی اتحاد کا نتیجہ باہمی آمیزش کی صورت میں نکلا۔ مہذب کاشت کاروں اور خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش ترک مہاجروں کے درمیان آمیزش کو گیارہویں صدی کے مورخ یوسف خاص حاجب

بالاساگونی نے اپنی تصنیف "کودات کو بی لیک" میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس زمانے میں وسطی ایشیا کے نخلستان میں ترک نسل کے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی اور مقامی لوگوں نے ترکی زبان اختیار کر لی۔ جس علاقے پر سوویت ازبیک ریپبلک مشتمل ہے وہاں اس زمانے میں اکثریت کی زبان ترکی تھی۔ قاراخانیدی ترکی زبان کے ماہر محمود کاشغری کی تصنیف "دیوان الفت - ات ترک" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ازبیک زبان کی تشکیل کا عمل گیارہویں صدی ہی میں کافی تیز ہو چکا تھا۔

وسطی ایشیا میں گیارہویں اور بارہویں صدی میں جاگیری رشتوں کی بنیاد پر عظیم سلطنتیں وجود میں آنی شروع ہو گئی تھیں چنانچہ یہی وہ زمانہ تھا جب سلجوقوں کی مختلف چھوٹی ریاستوں کو خوارزم کے بادشاہوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر کے ایک وسیع شاندار جاگیر دارانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ خوارزم خاندان کے بادشاہوں کی حکومت جاگیر داری نظام کی معراج تھی چنانچہ شہروں کی ریل پیل تاجروں کی گہما گہمی دستکاری میں مہارت اور ثقافت کی جھلکیاں یہ سب اس دور کی عظمت کی نشاندہی کرتی ہیں لیکن یہ ترقیاں یہ گہما گہمی زیادہ دیر پا نہیں رہیں اور دیکھتے دیکھتے تیرہویں صدی کے آغاز میں یعنی ۲۱ - ۱۲۱۹ء میں چنگیز خاں کی زیر کمان منگول حملہ آوروں نے خوارزم کے شاہوں کی سلطنت کو ملیامیٹ کر ڈالا۔ ان کے ہاتھوں اتنی زبردست تباہی اور بربادی ہوئی کہ عرصے تک وسطی ایشیا معاشی اور ثقافتی پسماندگی سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ منگول فوجوں میں جنھوں نے وسطی ایشیا کو فتح کر لیا زیادہ تر کپ چاک اور ترکی قبائل تھے جنھوں نے منگول قبائلی نام اختیار کر لئے تھے مثلاً قونغراد، کی یات، مان غائت وغیرہ۔ ازبیکوں، قزاخوں اور قاراقلپکوں میں ان ناموں کے آثار سے یہ نتیجہ نکالنا ضروری نہیں ہے کہ ان کی ابتدا منگولوں سے ہوئی۔ مقامی آبادی نے آسانی سے منگول فاتحین کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ منگول مسلمان ہو گئے اور ترکی زبان بولنے لگے۔

چودہویں صدی میں برلاس نامی منگول قبیلے سے جن پر ترک اثر تھا۔ ایک عظیم فاتح تیمور جلوہ گر ہوا۔ اس نے مسلسل ۳۸ برس کی مہموں میں ایک عریض وسیع سلطنت قائم کر لی جو ہندستان سے والگا تک اور شام سے چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایران، ہندستان اور

اور شام کے فن کار اور ماہرین تعمیر لایا جنھوں نے کئی حسین یادگار عمارتیں بنائیں۔ ان میں سمرقند میں بی بی خانم کی مسجد اور گور امیر مقبرہ مشہور ہیں۔ اس کا پوتا الغ بیگ علم کا بڑا شائق تھا۔ اس ہی کے عہد میں سمرقند کے مدرسوں میں علوم کی تعلیم دی جانے لگی۔ بعد میں ہرات اور سمرقند علوم کے عظیم مرکز بن گئے۔ الغ بیگ نے سمرقند میں فلکیاتی رصدگاہ بنوائی۔ اس کی ذات سے ایسے مشہور ماہرین فلکیات وابستہ ہیں جیسے قاضی زادے رومی غیاث الدین جمشید اور علی قوشچی۔ اس کے فلکیاتی نقشے صحت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہیں۔ ایک کٹر ملا کے ہاتھوں الغ بیگ کی موت ہوئی۔

پندرہویں صدی کے دوسرے نصف میں ہرات سلطنت تیموریہ کا دارالخلافہ ہوگیا۔ مشہور ازبیک شاعر علی شیر نوائی یہیں رہا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں ازبیک زبان کو تکمیل کی بلندیوں تک پہنچایا۔ ان کے شاعری کے چار مجموعے جنھیں "چار دیوان" کہا جاتا ہے اور دوسری تخلیقات نہ صرف وسطی ایشیا بلکہ عالمی ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ انھوں نے علم، روشن خیالی اور زندگی میں خوشی کے لئے ہمیشہ جدوجہد کی۔ ان کے ہم عصروں میں بڑے بڑے ممتاز مورخ تھے، مثلاً حافظی آبرو، عبدالرزاق سمرقندی، میرخوند اور خوندمیر۔ ان کی تصنیفات وسطی ایشیا اور دوسرے ملکوں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی تاریخ پر قیمتی روشنی ڈالتی ہیں۔

اردوئے (ترکی میں اس کے معنی لشکر ہیں) طلائی کا جو زوال چودہویں صدی کے آخر میں شروع ہوا اس کا وسطی ایشیا اور قزاخستان کے لوگوں کے نسلیاتی ارتقا پر کافی اثر پڑا۔ پندرہویں صدی میں دلیشی۔ کپ چاک کے قبائل ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ ان میں سے ایک عمل اردوئے سفید کے علاقے میں سیر دریا کے نشیب میں ہوا۔ اس اتصال میں وہ قبیلہ بھی شامل تھا جو چودہویں صدی سے ازبیک کہا جاتا تھا۔ پندرہویں صدی کے آخر تک اسٹیپی میدانوں کے ان قبائل نے شیبانی خان کی رہنمائی میں تنزل پذیر تیموریہ سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ ازبیک قبیلے کے لوگ جو شیبانی خان کی سرکردگی میں وسطی ایشیا گئے تھے وہیں آباد ہوگئے اور بتدریج ترک اور تاجک آبادی میں گھل مل گئے لفظ ازبیک نہ صرف مہاجروں بلکہ مقامی لوگوں کیلئے بھی استعمال ہونے لگا۔ جب دلیشی۔ کپ چاک ترک قبیلے مقامی لوگوں میں شامل ہوگئے تو ازبیک لوگوں کی قومی نسلیاتی وحدت مکمل ہوگئی۔

پندرہویں صدی کے شروع میں جب جاگیردارانہ نظام منتشر ہونے لگا تو جو دریا کی وادی میں

چھوٹی چھوٹی قلمرو میں قائم ہوئیں اور بعد میں ان میں سے ایک سولہویں صدی میں ترقی کے قزاخ قلمرو ٹے خاں بنی۔ یہ قزاخ قومی گروپ کی تشکیل کی آخری منزل تھی۔ شروع میں قلمرو کے باشندے ازبیک قزاخ کہے جاتے تھے لیکن بعد میں صرف قزاخ پکارے جانے لگے۔

چنانچہ پندرہویں اور سولہویں صدی تک ترقی یافتہ جاگیرداری کے حالات میں اور طویل تاریخی ارتقا کے سبب وسطی ایشیا اور قزاخستان میں تمام بنیادی قومی گروپوں کی تشکیل مکمل ہوگئی۔

صدیوں تک وسطی ایشیا کے لوگوں نے اپنی شاندار ثقافت کو پروان چڑھایا اور زراعت، آبپاشی، فنون دستکاری، علوم یقینی، ادب اور فن جنگ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کا مقابلہ کسی بھی دوسری قدیم اور ازمنہ وسطی کی ثقافتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ وسطی ایشیا کے لوگوں نے برصغیر ہند، چین، میسوپوٹامیا اور ایران کی ثقافتوں سے بہت کچھ حاصل کیا اور اپنی تخلیقی ذہانت سے اسے مزید آسودہ بنایا۔ ساتھ ہی انھوں نے ان پڑوسی ملکوں کی ثقافتوں پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ چینیوں نے وسطی ایشیا سے انگور کی باغبانی، فصفصے کی کاشت، گھوڑوں کی نسل افزائش اور شیشہ گری سیکھی۔ منگولیا اور منچوریا کے حروف تہجی اب بھی سوگ دی رسم الخط کی نشاندہی کرتے ہیں جو قدیم زمانے میں اختیار کئے گئے تھے۔ یورپ اور ایشیا نے وسطی ایشیا سے جنگ میں گھڑسواروں کے رسالے کا استعمال حاصل کیا۔ یورپ نے چین سے کاغذ اور ریشم بنانے کا جو فن سیکھا وہ اسی علاقے کے ذریعے کیا گیا تھا۔ وسطی ایشیا کے عالموں نے عربی ریاضی اور فلکیات کو بڑا فروغ دیا۔ جنھیں بعد میں ازمنہ وسطی کے یورپ نے اختیار کیا۔ وسطی ایشیا کے فن تعمیر نے بھی اپنے نشانات پڑوسی ملکوں کے فن تعمیر پر چھوڑے۔

وسطی ایشیا کی قومیتیں مختلف قدیم نسلیاتی گروپوں کا پیچیدہ مرکب ہیں۔ سوگ دی ازبیکوں اور تاجکوں کی ساخت کا ایک حصہ تھے۔ ساکا اور ماساگیت ترکمانوں، قاراقلپکوں، قزاخوں، ازبکیوں اور کچھ تاجکوں کے خون کا حصہ بنے۔ وسطی ایشیا کے زیادہ تر لوگوں کی نسلیاتی ابتدا ترکی قبائل سے ہوئی۔ جن میں فارسی اور ترکی دونوں زبانیں بولنے والے شامل تھے۔ اس کے بعد کپ چاک ازبکوں قزاخوں اور ایک حد تک قاراقلپکوں کی ساخت میں داخل ہوئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وسطی ایشیا کے لوگوں کا پرانے نسلیاتی رشتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے تعلق ہے۔ اسی لئے ان کی ثقافت، معیشت اور طرز زندگی میں بہت سے امتیازات مشترک ہیں۔ ان کے مشترکہ تاریخی ارتقا اور حملہ آوروں

کے خلاف مشترکہ جدوجہد نے اتحاد کے یہ رشتے اور بھی زیادہ مضبوط کر دیئے۔ لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہر گروپ نے اپنی ثقافتی خصوصیات برقرار رکھیں جن کی بنیاد پر وسطی ایشیا میں مختلف قومیتیں ابھریں۔ بعض مصنف جو اتحاد ایران اور اتحاد ترک کے نظریات کے حامی ہیں ان ممتاز عناصر کو جان بوجھ کر یا تو نظرانداز کرتے ہیں یا انھیں گھٹاتے ہیں۔ اتحاد ایران کا تصور وسطی ایشیا کے لوگوں کے مخصوص تاریخی ارتقا کی کھلم کھلا نفی ہے اور ان کی ثقافت پر ایرانی فنون اور طرز تعمیر کے اثرات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح اتحاد ترک کا بھی تاریخی حقیقت سے دور کا تعلق نہیں۔ وہ اس بات کی فضول کوشش ہے کہ من مانے طریقے سے ترکی بولنے والے مختلف لوگوں کو ایک واحد وحدت میں متحد کر دیا جائے۔ وہ ان کے آزاد تاریخی ارتقا کی حقیقت کو نظرانداز کرتا ہے۔ دراصل ان تمام بے جان نظریات کے پس پردہ سیاسی مقاصد ہیں۔

وسطی ایشیا کے عوام تین صدیوں تک ازبیک شاہی خاندانوں کے خانوں کی زیر حکمرانی رہے (سولہویں صدی سے انیسویں صدی کے وسط تک) پھر بعد میں انھیں زار کی روسی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اگرچہ خانوں کی حکمرانی کے زمانے میں ہی لوگوں میں مختلف مشترک عناصر موجود تھے جیسے زبان اور ثقافت اور ابتدائی قومی شعور ابھرنے لگا تھا لیکن حالات ایسے نہیں تھے کہ جدا جدا قومیں پختہ ہوتیں۔ منگولوں کے حملوں نے اس ترقی پسند ارتقا کو تتر بتر کر دیا جو خوارزم کے بادشاہوں کی مرکزی ریاست کے تحت شروع ہو گیا تھا۔ اس سے جاگیردارانہ انتشار کے دور کی ابتدا ہوئی۔ وسطی ایشیا خانوں کی کئی جاگیردارانہ قلمروؤں میں بٹ جانے سے معاشرتی معاشی اور سیاسی ارتقا کے لحاظ سے پسماندہ رہا۔ قلمروؤں کے درمیان ہلاکت آمیز مسلسل جنگوں نے اس کی معیشت کو تباہ کر دیا۔ پیداواری قوتوں کی ترقی پست سطح اور زراعت اور دست کاری میں جمود کی وجہ سے قومی گروپ تشکیل ہونے میں دیر لگی۔

بخارا، خیوا اور قوقند کی ازبیک خانوں کی قلمروئیں نسلیاتی قومی لحاظ سے بے میل تھیں۔ خیوا میں ازبیک ترکمان، قاراقلپک، قزاخ رہتے تھے۔ ازبیک پھر سارتوں (جو قدیم آبادی کے جانشین تھے) اور دیشتی۔ کپ چاک ازبیکوں (جنھوں نے ابھی تک اپنی قبائل اور کنبے کی خصوصیات محفوظ رکھی تھیں) میں بٹ گئے۔ خیوا کے خان ترکمانوں اور قاراقلپکوں

کو بنجر زمین پر آباد کرکے، بھاری ٹیکس، بے گار اور جبریہ فوجی خدمت عائد کرکے بڑا ظلم کیا کرتے تھے۔ ان کی بغاوتیں بے رحمی سے کچل دی جاتی تھیں۔ بخارا کے خان کی قلمرو میں مراعات یافتہ ازبیک جاگیردار تاجکوں کو کچلتے تھے۔

بعض مغربی مصنفوں نے دعویٰ کیا ہے کہ وسطی ایشیا کے عوام کا قومی نسلیاتی اعتبار سے بے جوڑ میل ہونا بعد میں سوویت عہد میں ایجاد کیا گیا ہے اس کا مقصد اتحاد ترک کا سدباب کرنا ہے۔ یہ حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ ۱۸۴۳ء میں جب خانیکوف بخارا گیا تھا تو اس نے لکھا تھا کہ خان کی قلمرو میں سات قسم کے مختلف لوگ رہتے ہیں جن کے زندگی کے طریقے اپنے اپنے مخصوص ہیں۔ ان کے آپس میں ضم ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ خونی جاگیری جنگوں کی وجہ سے آبادی کم ہو گئی تھی۔ علمی ادب ختم ہو گیا تھا اور ملاؤں کا اثر بڑھ گیا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ والے وسطی ایشیا کے ماہرین فلکیات، ریاضی دانوں اور حکیموں کے شاہکار گمنام ہو گئے تھے[1] اور سائنسی علوم سیکھنا گناہ قرار دیا جاتا تھا۔ معاشرتی زندگی پر ملاؤں کے کٹر عقائد چھا گئے تھے جنھوں نے قومی شعور کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ غافل اور پسماندہ لوگوں کو ملا غلط پروپیگنڈے سے ورغلاتے تھے اور ان کے ذہنوں میں تنگ نظری اور تعصب پھیلاتے تھے۔ لیکن ناقابل برداشت ظلم اور ثقافتی جمود کے باوجود عوام کی تخلیقی ذہانت نے کئی ممتاز شاعر اور ترقی پسند مفکر پیدا کیے۔ انھوں نے معاشرتی بے انصافی، ظلم، تنگ قبائلی روایات اور ملائیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

ان میں بڑے پائے کے ازبیک شاعر طوردی (سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے شروع میں) ہیں۔ انھوں نے نہ صرف جد و جہد کرنے کی دعوت دی بلکہ جب عوام بخارا کے مطلق العنان خاں سبحان قلی خان کے مظالم کے خلاف ہتھیار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تو طوردی نے مسلح لڑائی میں حصہ لیا۔ اس جد و جہد کے ذریعہ وہ بکھرے ہوئے ازبیک قبائل کو متحد کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح ترکمانی شاعر اور مفکر مخدوم قلی بھی ترکمانی قبائل سے متحد ہونے کی اپیل کی۔

اس زمانے میں غیر مناسب حالات کے باوجود وسطی ایشیا کے لوگوں میں ہر ایک نے اپنی

---

[1] خانیکوف، بخارا خان کی قلمرو کے متعلق تحریر، سینٹ پیٹرسبرگ، ۱۸۴۳ء صفحات ۵۲، ۷۵۔

مشترکہ زبان، طریقہ زندگی اور مخصوص ثقافت کی نشوونما کر لی تھی۔ لیکن ان کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی پسماندگی کے سبب ان کا قومی ارتقا بلند سطح تک بڑھنے سے رک گیا تھا جب وسطی ایشیا اور قزاخستان زار کی روسی سلطنت میں شامل کر لیے گئے تو سرمایہ داری کے ابتدائی عناصر ابھرنا شروع ہوئے۔ مجموعی طور پر پسماندہ خانوں کی قلمروؤں کے زیادہ ترقی یافتہ روس میں ضم ہو جانے کا خارجی طور پر ترقی پسند نتیجہ نکلا۔ ہلاکت آمیز جنگیں ختم ہونے اور سرمایہ دارانہ تعلقات بڑھنے سے جاگیردارانہ جمود ختم ہو گیا۔ ریلوں کی تعمیر، تجارت کی توسیع اور منڈی میں بیچی جانے والی زرعی پیداوار میں اضافہ۔ مثلاً کپاس۔ ان تمام عناصر کی وجہ سے روسی سلطنت کا یہ دور افتادہ علاقہ عالمی منڈی کے حلقے میں داخل ہو گیا۔ اس نئے سرمایہ دارانہ ارتقا کی بنیاد پر وسطی ایشیا کے ان قومی گروپوں نے فروغ پا کر بورژوا قوموں کی شکل اختیار کی۔

روسی ریاست کا ارتقاء

ہم پچھلے صفحات میں وسطی ایشیا کی مملکتوں کے ارتقا کا حال دیکھ آئے ہیں اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس دوران ان وسطی ایشیا کی مملکتوں کے سب سے قریبی ہمسایہ روس کی مملکت کے ارتقا کا حال بھی معلوم کر لیں۔ تیرہویں صدی میں جب منگولوں نے روس کے علاقوں کو بھی تاخت و تاراج کیا تو اس کے بعد سے ہی روسی علاقوں چھوٹی چھوٹی مملکتوں اور جاگیرداریوں کو جو مختلف ڈیوکوں کے زیر نگیں تھیں کے اندر اتحاد اور وحدت کی تحریک ابھری دراصل یہ شہریوں اور کسانوں کی اپنی ضرورت تھی، تحفظ کی ضرورت حملہ آور کا مقابلہ کیا جا سکے اور امن سے زندگی گزاری جا سکے۔ یہ پورا عمل پندرہویں صدی پر محیط ہے یہ درست ہے کہ عام طور پر قاری کو تاریخی عمل کے گورکھ دھندوں میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہوئی لیکن میں یہاں پر اس تاریخی عمل کو صرف قدرے تفصیل سے اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ یہ سمجھا جا سکے کہ کس طرح ایک وسیع مرکزی سلطنت لوگوں کی ضرورت کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں کیونکہ جو عمل روس کی سرزمین پر وجود میں زیادہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دوسرے ممالک میں بھی رونما ہوتا رہا ہے اس پس منظر میں جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ

روس کی ریاستی وحدت کی کوشش، جس کو سماجی اور معاشی ارتقا کے پورے دھارے نے تیار کیا تھا ماسکویہ کے گرانڈ ڈیوک ایوان سوم (دور حکومت ۱۴۶۲ء ـــ ۱۵۰۵ء اور

واسیلی سوم (دورِ حکومت ۳۳ — ۱۵۰۵ء) کے زمانے میں خاص طور سے کامیاب ہوئی۔ ۱۴۶۳ء میں یاروسلاول کی ریاست اور ۱۴۷۴ء میں روسوف کی ریاست ماسکو سے مل گئی۔ ۱۴۷۸ء میں نووگورود کے متحد بیاروں اور تاجروں نے لیتھونیا کی مدد سے اپنی خود مختاری برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ نومبر ۱۴۷۰ء میں انہوں نے لیتھونیا سے گرانڈ ڈیوک کو نووگورود بلایا۔ ۱۴۷۱ء کے موسم بہار میں نووگورود کی بیار حکومت نے لیتھونیا کے گرانڈ ڈیوک اور پولینڈ کے شاہ کازیمیر چہارم فوجی امداد کے لئے معاہدہ کیا۔ یاروں کے اقدامات سے نوگورود میں سماجی تضاد اور بھی بڑھ گیا۔ باشندوں کی اکثریت شہری اور دیہاتی دونوں، اس بات کے حق میں تھی کہ ماسکو کی قیادت میں مرکزی روسی ریاست بنا کر روسی علاقوں کو متحد کیا جائے۔ ایوان سوم نے نووگرود کی جاگیردارانہ سماج کے اس طبقاتی تضاد سے فائدہ اٹھایا اور شہری باشندوں اور کسانوں کی حمایت سے نووگورود پر حملہ کردیا۔ ۱۴۷۱ء میں اس نے دریائے شیلان کے کنارے نووگورود کی فوج کو شکست دی۔ ایوان سوم نے نووگورود سے ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق نووگورود گرانڈ ڈیوک کا ماتحت ہو گیا۔ ۱۴۷۸ء میں نووگورود کی وسیع ریاست ماسکو کی گرانڈ ڈچی میں شامل ہو گئی۔ نووگورود کی ویچے ختم کردی گئی، اس کے بیار امرا کافی تعداد میں وہاں سے "منتقل" کر دیئے گئے اور ان کی جگہ ماسکو کے دوایانستوو کی جاگیریں وسیع کر دی گئیں۔

نووگورود کے الحاق کے بعد تویر کی ریاست کے علاقے اس مرکزی ماسکو ریاست کے علاقوں سے گھر گئے جو ابھی تشکیل پا رہی تھی۔ ۱۴۸۵ء میں تویر کی ریاست بھی روسی ریاست میں شامل ہو گئی۔ پندرہویں صدی کے نویں عشرے میں ایوان سوم نے مقامی جاگیرداروں کے خلاف کسانوں اور شہریوں کی تحریک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پسکوف کے معاملات میں مداخلت کی۔ چنانچہ ۱۵۱۰ء میں پسکوف کا الحاق ہو گیا جو دراصل بہت مدت پہلے ماسکو کا ماتحت تھا۔ ریازان کی ریاست بھی جو بہت دنوں سے ماسکو کی ماتحت تھی، آخرکار اپنی خود مختاری سے ۱۵۲۱ء میں محروم ہو گئی۔

کافی بڑا روسی علاقہ لیتھونیا کے زیر نگیں تھا۔ پندرھویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے ابتدا میں روسی علاقوں کی واپسی کے لئے کئی لڑائیاں ہوئیں اور ویازما، دیبنا، سوژا اور کئی دوسرے

دریاؤں کے اوپری حصے روسی ریاست میں واپس آگئے۔ ۱۵۱۴ء میں قدیم روسی شہر سمولینسک جو ۱۴۰۴ء سے لیتھوینیا کے زیر حکومت تھا، روس کو واپس مل گیا۔

روسی ریاست کے اتحاد کے ساتھ کئی ایسی قومیں بھی روسی ریاست میں آگئیں جن کا تعلق تاریخی طور پر روسیوں سے تھا۔ یہ تھیں شمالی اور وا لگا کے بیسن کی قومیں: ماری، یوگرا، کومی قوموں کا کچھ حصہ (چودہویں صدی کے آخر میں) اور ویپچورا اور کریلیائی وغیرہ (پندرہویں صدی کے آخر میں) مرکزی روسی ریاست نے ایک کثیر اقوامی ریاست کی شکل اختیار کرلی جس میں ایسے لوگ شامل تھے جن کا ارتقا علیحدہ قوموں کی حیثیت سے نہیں ہوا تھا بلکہ وہ واحد ریاست کے فرد ہونے کے ناطے متحد ہو گئے تھے۔

واحد ریاست کی حیثیت سے ملک کا اتحاد بڑی تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ اس سے معاشی اور تہذیبی ترقی کی ضمانت ہوئی اور غیر ملکی حملوں سے بچاؤ میں بھی آسانیاں پیدا ہوئیں۔ پندرہویں صدی کے نویں عشرے تک مرکزی ریاست کے تنظیمی خد و خال واضح ہو گئے۔ گرانڈ ڈیوک کی طاقت میں بھی بہت اضافہ ہو گیا تھا اور جاگیر دار جو پہلے خود مختار خراج گذار تھے اب گرانڈ ڈیوک کی رعایا بن گئے تھے۔ ملسکو یہ کے گرانڈ ڈیوک کی خدمت سے انکار زبردست غداری شمار ہونے لگی۔ مرکزی حکومت کے ادارے جیسے بیارسکایا دوما (بیکار کونسل) اور پریکازی (وزارتیں) قائم ہوئے۔ فوجی تنظیم نئے طریقے سے کی گئی جس میں امیروں کی جاگیروں سے آئے ہوئے تربیت یافتہ جتھوں کا رول بہت نمایاں تھا۔ ریاستی حکام نے دواریانستوو کی معاشی حالت بہتر بنانے اور کسانوں پر ان کے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے فیصلہ کن اقدامات کئے۔ ایسی جاگیروں میں تیزی سے اضافہ ہوا جن کے دیسی باشندے جاگیر دار تابعدار ہوتے تھے (یہ جاگیریں پامیستے کہلاتی تھیں)۔ مرکزی ریاست کو مضبوط کرنے میں پہلے ضابطۂ قانون کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو ۱۴۹۷ء میں ایوان سوم نے منظور کیا تھا۔ اس بات کی قانونی طور پر اجازت دے کر کہ مالک اپنے کسان غلاموں کو سال میں صرف ایک دن (یوم سینٹ جارج — یوریف دن) آزاد کر سکتے ہیں، ۱۴۹۷ء کے ضابطۂ قانون نے پورے ملک میں کسان غلامی کے رواج کے لئے ٹھوس بنیاد

فراہم کردی اور اس کو جاگیرداروں اور کسانوں کے تعلقات میں قانونی طور پر تسلیم کرلیا۔

مرکزی روسی ریاست کے اتحاد کی وجہ سے ان بیاروں کے خلاف جدوجہد تیزی پکڑ گئی جو دواریانستوو کی بڑھتی ہوئی طاقت اور گرانڈ ڈیوک کی مطلق العنانی کو روکنا چاہتے تھے بہرحال دواریانستوو اور گرانڈ ڈیوک کو بیاروں کی ان سازشوں اور بغاوتوں کو دبانے میں کامیابی ہوئی جو پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی کی ابتدا میں ہوئی تھیں۔ چرچ نے ریاست کی طاقت مضبوط کرنے میں مدد دی اور گرانڈ ڈیوک نے چرچ کو ایسے لوگوں کے خلاف جدوجہد کرنے میں مدد دی جو چرچ کی معاشی حیثیت کمزور کرنا چاہتے تھے اور چرچ کے لیے حصول ملکیت کو گناہ قرار دے کر اس کی زمینوں کی ضبطی کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس طرح چرچ گرانڈ ڈیوک کا وفادار حلیف بن گیا۔

روسی علاقوں کے اتحاد نے ماسکو کو تمام غیر ملکی سیاسی سرگرمی کا مرکز بنا دیا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں ایوان سوم کی حکومت نے ان دشمنوں کی سازشوں کا مقابلہ بڑی مہارت سے کیا جو مرکزی روسی ریاست کو پائیدار و مضبوط نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے روسی ریاست کے دشمنوں کے درمیان اختلافات کو بڑی ہوشیاری سے استعمال کیا مثلاً طلائی جرگے اور کرائمیا کی خان شاہی کے درمیان پولینڈ اور لتھوینیا اور لیوانیائی آرڈر وغیرہ کے درمیان اختلافات کو۔ ۱۴۶۷ اور ۱۴۶۹ء کی لڑائیوں کی وجہ سے قازان کی خان شاہی کو کچھ عرصے کے لئے سلامتی کا دور دیکھنا نصیب ہوا تو حکومت نے منگول تاتار غلامی اور طلائی جرگے کی ماتحتی کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی طرف توجہ کی۔ کرائمیا کے خان مینگلی گرائی سے معاہدہ کرکے روسی ریاست نے اپنے دشمنوں کی طاقت کمزور کردی۔ ۱۴۷۶ء میں طلائی جرگے کو خراج دینا بند کردیا گیا۔ طلائی جرگے کے خان احمد نے دریائے اوگرا کے کنارے ۱۴۸۰ء میں جو حملہ کیا اس کو پسپائی ہوئی۔ منگول تاتار غلامی جو روس کی پیداواری طاقتوں کی راہ میں روڑا اٹکی ہوئی تھی اور پسماندگی کے خاص اسباب میں سے تھی ختم ہوگئی۔ یہ روسی عوام کی طویل اور جری جدوجہد کا نتیجہ تھا اور روسی ریاست کی غیر ملکی سیاست میں ایک اہم واقعہ۔ لتھوینیا، لیوانیائی آرڈر اور روس کے دوسرے دشمنوں کو نئی ریاست سے لڑائیوں میں ہار کا منہ

دیکھنا پڑا۔ دوسری ریاستوں سے سیاسی تعلقات میں توسیع ہوئی۔ روس میں ریاستی طاقت کی وحدت یوکرین، بیلوروس اور مولداویہ کے باشندوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی، جو غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد میں روسیوں کے ہمنوا تھے۔

ماسکو کی گرانڈ ڈچی کے ماتحت روس کے اتحاد کی وجہ سے پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کی ابتدا میں کافی تہذیبی ترقی ہوئی۔ اس دور کی روسی تصانیف نے قرون وسطیٰ کے مخصوص مذہبی اسٹائل میں روسی ریاست کو مضبوط کرنے پر زور دیا (ولادیمیر کے شہزادوں کی داستان" ایلیازار خانقاہ کے راہب فیلوفئی (پسکوف) کے خطوط واسیلی سوم کے نام جن میں پہلی مرتبہ ماسکو کو" روم سوم" بنانے کا خیال پیش کیا گیا تھا اور دوسری تصانیف) ان تصانیف میں ماسکو کا قیادتی رول پیش کیا گیا تھا اور اس کی قیادت کو صرف تمام روسی علاقوں کے لیے ہی بنیاد نہیں قرار دیا گیا تھا بلکہ ان تمام لوگوں کے لئے جو قدیم عیسائیت یعنی آرتھوڈاکس عیسائیت کے پیرو تھے۔ روزنامچوں نے بھی مرکزی ریاست کے خیال کو تقویت پہنچائی۔

اس دور میں روسی مصوری اور تعمیر نے کافی ترقی کی۔ پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کی ابتدا میں کریملن کے اندر بہت اچھی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور اس کے چاروں طرف نئی فصیل پھر سے بنائی گئی۔ کریملن کی عمارتوں میں روسی ریاست کی بڑھتی ہوئی طاقت کا نظریہ مجسم پیش کیا گیا۔

سولہویں صدی میں روسی ریاست کی پائداری

سولہویں صدی میں جاگیردارانہ رشتوں کا کافی ارتقا ہوا۔ شمالی اور جنوبی دونوں میں نئی نئی زمینیں جوتی گئیں۔ مویشیوں کے پالن پوسن میں بھی ترقی ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ زمین جاگیردارانہ ملکیت بنتی گئی۔ خصوصاً دوار یانستوں کی جاگیروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جاگیردارانہ ملکیت اراضی میں پومیستیے سسٹم کا رواج وہ اہم خصوصیت تھی جس نے مرکزی روسی ریاست کو مضبوط کرنے میں مدد دی۔ ایسے افراد نے جو زمینوں کے مالک تھے کسانوں کی "سیاہ" زمین کو

جاگیردارانہ ملکیت بنا کر ان کو لوٹنے کھسوٹنے کا میدان اور وسیع کر لیا۔ اس طرح جاگیرداروں کے مظالم میں اضافہ ہوگیا۔ سولہویں صدی کے آخر تک بیگار کا رواج عام ہوگیا۔ تباہ حال کسان اور شہر کے باشندے جاگیرداروں کے تابعدار ہو گئے۔ محنت کی سماجی تقسیم کے ساتھ شہروں نے بھی ترقی کی اور تجارتی اور مالی تعلقات بھی بڑھے۔ سولہویں صدی کے روسی شہروں میں دو مختلف حرفتوں کے کاریگر تھے اور ملک کے مختلف حصوں کے درمیان تجارتی تعلقات بھی تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔ سولہویں صدی کے آخر تک کچھ علاقے تو اپنی مصنوعات کے لئے کافی مشہور ہو چلے تھے۔ اس کا دارومدار عام طور سے جغرافیائی حالات پر ہوتا تھا (نووگورود میں آہن سازی، وولگدا، یاروسلاول اور نووگورود وغیرہ میں چمڑا کمانا اور چمڑے کا سامان بنانا وغیرہ)۔ شہری اور دیہی علاقوں میں جائداد کی تفریق اور زیادہ ہوگئی تھی۔ چونکہ روسی علاقوں کا اتحاد ایسے زمانے میں ہوا تھا جب کہ جاگیردارانہ نظام کا دور دورہ تھا اس لئے کافی سیاسی اور سماجی فرق باقی رہ گیا۔ بیاروں کی معاشی طاقت کی بنیاد یعنی ان کی بڑی بڑی جاگیریں اب بھی باقی تھیں اور مقامی اختیارات بھی انہیں کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ مرکزی طاقت کے بہت کم محتاج تھے اس لئے بہت سی مقامی چیزیں جیسے مقامی جنگی وغیرہ اب بھی باقی تھیں۔ زیادہ طاقتور جاگیرداروں کے یہاں تو ان کی فوج بھی رہتی تھی۔ کچھ چھوٹی ریاستوں نے اپنی خودمختاری برقرار رکھی تھی۔ شہزادے اور بیار اپنے مراعات برقرار رکھنے پر تلے ہوئے تھے اور مرکزی حکومت کے خلاف برابر جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ سولہویں صدی کے وسط میں گرانڈ ڈیوک ایوان چہارم کی نابالغی سے فائدہ اٹھا کر بیاروں نے نظام حکومت کی باگ خود سنبھال لی چنانچہ یہ زمانہ (۴۷ــ۱۵۳۸ء) "بیاروں کا دور حکومت" کہلاتا ہے۔ روسی ریاست کی معاشی اور سیاسی حالت پر بیاروں کی حکومت کا اثر بہت تباہ کن ہوا۔ صوبوں میں بیاروں کی حکومت کا مطلق العنان طریقہ، مختلف بیار گروہوں کے درمیان آئے دن کی سازشیں اور لڑائیاں عوام پر بہت گراں تھیں۔ اس کی وجہ سے طبقاتی جدوجہد میں اور بھی تیزی پیدا ہوگئی۔ ۱۵۴۷ء میں ماسکو کی بغاوت سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ملک میں طبقاتی جدوجہد کتنی تیز ہوگئی تھی۔ ایوان چہارم (جس کو "گروزنی" (ہولناک) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) کا دور حکومت ان حالات

میں شروع ہوا۔

۱۵۴۷ء میں چرچ (خصوصاً بڑے لاٹ پادری ماکاری) دواریانستوو اور شہری آبادی کی حمایت سے جو مضبوط مرکزی طاقت کے خواہاں تھے، ایوان چہارم کی تاجپوشی بڑے احترام کے ساتھ زار کی حیثیت سے کی گئی۔ زار کے خطاب کا مقصد شخصی حکومت کی طاقت اور خود مختاری پر زور دینا تھا۔ اپنے دور حکومت کی ابتدا میں ایوان چہارم بیار امرا سے مصالحت کرنے پر مجبور تھا تاکہ جاگیرداروں کا طبقہ طبقاتی جدوجہد کے لئے متحد رہے لیکن اس کی اندرونی اور خارجی پالیسی دونوں کا رخ زیادہ تر دواریانستوو اور ان کے طبقاتی مفاد کی حفاظت کی طرف تھا۔ حکومت کا غیر سرکاری ادارہ یعنی خواص کی کونسل جو ایوان چہارم کے دور حکومت میں وجود میں آئی تھی، نئے طبقہ، امرا یعنی دوایانستوو، چرچ کے نمائندوں اور بہت زیادہ طاقتور بیاروں کے چند نمائندوں پر مشتمل تھی۔ اس صدی کے چھٹے عشرے میں اس کونسل نے متعدد اصلاحات کیں۔ دواریانستوو کو نئی نئی زمینیں ملیں۔ تقریباً ۱۵۵۶ء میں سروس آرڈیننس کے ذریعے اشرافیہ کے تربیت یافتہ دستوں کی تنظیم میں سخت قاعدے رائج کئے گئے۔ یہ دستے روسی ریاست کی خاص فوجی طاقت بن گئے۔ اس کے علاوہ مستقل پیدل فوج (استریلتسی) بھی بھرتی ہوئی اور توپخانے اور فوجی انجنیروں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ مالی اصلاحات کی وجہ سے ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ بہتر ہو گیا اور محصولات کا بوجھ زیادہ ہو گیا۔ ۱۵۵۵ء میں مقامی گورنروں کا طریقہ ختم کر دیا گیا اور انتخاب کے ذریعہ مقامی ادارے رائج کئے گئے۔ اسی زمانے میں فوجداری کی عدالتیں بھی قائم ہوئیں اور قتل اور رہزنی (جس میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف تمام سرگرمیاں شامل تھیں) کے مقدمات مقامی افسروں کے اختیار سے نکال کر بزرگوں کی عدالت (گوبنئے استارستی) کو دے دیے گئے جس کے ممبروں کا انتخاب دوایریانستوو میں سے ہوتا تھا۔ یہ ممبر وزارت جرائم (رازبوئنی پریکاز) کے ماتحت ہوتے تھے۔ ان اصلاحات نے حکومت اور صوبوں میں اشرافیہ کی سیاسی طاقت بڑھانے میں مدد دی۔ ۱۵۵۰ء میں مرکزی حکومت کو اور مضبوط بنانے اور کسانوں پر جاگیرداروں کا شکنجہ مضبوط کرنے کے لئے ایک اور ضابطہ قانون تیار کیا

گیا۔ سب سے اونچا سیاسی ادارہ بیاروں کی کونسل تھی اس کے علاوہ زار کی پریوی کونسل بھی تھی۔ وہ ایسے بیاروں پر مشتمل تھی جو زار کے بہت "قریب" ہوتے تھے اور زار کو حکومت کے اہم معاملات میں مشورہ دیتے تھے۔ سولہویں صدی کے وسط میں تمام علاقوں کی خاص کونسل (زیمسکی سوبور) بنائی گئی، جس میں مختلف سماجی طبقوں کے نمائندے تھے۔ اس کا پہلا اجلاس ۱۵۴۹ء میں ہوا اور بعد کو جب تب ہونے لگا۔ اس مجلس کے کام کی نوعیت محض مشاورتی تھی۔ وزارتوں یا پریکازی کے نظام کو فروغ دیا گیا ہے۔ جن کی وزارت (رزریادنی پریکاز) اور وزارت امور خارجہ (پوسولسکی پریکاز) کو خاص طور سے اہمیت دی گئی۔

مرکزی حکومت کی مضبوطی کے ساتھ اہم غیر ملکی سیاسی مسائل حل کرنے کے امکانات بھی بڑھ گئے۔ اس کا انحصار دواریانستوو کی مزید جاگیر کی خواہش اور اس مطالبے پر تھا کہ ان کو تاتار حملوں سے محفوظ رکھا جائے۔ ۱۵۵۲ء کی جنگ میں قازان کی خان شاہی کا خاتمہ ہو گیا اور ۱۵۵۶ء کی لڑائی نے استراخان شاہی بھی ختم کر دی گئی۔ ۱۵۵۷ء میں عظیم نگائی جرگے نے روسی ریاست کی ماتحتی قبول کر لی۔ بشکیریوں نے قازان اور نوگائی جاگیر داروں کے ماتحت تھے، اپنی مرضی سے روسی حکومت قبول کی اور روسی باشندے بن گئے (۱۵۵۷ء) پورے وانگا بیسن کے الحاق کی وجہ سے سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کی ابتداء میں مزید نوآبادیاں حاصل ہو سکیں اور سائبیر کا الحاق ہو سکا۔ زار اور جاگیرداروں نے وانگا بیسن اور اورال کے علاقے کے باشندوں کو نوآبادیاتی نظام کے مظالم کا نشانہ بنایا۔ تاتار اور دوسری قومیتوں کے جاگیر دار بھی روس کے حکمراں طبقے کا جز ہو گئے۔ روسی ریاست میں ان قوموں کا شامل ہونا واقعی ترقی کا باعث ہوا کیونکہ ان قوموں میں جدید ترین معاشی رجحانات پیدا ہوئے۔ نئے علاقوں کے کچھ جاگیر داروں نے اس طبقاتی جدوجہد کو اپنی حکومت بحال کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہا جو وانگا کے عوام جاگیر دارانہ مظالم کے خلاف کر رہے تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ وانگا کے علاقے روس سے الگ ہو جائیں لیکن ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

قازان اور استراخان کی خان شاہی ریاستوں کو ختم کرنے کے علاوہ روسی ریاست

نے کرائمیا کی خان شاہی اور ترکی کے سلطان کے خلاف دفاعی تدابیر اختیار کیں۔ قلعہ بندی کا ایک سلسلہ جنوب تک پھیلا دیا گیا جو نچلے ددن تک پہنچ گیا۔ اب اوکا کے جنوب کے نیٹے زرخیز علاقوں میں کھیتی باڑی ہو سکتی تھی جو "جنگلی میدان" کہلاتے تھے۔ ۵۹-۱۵۵۶ء میں کرائمیا پر حملے کیے گئے۔ روس کی اندرونی ترقی کے پیش نظر اس کے لئے امور خارجہ کا سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ بحیرۂ بالٹک میں نکاس حاصل کی جائے۔ دوار یانستوو میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اس لئے زیادہ زمین حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ کاروبار کی ترقی سے رفتہ رفتہ یہ ضروری ہو گیا کہ عالمی تجارتی راستوں کی طرف رخ کیا جائے۔ بہت سے یورپی ملکوں کے لئے سولہویں صدی سرمائے کے ابتدائی ذخیرے کا دور تھا۔ ترقی پذیر یورپی بورژوازی

ستوں اور نوآبادیوں پر قبضہ جما رہی تھی۔ حالات کافی پیچیدہ صورت اختیار کرنے لگے کیونکہ پولینڈ، لیوانیا اور سویڈن ایسی پالیسی پر عمل پیرا تھے جو روس کے خلاف تھی، وہ روس اور مغربی یورپ کے درمیان معاشی اور تہذیبی تعلقات میں رکاوٹ ڈالنے کی ہر امکانی کوشش کرتے تھے۔

ایوان چہارم کی حکومت نے بالٹک کے علاقے حاصل کرنے کے لئے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں اور دوار یانستوو اور شہری آبادی کے اوپری طبقے کی حمایت پر بھروسہ کرکے لیوانیا میں جنگ شروع کر دی جو ۱۵۵۸ء سے ۱۵۸۳ء تک چلتی رہی۔ جنگ کی ابتدائی منزلوں میں روسی فوج کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ لیکن لڑائی جوں جوں بڑھتی گئی اور اس کی طوالت کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت خراب ہوتی گئی اور رجعت پسند بیاد امیروں کی ریاست دشمن سرگرمیاں سامنے آنے لگیں۔ بین اقوامی حالات بھی پیچیدہ ہو گئے کیونکہ پولینڈ، سویڈن اور دوسرے ملک بھی جنگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۵۶۹ء کی لیوبلین یونین کے ماتحت پولینڈ اور لیتھوینیا واحد ریاست بن گئے جس کو رژیچ پوسپولیتا (RZECZ POSPOLITA) کہتے تھے۔ اس طرح لیوانیا کی جنگ میں روس کے دشمنوں کی طاقت بڑھ گئی اور اس وقت روس بحیرۂ بالٹک کے علاقے میں اپنے قدم نہیں جما سکا۔ لیکن ۱۵۸۱ء اور ۱۵۸۲ء میں پسکوف کا دفاع کرکے ان پولستانی فوجوں کو بڑی بہادری سے شکست دی جو روس پر حملہ آور ہوئی تھیں

روسی ریاست والوں نے بڑی خوبی سے پوپ کے ان ایجنٹوں کی کوششوں سے دامن بچالیا جو روس کی خراب پوزیشن سے فائدہ اٹھاکر اس پر نامناسب شرائط کا معاہدہ لادنا چاہتے تھے اور روس میں کیتھولک مذہب پھیلانے کے خواہاں تھے۔

وسط سولہویں صدی کے اصلاحات نے روسی ریاست اور دوواریانستوو کی طاقت کو مضبوط کیا۔ لیکن طبقہ امرا یعنی شہزادے اور بیار وغیرہ ختم نہیں کئے جاسکے۔ بڑے بیار ابھی ان مراعات کو نہیں بھولے تھے جو ان کو جاگیردارانہ نفاق کے دور میں حاصل تھے۔ بیاروں کی سیاسی طاقت کی معاشی بنیاد کمزور کرنے کے لئے ایوان چہارم کی حکومت نے ۱۵۶۵ء اور ۱۵۸۲ء کے درمیان کچھ غیر معمولی اقدامات کئے جو اپریچنینا کہلائے۔ یہ نام قدیم روسی لفظ "اپریچ" سے لیا گیا تھا جس کے معنی ہیں "مخصوص" "علیحدہ" "غیر معمولی" ایوان چہارم نے ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کردیا، زیمچینا یا زمینیں جو زیادہ تر ملک کی سرحدوں پر واقع تھیں۔ یہ بیاروں کی حکومت میں دے دی گئیں اور اپریچنینا یعنی ریاست کا وسطی حصہ، جہاں تمام طاقت ایوان چہارم کے ہاتھ میں تھی اور وہ دوواریانستوو کے منتخب شدہ اپریچنیکوں کا قائد تھا۔ اپریچنینا کا اقدام بڑے بڑے بیار جاگیرداروں کے خلاف اور دوواریانستوو یا اشرافیہ کے حق میں تھا۔ اس سے قدیم بیار امیروں کو ضرب کاری لگی۔ زمین کی تقسیم اور اپریچنینا یعنی مخصوص فوج کی تنظیم کے ساتھ عام طور پر مظالم ہونے لگے جن کا نشانہ صرف بیار ہی نہ تھے بلکہ شہری اور دیہی آبادی بھی تھی (مثلاً ایوان "ہولناک" کا ۱۵۷۰ء میں نووگورود پر حملہ) — اپریچنینا کی وجہ سے کسانوں کو بڑی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ لیوانیائی جنگ اور اپریچنینا نے ملک کے کافی حصے کو تباہ کردیا۔ اپریچنینا ایک اور اقدام تھا اشرافیہ کو مضبوط کرنے اور کسانوں کو غلام بنانے کا۔

روسی ریاست میں کلچر اور وسطی ایشیا سے تعلقات

متحدہ روسی ریاست کی مضبوطی کے ساتھ تہذیب نے بھی ترقی کی۔ مطلق العنان بادشاہی کے نظریے کا پرچار کرنے والے ایک امیر صحافی ایوان پریسویتوف، ایوان چہارم اور بیار امیروں

کے مفاد کا بچاؤ کرنے والے اندرئی کوربسکی وغیرہ نے روسی سماجی خیالات کو کئی اہم کتابوں میں جمع کیا۔ جاگیرداری کے خلاف کسانوں اور غلاموں کے احتجاج کی جھلک کو سوئی اور دوسرے منکروں کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ اس دور کے فن تعمیر کی اہم یادگاریں کولومینسکوئے گاؤں کا گرجا گھر اور ماسکو میں سینٹ بازل گرجا گھر وغیرہ ہیں۔ ملک کی تہذیبی اور سیاسی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ روس میں (تقریباً ۱۵۵۳ء) میں چھاپے خانے کا رواج تھا۔ ۱۵۶۴ء میں پہلے روسی پرنٹر ایوان فیودوروف نے اپنی پہلی پرنٹ کی ہوئی کتاب "اپاسٹل" شائع کی۔ بڑے لاٹ پادری ماکاری کے حلقے نے متعدد ادبی تصانیف پیش کیں۔ اس دور کے تاریخی روسی ادب میں قازان کے روزنامچے ہیں جن میں روسی ریاست اور قازان کی خان شاہی ریاست کی لڑائیوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک باتصویر روزنامچہ اور "اسٹیپنایا کنیگا" یا مراتب کی کتاب بھی ہے۔ اس کتاب میں ایوان چہارم کے آباد اجداد کی سوانح حیات مراتب کے لحاظ سے پیش کی گئی ہے اور اس نظریہ کی حمایت کی گئی ہے کہ روسی زاروں کی مطلق العنان طاقت لافانی نوعیت رکھتی ہے اور عالمی امور میں روس کیف روس اور بزنطین کے جانشین کی حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انجنیئر وبروکوف اور توپیں بنانے والے چوخوف نے ٹکنیکل نظریات کو تقویت پہنچائی۔

بالٹک میں بحری راستے کے لئے روس کی جدوجہد کی ابتدا، لیوانیائی آرڈر کی شکست اور روس سے اس کا معاہدۂ امن، یہ تھے وہ عناصر جن کی وجہ سے بالٹک اور روسی ریاست کے درمیان معاشی اور سیاسی تعلقات وسیع ہوئے۔

شہر ناروا کے سامنے ایک روسی قلعہ ایوان گورود ۱۴۹۲ء میں بنایا گیا اور ریگا، تارتو اور تالین کے شہریوں نے ایک "روسی پارٹی" بنائی جو روس سے میل کرنے کے حق میں تھی۔

سولہویں صدی میں بالٹک کے علاقے میں کسانوں کو غلام بنانے کا طریقہ جاری رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن جاگیردار (بیرن) اور جاگیردار چرچ کے خلاف جدوجہد اور تیز ہو گئی۔ بالٹک کے عوام پر تین صدیوں تک مظالم کرنے کے بعد ظالم لیوانیائی آرڈر ۱۵۶۱ء میں لیوانیائی جنگ

میں تباہ ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد بھی بحیرۂ بالٹک کے اطراف کے علاقے پھر غیر ملکی جاگیرداروں کے چنگل میں چلے گئے جنھوں نے سابق لیوانیائی آرڈر کے علاقوں کا حصہ بخرہ کر لیا۔ ایسٹ لینڈ سویڈن کا ماتحت ہوگیا، لیتھوینیا پولینڈ کی حکومت میں چلا گیا اور کورلینڈ کی نئی ریاست بھی پولینڈ کی ماتحت ہوگئی۔

پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی میں یوکرین اور بیلوروس میں تجارتی اور مالی تعلقات اور بڑھے۔ شہر آباد ہوئے اور پروان چڑھے اور شہر و دیہات کے رہنے والوں میں ملکیت کا فرق زیادہ ہوگیا۔ جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ اور بیگار کے رواج میں اضافہ ہوا۔ کسان غلام غلامی سے نجات پانے کے لئے بڑی ریاستوں سے بھاگنے لگے اور سولہویں صدی کے وسط میں پہلے یوکرینی اور پھر روسی مفرور کسان غلاموں نے زپوروژئے سیچ کا مورچہ دریائے دنیپر کی ڈھلوان قلیٹی میں بنایا، جس کا کرائمیا، ترکی اور پولینڈ کے جاگیرداروں کے خلاف یوکرینی عوام کی جدوجہد آزادی میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ زپوروژئے کے کزاک بھی جو ایک خاص سماجی گروہ کی صورت اختیار کر چکے تھے جاگیرداروں کے خلاف کسانوں کی جدوجہد کے حامی تھے۔

یوکرین اور بیلوروس دونوں میں سولہویں صدی کی دوسری چوتھائی میں کسان غلامی کا رواج طبقاتی نظام کا باقاعدہ جزو بن گیا اور اس کو ۱۵۸۸ء میں تیسرے لیتھوینیائی ایکٹ کے ذریعہ قانونی شکل دے دی گئی — ۱۵۶۹ء میں لیوبلین یونین اور پولستانی لیتھوینیائی ریاست بننے کے بعد پولستانی جاگیرداروں (میگ نیٹس) نے مزید یوکرینی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کیا۔ کسان غلامی کے رواج اور اضافے نے طبقاتی جدوجہد میں اور شدت پیدا کر دی جس کا اظہار کزاکوں اور کسانوں کی ان بغاوتوں سے ہوا جو یوکرین میں کوسینسکی (۹۳-۱۵۹۱ء) نالیو انکو اور لوبودا (۹۶-۱۵۹۴ء) اور دوسرے لوگوں کی قیادت میں اور بیلوروس میں ماتیوشا اور گولی (۱۵۹۰ء) وغیرہ کی سرکردگی میں ہوئیں۔ یوکرینی اور بیلوروسی قوموں کی تشکیل سولہویں صدی کے یوکرینی اور بیلوروس میں گرجاؤں کی برادریوں نے تہذیبی ترقی میں مدد دی۔ انھوں نے چھاپے خانے اور اسکول قائم کئے اور ادب وغیرہ کی اشاعت کی۔ وہ ان کوششوں کو رد کرنے

میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو آبادی کو پولستانی اور کیتھولک بنانے کے لیئے کی جا رہی تھیں۔ ان کوششوں میں بریست کی یونین کے بعد کافی اضافہ ہوگیا تھا (۱۵۹۶ء) بریست کی یونین نے مغربی روس کے کیتھولک اور یونانی کلیساؤں کو متحد کر کے متحدہ کلیسا کی بنیاد ڈالی جو سولہویں صدی میں پاپائے روم کے حدود اختیار میں تھا۔ سولہویں صدی میں بھی، یوکرین اور بیلوروس کے عوام نے روسی ریاست سے اپنے تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ یوکرینیوں اور بیلوروسیوں نے سولہویں صدی کی ابتدا میں لیتھوینیا کے خلاف لڑائیوں میں روسی فوجوں کی مدد کی۔

پندرہویں صدی کے آخر (۱۴۷۴ء) میں ترکوں نے مولداویہ پر حملہ کیا۔ ۱۴۷۵ء میں وسلوئیہ کی جنگ میں مولداویہ کی فوج نے ترکوں کے پیر اکھاڑ دیئے لیکن اس کے بعد ترکوں نے کئی برسوں تک مولداویہ پر برابر حملے کر کے ملک کو تباہ کیا۔ پولستانی جاگیرداروں نے مولداویہ کے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اس پر حملہ (۱۴۹۷ء میں) کر دیا لیکن ایوان سوم کی مداخلت کی وجہ سے لیتھوینیا کی فوجیں پولستانیوں کی مدد نہ کر سکیں۔ پولستانی فوجیں کوزمنسکی جنگل کی لڑائی میں بالکل تباہ ہوگئیں۔ مولداویہ کے عوام یوکرینیوں سے مل کر جاگیرداروں کے مظالم کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ موخا کی قیادت میں جو کسان بغاوت ہوئی وہ ۱۴۹۰ء سے ۱۴۹۲ء تک چلتی رہی۔ اس کا اثر مولداویہ اور گیلیشیا کے علاقوں پر بہت پڑا۔

سولہویں صدی میں جارجیا متعدد چھوٹی سلطنتوں اور ریاستوں میں بٹ گیا۔ پورب میں کہیتیا، پچھم میں امریتیا، وسط میں کارتلی، جنوب میں سمتخ ستھاباگو اور دوسری ریاستیں بن گئیں۔ اس دور میں جاگیردارانہ ملکیت اراضی کو ترقی ہوئی اور کسان غلاموں کے استحصال میں اضافہ ہوگیا۔ آرمینیا اور آذربائیجان صفوی سلطنت میں شامل کر لئے گئے جو پندرہویں اور سولہویں صدی کے موڑ پر قائم ہوئی تھی۔ سولہویں صدی میں ماورائے قفقاز کے علاقے میں ترکی اور ایران کے درمیان تباہ کن لڑائیاں ہوئیں جن سے ان علاقوں کی معیشت اور تہذیب کو سخت نقصان پہنچا۔ آرمینیا پر دوسروں سے زیادہ مصیبت ٹوٹی اور اس کی آبادی کا بڑا حصہ یا تو ختم کر دیا گیا یا ملک سے بھگا دیا گیا۔ ۱۵۵۵ء میں ایران اور ترکی کے درمیان ایک معاہدے کے ماتحت آرمینیا اور جارجیا ان دونوں کے درمیان تقسیم ہوگئے۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف

جدوجہد کے دوران ماورائے قفقاز اور روسی ریاست میں تعلقات قائم ہوئے۔ پندرہویں صدی کے آخر میں جارجیا سے ماسکو کو سفیر بھیجے جانے لگے۔ سولہویں صدی کے وسط میں ایوان چہارم نے کزاکوں کا ایک دستہ کہیتیا کے شاہ لیوان کے یہاں بھیجا اور ۱۵۸۷ء میں کہیتیا کے شاہ الیکسانڈر دوم نے روسی ریاست کی ماتحتی قبول کرلی۔ آرمینیا کے پناہ گزیں روسی علاقے میں آباد ہوگئے اور آرمینیا اور آذربائجان کے تاجر روسی شہروں میں تجارت کرنے لگے جن میں ماسکو بھی شامل تھا۔

سولہویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں روس کے معاشی اور سیاسی تعلقات شمالی قفقاز کی قوموں (چرکیشیا وغیرہ) سے بڑھے کیونکہ ان قوموں نے ترکوں اور ایرانیوں کی مداخلت سے پناہ مانگی۔ ۱۵۵۷ء میں کبارداکا علاقہ بھی روس کے زیر سایہ آگیا۔

پندرہویں اور سولہویں صدی میں ازبکوں نے جابجا بسنا شروع کیا۔ یہ ازبک قوم کی تشکیل کا دور تھا۔ بخارا اور سمرقند وسط ایشیا کے اہم تجارتی اور صنعتی مرکز بن گئے۔ سولہویں صدی کے آخر میں بخارا کے خان عبداللہ دوم نے وسط ایشیا میں بہت بڑا علاقہ فتح کرکے اس کو ازبک خان شاہی میں شامل کرلیا۔ اس خان شاہی میں تاجک اور ترکمان قومیں بھی شامل تھیں۔ ازبک خان شاہی کی معیشت ترقی کرگئی، آبپاشی کے ذرائع میں اضافہ ہوا۔ تاجروں کے کارواں ہر حصے میں تجارت کرنے لگے اور حرفتوں کا کافی فروغ ہوا۔ عبداللہ دوم کی موت (۱۵۹۸ء) کے بعد شیبانی خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور ازبک خان شاہی دو ریاستوں میں تقسیم ہوگئی — بخارا اور خیوا۔ جاگیردارانہ ملکیت اراضی کا رواج بڑھنے لگا اور ٹیکس خاص طور سے زیادہ ہوگئے۔

قازان اور استراخان کی خان شاہی ریاستوں کے الحاق کے بعد روس اور وسط ایشیا کے درمیان تعلقات قائم ہوگئے اور دونوں ازبک ریاستوں اور روسی حکومت کے درمیان براہ راست تعلقات تھے۔

پندرہویں اور سولہویں صدی میں قزاخستان کے علاقے میں کئی چھوٹی ریاستیں تھیں اور سولہویں صدی میں قزاخوں نے ایک علیحدہ قوم کی صورت اختیار کرلی تھی۔

روس اور وسطی ایشیا کے تعلقات

اور یہی وہ زمانہ تھا جب روس کے تعلقات کا سلسلہ وسطی ایشیا کی مختلف مملکتوں سے شروع ہوا۔ سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں روس سے آٹھ مشن وسطی ایشیا آئے، سترھویں صدی میں خیوا کے بارہ اور بخارا کے تیرہ مشنوں نے روس کا دورہ کیا۔ روس اور وسطی ایشیا کے درمیان تعلقات صرف مشنوں اور تجارتی قافلوں کے تبادلوں تک ہی محدود نہ تھے۔ سترھویں صدی میں بخارا اور تاشقند کے بہت سے ازبک اپنے علاقے چھوڑ کر سائبیریا میں آباد ہو گئے جن میں اکثر تاجر، کسان، دست کار تھے روسی سرکار نے اپنی اورین برگ استراخان اور بشکیر علاقوں میں کئی ایک مراعات سے نوازا۔

اٹھارہویں صدی میں یہ رشتے اور بھی زیادہ مضبوط ہو گئے جب قزاخستان کے قبائل کی اپیل پر قزاخستان کا ایک حصہ روس میں شامل کر لیا گیا۔ انیسویں صدی میں روس اور وسطی ایشیا کے تعلقات ایک نئی منزل میں داخل ہوئے۔ اگر انیسویں صدی کے شروع میں روسی برآمد دس لاکھ روبل تھی تو ۱۸۲۵ء میں یہ بڑھ کر ۴۰ لاکھ ہو گئی اور صدی کے وسط تک ایک کروڑ ۵۰ لاکھ۔ وسطی ایشیا کی روس میں برآمد میں بھی اسی طرح اضافہ ہوا جو اس زمانے میں ۲۰ لاکھ روبل سے بڑھ کر ایک کروڑ ہو گئی۔ صرف دس برس میں (۱۸۴۰ء - ۵۰) باہمی تجارت کی رقم میں ۶۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔

انیسویں صدی کا پہلا نصف روس کی معاشی زندگی کے لئے بڑی اہمیت کا دور تھا۔ اس زمانے میں زرعی نیم غلامی منتشر ہوئی اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ تعلقات نے لے لی۔ کسان دست کار کی پرانی معیشت بڑی تیزی سے جنس کی پیداوار کی نوعیت اختیار کرنے لگی۔ کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ ۱۸۰۴ء سے ۱۸۲۴ء تک روس میں صنعتی اداروں کی تعداد ۲۴۰۲ سے بڑھ کر ۵۲۶۱ تک پہنچ گئی اور ۱۸۶۰ء میں ۱۵۳۸۸۔ ۱۸۰۴ء میں صرف ۹۰ ہزار ۲ سو مزدور صنعتی اداروں میں کام کرتے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں ۲۱۰ ہزار ۶ سو اور ۱۸۶۰ء میں ان کی تعداد ۲۵۶ ہزار ایک سو ہو گئی۔

اس زمانے میں جب روس میں سرمایہ داری کا ارتقا تیزی سے ہو رہا تھا تو منڈیوں کی اہمیت بھی بڑھی۔ اندرونی منڈی اس وقت محدود تھی۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں روسی سوتی کپڑے کی برآمد کم ہو گئی۔ چھٹی دہائی میں کارخانے کے بنے ہوئے برطانوی اور جرمن کپڑے نے امریکی منڈی سے روسی کپڑے کو چلتا کیا۔ اس کے علاوہ خود ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کپڑے کی ملیں تعمیر ہونے لگیں۔ برطانیہ اور سویڈن سے سخت مقابلے کے سبب روسی دھاتوں کی برآمد بھی کم ہو گئی۔ اس لئے روسی صنعتی حلقوں کی نظریں ایک بیرونی منڈی کی طرح وسطی ایشیا پر پڑیں۔ وہ اس پر قبضہ کرنے کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ چنانچہ سیمیونوف نے حکومت سے تجویز کی کہ روسی کپڑے، ریشم اور لوہے کے سامان کے لئے وسطی ایشیا کی وسیع منڈی حاصل کی جائے۔

زار نکولائی نے ۱۸۳۶ء میں ہی ایک خاص کمیٹی مقرر کر دی تھی جس کا کام روس کے ایشیا کے ساتھ تعلقات کے بارے میں مشوروں کا مطالعہ کرنا تھا۔ اس کے ارکان میں امور خارجہ، دفاع اور مالیات کے وزراء اور مختلف سرکاری محکموں کے سربراہ تھے۔ اسی سال ویریگین نے خانوں کی قلمروؤں کے ساتھ قریبی معاشی تعلقات قائم کرنے کا مطالبہ کیا جہاں یورپی طاقتوں سے روس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ روس کے تجارتی رسالوں اور صنعتی حلقوں میں وسطی ایشیا سے روس کی تجارت کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا۔ دانیلیفسکی نے جس نے ۱۸۴۲ء میں خیوا کا دورہ کیا تھا اس تجویز کی حمایت کی کہ وسطی ایشیا کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھائے جائیں۔ ۱۸۴۹ء میں مشہور روسی جغرافیہ داں اور سیاح چیخاچوف نے روسی سلطنت کی توجہ وسطی ایشیا کے ساتھ تجارت پر مرکوز کرائی۔ اس نے بتایا کہ اس علاقے میں اینگلو امریکی مقابلہ نہیں ہے اس لئے وہاں روسی تجارت بڑھانے کے بہت امکانات ہیں۔ اس کے ہم عصر خانیکوف نے اس خیال کی تائید کی۔

نیبولسین نے وسطی ایشیا کے ساتھ روسی سلطنت کے تجارتی تعلقات بڑھانے کا پروگرام مرتب کیا۔ اسی روسی جغرافیائی انجمن نے ۱۸۵۰ء میں نیبولسین کو اورین برگ اور کیسپین علاقوں کا سفر کرنے کے لئے بھیجا تاکہ وہ وہاں جاکر تجارتی معلومات حاصل کرے۔ انجمن کے ایک رہنما موراویوف کے نام اپنے ایک خط میں اس نے وسطی ایشیا میں سرگرم پالیسی پر زور دیا۔ ساتھ ہی اس نے وسطی ایشیا میں سرگرم پالیسی پر زور دیا۔ ساتھ ہی اس نے مشورہ دیا کہ

آمودریا اور سیر دریا کا رخ بحیرہ کیسپین کی جانب بدل دیا جائے تاکہ وسطی ایشیا سے تجارت کے امکانات بڑھ جائیں۔ اس زمانے میں یہ تجویز غیر عملی تھی لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وسطی ایشیا کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھانے پر بڑی توجہ دی جا رہی تھی۔

اگرچہ انیس صدی کی چھٹی دھائی میں وسطی ایشیا کے ساتھ روس کی بیرونی تجارت بہت قلیل تھی (۵،۲ فیصدی سے کچھ ہی زیادہ لیکن مستقبل میں اس ترقی کے امکانات روشن تھے۔

وسطی ایشیا پر برطانیہ کی حریص نظریں

وسطی ایشیا سلطنت برطانیہ کے لئے نہ صرف معاشی توسیع بلکہ فوجی اور سیاسی مقاصد کے لئے بھی اہم تھا۔ اپنے تیار شدہ سامان کے لئے بڑی منڈیاں حاصل کرنے اور خام مال آسانی سے پانے کے لئے برطانوی سامراجی اپنی نوآبادیاتی مقبوضات کو بڑھانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول میں مشرقی ملکوں کی پسماندگی مددگار ثابت ہوئی۔ اسی مقصد کے پیش نظر برطانیہ نے ایشیائی ملکوں کے خلاف کئی نوآبادیاتی جنگیں لڑیں۔

وسطی ایشیا کی جانب برطانیہ کے توسیع پرست مقاصد ۱۸۱۲ء میں ہی ظاہر ہو گئے تھے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک بڑے افسر ولیم مور کروفٹ نے خاص تربیت یافتہ جاسوسوں کا ایک گروہ وسطی ایشیا بھیجا تھا۔ میر عزت اللہ نے اس علاقے کا طویل سفر کیا اور خفیہ طور پر معلومات جمع کیں۔ اس نے اٹک سے کشمیر، تبت، یارقند، کاشغر، قوقند، سمرقند بخارا، بلخ، خولما، بامیان اور کابل تک بادیہ پیمائی کی۔ اس نے بخارا سلطنت کی ہر ممکن تفصیل حاصل کی۔ یہاں تک کہ وہاں حکام کی تعداد کتنی ہے وہ جنوبی ترکستان میں خولما کے حکمراں کلچ علی بیگ سے بھی ملا اور برطانیہ کی حمایت میں پروپیگنڈہ کیا۔ اس طرح وسطی ایشیا میں برطانوی نوآبادیاتی توسیع پرستی کے لئے احتیاط سے زمین ہموار کی گئی۔ اس کے بعد ۲۵ - ۱۸۱۹ء میں کی فوج کے لئے گھوڑے خریدنے کے بہانے سے مور کروفٹ اور جورج ٹرے بیک نے بخارا کا مزید مطالعہ کیا۔

اسی صدی کی چوتھی دہائی میں ایک برطانوی مہم کو بخارا روانہ کیا گیا جس کا سربراہ

جاسوسی افسر الکساندر برنس تھا۔ اس نے وسطی ایشیا میں برطانیہ کے قزاقانہ منصوبوں کے لئے فوجی اور معاشرتی سیاسی معلومات اکٹھا کیں۔ اس مہم میں ایک کشمیری پنڈت موہن لال بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ حقیقت کہ برنس کی مہم کا خاص مقصد سیاسی اور فوجی مخبری تھا موہن لال کی تصنیف "سفر" سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے لکھا کہ بخارا کے ساتھ برطانیہ کے "تجارتی یا سیاسی" تعلقات قائم ہونا بہت آسان ہے۔ اس نے زور دیا کہ اس میں "وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے" کیونکہ اس وقت ہمارے (برطانیہ کے) ارادوں کا کسی طاقت کو علم نہیں ہے۔" موہن لال نے بخارا کی فوجی قوت کے بارے میں تفصیل سے معلومات حاصل کیں۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ بخارا میں مورکرد فٹ کا مشن غیر سرکاری تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا بخارا کا سفر حکومت ہند نے بددلی سے تسلیم کیا اور گورنر جنرل نے اس کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اپنے تمام سفر کے دوران مورکرد فٹ کو تنخواہ ملتی رہی اور اس کے کاغذات حکومت بنگال کی ملکیت سمجھے گئے جب قوقند کے سردار نے یہ دعویٰ کیا کہ "برطانوی حکومت نے ہندوستان اور ترکستان کے درمیان ہر اہم شہر میں جاسوسوں کے اڈے قائم کر رکھے ہیں اور کئی افراد کے نام گنائے جنہیں وہ ان کے کام کی بنیاد پر جانتا تھا" تو مورکرو فٹ نے اس کی تردید نہیں کی اور کہا کہ "ان کے قیام کی وجہ شاہ فرانس کے ارادوں کا جواب دینا ہے جس کا اعلان کر رکھا ہے وہ برطانوی ہندستان پر حملہ کرے گا۔ اسی لئے حکومت کو اس کی آمد کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے یہ کرنا پڑا" یہ حقیقت کہ گھوڑوں کی خریداری محض پردہ تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ افغان سرحدی کمیشن نے بہت کم گھوڑے خریدے اور کرنل ررج وے نے جسے ہندستان کی حکومت نے "اعلیٰ نسل کے ترکمانی گھوڑوں کی خرید کے لئے ۳۰۰ پونڈ خرچ کرنے کا اختیار دیا تھا تاکہ ان کی نسلی افزائش کی جائے" اپنے حساب میں ایک پینی بھی درج نہیں کرائی۔ گھوڑوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔

۱۸۳۸ء میں ہرات برطانوی جاسوسی اور تخریبی کارروائیوں کا مرکز بن گیا۔ اس کی رہنمائی میجر ٹوڈ کیا کرتا تھا۔ کرنل اسٹوڈارٹ کو تہران میں برطانوی قونصل خانے سے بخارا بھیجا گیا دوسرے جاسوس ہرات سے خیوا اور قوقند روانہ کئے گئے۔ ۱۸۳۹ء میں میجر ٹوڈ نے ایک ملا حسین کو خیوا بھیجا جس نے خان کو بندوق پیش کی۔ اس کے فوراً بعد کپتان جیمس ایبٹ وہاں گیا۔ یکم مئی ۱۸۴۰ء

کو جب وہ نووا۔ الکسانڈرو فسک کے نزدیک سڑکوں اور قلعوں کے نقشے مرتب کر رہا تھا تو روسیوں کے ہاتھ پڑ گیا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے اپنے آپ کو خان کا نمائندہ بتایا اور ثبوت میں ایک جعلی دستاویز بھی پیش کی۔ پولیس اسے اورین برگ لے آئی۔ وہ اسے سینٹ پیٹرسبرگ لایا گیا اور پھر لندن بھیج دیا گیا۔ جب ایبٹ کا مشن ناکام ہو گیا، یعنی روس اور خیوا میں تصادم نہیں ہوا تو پھر رچ مونڈ شیکسپیئر کو تخریبی مہم پر وہاں روانہ کیا۔ سوویت مورخ خالفین کا خیال ہے شیکسپیئر کے کاغذات سے جو سوویت مرکزی ریاستی محافظ خانے میں موجود ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نئی "دفاعی" تدابیر کے منصوبے کا مقصد "ہندستان کا تحفظ" تھا۔ اور یہ اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے برطانیہ کا حسب معمول بہانہ ہوا کرتا تھا۔ ان اقدام کا حقیقی مقصد جنوبی ترکستان کی نیم آزاد ریاستوں پر قبضہ کرنا تھا۔ خیوا سے روس میں داخل ہونے کا شیکسپیئر نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ روسی غلاموں کے ہمراہ آ رہا تھا۔ ستمبر ۱۸۴۰ء میں وہ اورین برگ پہنچا جہاں اسے حراست میں لے لیا گیا۔ بعد میں اسے بھی لندن روانہ کر دیا گیا۔

راولن سن کے مطابق ایبٹ نے جسے ہرات میں برطانوی سفیر میجر ٹوڈ نے خیوا بھیجا تھا یہ تجویز کی کہ ان علاقوں سے روسیوں کا مستقل صفایا کر دینا چاہیئے اور ساتھ ہی انگلستان کے ساتھ دفاعی اور حملہ آورانہ اتحاد کا مشورہ دیا جو مشترکہ دشمن کو ختم کرنے کا انعام ہو۔ راولن سن لکھتا ہے کہ ایبٹ ایسا کرنے میں ہدایات کی حدود سے باہر نکل گیا۔ اس کا اشارہ روسی غلاموں کو آزادی دلانے سے ہے۔ وام بری کے خیال میں برطانوی منصوبہ یہ تھا کہ خانوں کی تینوں قلمروؤں کے ساتھ مل کر روس کے خلاف دفاعی اور حملہ آور اتحاد قائم کیا جائے۔ وہ اسٹوڈارٹ اور کونلی کے انتخاب پر اعتراض کرتا ہے جو یہ مقصد حاصل کرنے میں ناکام ہوئے۔

راولن سن لکھتا ہے کہ برطانیہ چوتھی دہائی کے آخر میں کوہ ہندوکش کے شمالی ڈھلان پر بیغان پر قبضہ کرنے اور پھر بخارا کی جانب پیشقدمی کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن بہادر افغانوں کی سخت مخالفت کی وجہ سے یہ منصوبہ پورا نہیں ہوا۔ جنگ کریمیا کے زمانے میں برطانیہ نے پھر جارجیا کے ذریعہ وسطی ایشیا میں فوج بھیجنے کا منصوبہ تیار کیا۔ لیکن انھیں فرانس کا تعاون حاصل نہ ہو سکا اس لئے انھیں یہ منصوبہ ملتوی کرنا پڑا۔

پانچویں دہائی میں برطانیہ اپنے سوتی کپڑے کا خرچ سے کم قیمت پر بخارا میں ڈھیر لگانے لگا

وہ دو جانب سے روسی تجارت کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ ایک بحیرہ اسود کی جانب سے، دوسرے ہندستان کی طرف سے بیرونی تجارت کے محکمے کی ایک رپورٹ تصدیق کرتی ہے کہ ۵۷-۱۸۴۵ء میں بخارا میں روسی سوتی کپڑے کی درآمد بہت کم ہوگئی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں کلوچارف نے شکایت کی کہ اس سال وسطی ایشیا کی قلمروؤں میں برطانوی سامان کی غیر معمولی درآمد کی وجہ سے قوقند میں روسی کپڑے کے دام گر گئے ہیں۔

وسطی ایشیا پر تسلط حاصل کرنے میں روس کے خلاف اپنی جدوجہد میں برطانیہ نے ترکی کو بطور حلیف استعمال کیا۔ اس کے ایما پر ترکی کے مشن خانوں کی قلمروؤں میں پہنچے اور روس کے خلاف انھیں بھڑکانے کی کوشش کی۔ جنگ کرائمیا میں ترک جاسوس خاص کر سرگرم ہو گئے۔ خانوں کی قلمروؤں کو اپنے محور میں لانے میں برطانوی منصوبے اس لئے ناکام رہے کہ ان کے روس سے روابط مضبوط تھے۔ بخارا برطانیہ کے دوغلے رول کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا تھا جو جنوبی ترکستان میں آمو دریا کے بائیں کنارے سے خانوں کی قلمروؤں پر حملہ کرنے کے لئے افغانوں کا دل بڑھا رہا تھا۔

کچھ عرصے تک برطانیہ وسطی ایشیا کی جانب اپنی رسائی میں محتاط رہا کیونکہ ہندستان میں ۱۸۵۷ء کے غدر نے اس کے لئے کافی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ لیکن ایک بار اسے کچلنے کے بعد برطانوی بورژوازی پھر وسطی ایشیا میں سازشوں کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ ۱۸۵۸ء میں ایک پارلیمانی کمیٹی مقرر کی گئی جس کا کام وسطی ایشیا سے تجارتی تعلقات بڑھانے کا مطالعہ تھا۔

ساتویں دہائی کے آخر میں برطانیہ نے وسطی ایشیا میں پھر اپنی جاسوسی اور تخریبی کارروائیاں تیز کر دیں۔ اب اس کا سرغنہ "انجمن عظیم مساحتی پیمائش" کا سپرنٹنڈنٹ کرنل واکر تھا۔ اس کے تحت کام کرنے والے خاص تربیت یافتہ مقامی لوگ تھے۔ ان میں پنڈت من پھول، فیض محمد، بھائی دیوان سنگھ اور غلام ربانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر کا روزنامچہ جس کا ترجمہ پٹیالے میں پنجاب کے ریاستی محافظ خانے میں موجود ہے بڑی ہی دلچسپ دستاویز ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ غلام ربانی ۱۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پشاور سے روانہ ہوا اور ۱۸۶۷ء میں قوقند روانہ ہو گیا۔ وہاں ایک ماہ رہا بخارا میں اس وقت "دربار بخارا کے ارکان سے جان پہچان کی" اور اس کے

متعلق ایک رپورٹ تیار کی ۔ اس رپورٹ میں اس نے نواحی علاقوں، شہر کے رقبے، بارہ پھاٹکوں والی دیواروں کی چوڑائی کا تفصیلی حال بتایا ہے اور یہ رائے دیتا ہے کہ "دیوار دفاع کے قابل نہیں" ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ "فوج میں ضبط نہیں ہے" اور اس کے پاس ۲۰۰ توپیں ہیں جو بے کار ہیں۔ چراغ چی، شہر سبز (بخارا میں) اور جزاک کے نزدیک روسی دفاع بندی کے فوجی سامان اور دفاعی قوت کے متعلق بھی اس نے معلومات بھیجیں۔ ملا عیوض محمد، مرزا بابا کتاب دار اور خبر نویس محمد نیاز کی مدد سے خان خدایار خان کے دربار میں اس کی باریابی ہوئی۔ قوقند سے تاشقند تک غلام ربانی نے تین سفر کئے جن میں اس نے بڑی صحت کے ساتھ دفاع بندیوں وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ اس نے ایسی تفصیلات بھی جمع کیں جیسے دریاؤں کے پانی کا رنگ، چٹانوں اور دھاتوں کی نوعیت۔ جب روسیوں نے تاشقند پر قبضہ کیا اور مقامی تاجر خائف ہو گئے تو ربانی نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے یہ پیش کش کی کہ وہ ان کی جان و مال کی ضمانت کی خاطر روسی جنرل چیرنیائیف سے ملے گا۔ قوقند کے تاجروں کو اس "انسان دوست" خدمت کی رضاکارانہ پیش کش کے پس پشت بھی "گھوڑوں کی خرید" اور "روسی غلاموں کی رہائی" کی طرح سیاسی مقاصد تھے۔ غلام ربانی نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے: "کون ایسا سفر (تاشقند کا) کرنے اور زندگی کو خطرے میں ڈالنے کی ہمت کر سکتا ہے، سوائے ایسے مصنف کے جس کا خاص مقصد تھا اور جس نے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا۔ یہ مقصد ہم پر اس وقت واضح ہوجاتا ہے جب ہم غلام ربانی کو جنرل چیرنیائیف کی تاشقند کے مضافات میں چرچک دریا پر نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

جب غلام ربانی ہندستان واپس لوٹا تو اس کے ہمراہ دریا بخارا کا ایک وکیل تھا۔ بلخ میں وکیل کے ساتھ اس کی ملاقات فیض محمد (دوسرا برطانوی مخبر) کے ذریعہ سے ہوئی۔ پھر وہ بھائی دیوان سنگھ کی ہدایت پر بدخشاں روانہ ہوگیا۔ وکیل نے تنہا کابل کا سفر کیا۔ بعد میں ربانی بھی وہیں پہنچ گیا۔

وسطی ایشیا میں برطانیہ کے جارحانہ منصوبوں نے روس کے حکمراں حلقوں میں تردد پیدا کیا۔

سرمایہ داری کے ارتقا کی ضروریات کی وجہ سے انھوں نے وسطی ایشیا کو روس میں شامل کرنے میں جلدی کی۔ اس طرح برطانیہ کی چالوں کا توڑ کر دیا گیا۔

زار شاہی اور وسطی ایشیا

روس کی زار شاہی نے جب وسط ایشیا کو انیسویں صدی کے وسط میں فتح کیا تو اس وقت وسطی ایشیا کی ان مملکتوں اور ریاستوں کا ارتقا رک چکا تھا اور یہاں کے جاگیرداری نظام میں ٹھہراؤ آگیا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کی زندگیاں مصائب اور زبردست استحصال کا شکار تھیں یہاں کی صورت حال یہ تھی کہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں توقند کی سلطنت کو زار نے اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا اور بخارا اور خیوا جو پہلے ہی زار کے ماتحت تھیں کو باقاعدہ طور پر اپنا باجگزار بنا لیا گیا۔ اس پورے علاقے کا انتظامی ڈھانچہ بھی بدل دیا گیا وسطی ایشیا اور جنوبی قزاخستان کے علاقے کو ملا کر ایک واحد صوبہ بنا دیا گیا اور اس کا نام ترکستان رکھا گیا اور اس ترکستان کو باقاعدہ ایک روسی گورنر جنرل کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس وقت کی مردم شماری یعنی ۱۹۱۶ کے مطابق روسی ترکستان کی آبادی ۴۷ لاکھ ۴۶ ہزار ایک سو تھی۔ بخارا کی سلطنت جو باجگزار ہونے کے باوجود اپنے امیر کے ماتحت تھی۔ اس کی آبادی ۲۲ لاکھ ۳۶ ہزار ۴ سو ۳۷ تھی اسی طرح خیوا جو اپنے خان کے ماتحت تھی کی آبادی ۶ لاکھ ۴۰ ہزار تھی۔

یہ یاد رہنا چاہیئے کہ یہ تمام علاقے ترکستان ہو یا بخارا کی قلمرو یا خیوا یہ ایک قومی مملکت نہ تھیں بلکہ ہر مملکت میں کئی ایک قومیں مثلاً ازبک، تاجک، ترکمان، قزاخ، قرغیزی وغیرہ رہتے تھے اور ان میں آپس میں تضادات بھی تھے اور یکجہتی بھی۔ روس کے تسلط اور حکمرانی کی

صورت حال بعض حالات میں برصغیر کی صورت حال سے ملتی جلتی ہے اور جب بھی سامراجی تسلط شروع ہوتا ہے تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک سامراج کی آمد سے ٹھہری ہوئی زندگی میں ہلچل شروع ہوتی ہے اور سامراج اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اپنی نوآبادیوں میں تبدیلی لاتا ہے اور یہ تبدیلیاں بالآخر نئے طبقوں کو جنم دیتی ہیں برصغیر میں برطانوی تسلط کے بارے میں مارکس نے لکھا تھا۔

"یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں سماجی انقلاب کے اسباب پیدا کرنے میں انگلستان کے اغراض حد درجہ ذلیل مصلحتوں پر مبنی تھے اور ان کو پورا کرنے میں اس نے انتہائی حماقت سے کام لیا لیکن سوال یہ نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ایشیا کی سماجی حالت میں بنیادی انقلاب بپا کئے بغیر انسانیت اپنی منزل تک پہنچ بھی سکے گی یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر انگلستان کے جرائم کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ اس انقلاب کے بپا کرنے میں تاریخ کا غیر شعوری آلہ تھا"

صرف یہی نہیں بلکہ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں سرمایہ کاری نظام اور برژوا طبقے کے رول کے بارے میں واضح طور پر کہا گیا ہے۔۔۔ امریکہ کی دریافت اور افریقہ کے گرد جہازرانی شروع ہونے کی وجہ سے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کے لئے نئی راہیں کھل گئیں۔ ایسٹ انڈیا اور چین کی ہنڈیوں امریکہ کی نوآبادکاری، نوآبادیوں کے ساتھ تجارت ذرائع تبادلہ اور عام طور سے اجناس کی کثرت نے تجارت، جہازرانی اور صنعت کو ایسی ترغیب دی جو کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، اور اس کی وجہ سے گرتے ہوئے جاگیردار سماج میں انقلابی عناصر کو تیزی سے بڑھنے کا موقع ملا۔

صنعت کا سابق جاگیردارانہ نظام یا شاپوں کا نظام، اب نئی منڈیوں کی بڑھتی ہوئی مانگوں کے لئے ناکافی ہو گیا۔ کارخانہ دار نظام نے اس کی جگہ لے لی۔ استاد کو درمیانی کارخانہ دار پرت نے نکال باہر کیا۔ ہر کارخانے کی اندرونی تقسیم محنت کے مقابلے میں اہل حرفہ کی مختلف جماعتوں کی باہمی تقسیم محنت ختم ہو گئی۔

اس اثنا میں منڈیاں برابر پھیلتی رہیں، مانگ برابر بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ کارخانہ داری بھی اب

کافی نہ ہو سکی۔ تب بھاپ اور مشین نے صنعتی پیداوار میں انقلاب برپا کر دیا۔ کارخانہ داری کی جگہ دیو ہیکل جدید صنعت نے اور درمیانی کارخانہ دار پرت کی جگہ صنعتی کروڑپتیوں نے، بڑی بڑی صنعتی فوجوں کے لیڈر، جدید بورژوا طبقے نے لے لی۔

جدید صنعت نے عالمگیر منڈی قائم کی، جس کے لئے امریکہ کی دریافت سے راہ کھل چکی تھی۔ اس منڈی نے تجارت، جہاز رانی اور خشکی کے وسائل آمد و رفت کو زبردست ترقی دی۔ اس ترقی سے صنعت کے بڑھنے اور مدد ملی اور جیسے جیسے صنعت، تجارت، جہاز رانی ہوئی اسی مناسبت سے بورژوا طبقے کی نشو و نما ہوئی۔ اس نے اپنا سرمایہ بڑھایا اور ہر اس طبقے کو دھکیل کر پیچھے کر دیا جو عہد وسطی سے چلا آرہا تھا۔۔۔ اور آخری صورت میں مقابلہ کرنے والوں کی کشمکش جنگوں (خصوصاً بحری) کی مدد سے طے ہونے لگی۔ سب سے زبردست بحری طاقت برطانیہ کو تجارت اور چھوٹی کارخانے داری میں بالادستی حاصل ہو گئی۔ یہاں ایک ملک میں ہی ان کا ارتکاز ہو چکا ہے۔

چھوٹی کارخانے داری کو مستقل طور پر ہر طرح سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اندرونی منڈی میں حفاظتی محاصل سے، نو آبادیاتی منڈیوں میں اجارے داریوں کے ذریعہ اور بیرونی منڈی امتیازی محاصل کے ذریعہ۔ دیسی خام اشیا کی مصنوعات کی سرپرستی کی گئی (برطانیہ میں اون اور کتان اور فرانس میں ریشم کی) غیر ممالک کو دیسی خام اشیاء کی برآمد کی ممانعت کی گئی (برطانیہ میں اون) اور درآمدی خام اشیا کی تیاری کو نظر انداز کیا گیا یا دبایا گیا (برطانیہ میں روئی) بحری تجارت اور نو آبادیاتی طاقت میں بالادستی رکھنے والی قوم نے، چھوٹے کارخانے داری کی ترقی میں اپنے کو قدرتی طور پر کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے مضبوط کر لیا۔

سو یہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ ہمیں وسطی ایشیا کے لئے بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ روس کے تسلط نے وسطی ایشیا کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں تلاطم بپا کیا۔ زندگی کے نئے در وا کئے اور یہاں کے لوگوں کو بدرجہا کی ترقی یافتہ ثقافت سے روشناس کرایا۔ کیونکہ انگریزی تسلط اور روسی تسلط میں ایک نمایاں فرق بھی ہے، انگریز سمندر پار سے آئے تھے ان کا اس سے پہلے ہندوستان سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن روسی وسط ایشیا کے قریب ترین ہمسائے تھے۔ یہاں ان کا آنا جانا تھا

اور جب باقاعدگی سے یہ علاقے ان کے تسلط میں آ گئے تو ان علاقوں میں صرف روسی افسر اور اہلکار ہی نہیں آئے بلکہ لاتعداد عام کسان اور مزدور بھی آئے جو یہاں آ کے رچ بس گئے اور اس طرح سے ان علاقوں کے باشندوں کو روسی کلچر سے جو واقفیت ہوئی وہ زبردستی اور افسرانہ شان سے بنی ہوئی بلکہ اپنے برابر کے لوگوں سے بھی ہوئی گو نوآبادیاتی دور ہمیشہ ثقافتی پسماندگی کا دور ہوتا ہے لیکن اس پسماندگی کے باوجود جگہ جگہ علم کے چراغ روشن ہونے لگے ہیں اور دیکھا دیکھی لوگ نئی راہوں پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لباس تبدیل ہونا شروع ہوتا ہے۔ زبان متاثر ہونے لگتی ہے، رسم و رواج بدلنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہی عمل یہاں شروع ہوا۔ روس کی آمد تک ان خطوں میں صرف مذہبی مدارس ہوتے تھے لیکن روسیوں کی آمد کے بعد غیر مذہبی اسکولوں کی ابتدا ہوئی شروع ہوئی چنانچہ پہلا روسی اسکول سمرقند میں ۱۸۷۰ میں قائم کیا گیا۔ اس وقت کا گورنر جنرل کاؤف مان تھا وہ لارڈ میکالے کی طرح یہ یقین رکھتا تھا کہ روسی ذریعہ تعلیم ہی ان لوگوں کی ترقی کا موجب بن سکتا ہے چنانچہ اس سکول میں علمی مضامین کی درس و تدریس کا پہلی بار تجربہ کیا گیا لیکن ان سکولوں کا تجربہ ناکام رہا لیکن اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان میں اسلامی تعلیمات کو یک قلم منسوخ کر کے عیسائیت اور بائیبل پڑھائی جانے لگی۔ اس سے مقامی آبادی مشتعل ہو گئی، اس کے کچھ سالوں کے بعد مقامی آبادی کی اپنی ضرورتوں نے نئے طرز کے روسی سکولوں کے لئے زمین ہموار کر دی۔ چنانچہ اب خود مقامی متمول لوگوں نے اس سمت قدم اٹھایا ۱۸۸۴ میں ایک صاحب حیثیت ازبک سعید غنی نے ایک اسکول تاشقند میں کھولا۔ ۱۹۱۱ء تک ایسے اسکولوں کی تعداد ۱۰۵ تک پہنچ گئی ان سکولوں کا نصاب دو حصوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ روسی زبان اور حساب وغیرہ جنہیں روسی استاد پڑھاتا تھا اور اسلامی تعلیمات جن کی تدریس مولوی کے ذمے تھی۔

زار شاہی کے دور میں ترکستان، بخارا اور خیوا بالکل زرعی علاقے تھے اور اس کے اعداد و شمار کے مطابق اور یہ اعداد و شمار پہلی جنگ عظیم سے پہلے ۱۹۱۳ء میں مرتب کئے گئے تھے چنانچہ اس کے مطابق یہاں کی کل آبادی کا صرف انیس فیصد حصہ شہروں اور مدنی آبادیوں میں رہتا تھا۔ ۱۹۱۷ء کی کل روسی زرعی مردم شماری کے مطابق ترکستان میں زرعی پیشوں میں کام کرنے والوں

کی تعداد ۵۳ لاکھ ۵، ۷ ہزار ۵ سو ۳۸ تھی جن میں سے ۳۰ لاکھ ۸۱ ہزار ۸ سو ۳، ۷ آباد لوگ زراعت میں کام کرتے تھے اور باقی خانہ بدوش گلّے بان تھے۔ ترکستان میں جاگیردارانہ معاشرتی تعلقات غالب تھے اور اس سے بھی زیادہ بخارا اور خیوا میں۔ ترکستان کے فرغانہ، قرغیز علاقے اور بخارا اور خیوا کے ترکمان خطے میں خانہ بدوش لوگوں میں ابھی تک سر قبیلی طرز زندگی کی بہت سی باقیات موجود تھیں۔

لینن کے الفاظ میں ترکستان براہ راست نوآبادی تھا۔ اگرچہ بخارا اور خیوا کی قلمرو میں "آزاد" تھیں لیکن ان کی حالت ترکستان سے مختلف نہیں تھی۔ انہیں بھی نوآبادیات کی طرح، کہا جا سکتا تھا۔ وسطی ایشیا میں سرمایہ دارانہ ارتقا کا عمل بہت آہستہ اور غیر متوازن رہا کیونکہ زارشاہی اور بخارا اور خیوا کے جاگیردار حکمراں جان بوجھ کر جاگیردارانہ اور سر قبیلی تعلقات جاری رکھنا چاہتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ زار کی حکومت نے ترکستان میں کچھ زرعی اصلاحات کیں جنھوں نے وسطی ایشیا کے دیہات میں سرمایہ دارانہ تعلقات کے پنپنے کے لئے زمین ہموار کی لیکن ان اصلاحات نے محنت کش کسانوں کو جاگیرداری کی محکومی اور غلامی سے نجات نہیں دلائی۔ بڑے بڑے زمیندار از دولش چکوں (کسان جو بٹائی کی بنیاد پر دوسروں کی زمین پر کاشت کرتے تھے) کی لوٹ کھسوٹ کرتے تھے۔ اس کی سب سے عام شکل کا نام چاری کاری تھا جو ایک چوتھائی حصّے سے ماخوذ ہے۔ فصل کا اتنا ہی حصہ کسان کو ملتا تھا۔ چونکہ کسانوں کی اکثریت کے پاس اپنے مویشی، زرعی آلات اور بیج وغیرہ نہیں ہوتے تھے اس لئے وہ جاگیرداروں اور سودخوروں کے چنگل میں پھنسے رہتے تھے۔

نوآبادیاتی دور میں آبپاشی کا انتظام بھی بہت محدود تھا۔ پوری وسطی ایشیا میں ۱۹۱۰ء میں جتنی زمین پر آبپاشی کی جاتی تھی اس کا رقبہ صرف تقریباً ۴، ۷ لاکھ ۵۸ ہزار دیسیاتین (ایک دیسیاتینا ۲،۷ ایکڑ) تھا، یعنی کل قابل کاشت زمین کا محض ۲،۶ فیصدی۔ ترکستان کے پانچ صوبوں میں آبیار زمین تقریباً ۲۸ لاکھ ۸ ہزار اور بخارا میں ۱۶ لاکھ دیسیاتین پر مشتمل تھی۔ ماوراے کیسپین کے صوبہ اور تاشقند کے جنوب مغربی بیابانی استیپی میدانوں میں نہروں کی کچھ تعمیر ہوئی۔ نوآبادیاتی عہد میں آبپاشی کے میدان میں حاصلات کے متعلق لارڈ پیرس

لکھتا ہے۔

"نصف صدی میں روسی وسطی ایشیا میں آبپاشی کے صرف منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ ایک پیاسے استیپی میدانوں میں اور دوسرا مرغاب پر۔ یہ دونوں ان کے ڈیزائن سازوں کی امیدوں پر پورے نہیں اترے یا ان لوگوں کی توقعات پر جن کا خیال تھا کہ تمام علاقے میں کامیابیاں حاصل ہوں گی۔"

گورنر جنرل کاؤفمان کے احکامات کے مطابق پیاسے استیپی میدانوں میں نہریں تعمیر کرنے کا ایک وسیع منصوبہ تھا۔ یہ ۱۸۷۲ء میں شروع ہوا لیکن ۱۸۷۹ء میں ترک کر دیا گیا۔ مقامی لوگ اسے تون گوز آریک یعنی "سور کی نہر" کہا کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں کریودشین نے ایک تفصیلی منصوبہ پیش کیا جس کے مطابق ۱۵ لاکھ روسی کسان نئی آبیار زمینوں پر بسائے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ منصوبہ بھی کاغذ تک محدود رہا۔

ترکستان میں زراعت اور مویشیوں کی نسل افزائش دونوں پسماندہ تھیں۔ خیوا اور بخارا میں بھی ان کا حال لگ بھگ یہی تھا۔ جو آلات کاشت کاری میں استعمال کئے جاتے تھے وہ اتنے ہی دقیانوسی تھے کہ محنت کی کارکردگی اور زمین کی بار آوری بے حد کم ہوتی تھی۔ کسانوں کو زرعی سائنس کا بالکل علم نہ تھا اور نہ وہ یہ جانتے تھے کہ مویشیوں کا علاج کیا شے ہے۔ زمین، پانی اور مویشی زمینداروں اور بڑے کسانوں کے قبضے میں تھے۔ ترکستان تھے۔ خیوا میں خاں اور دوسرے جاگیرداروں کے ذاتی قبضے میں کل سنری اور زرخیز زمین کا دو تہائی حصہ تھا، ریاست اوقاف کی ملکیت میں تقریباً ۱۵ فیصدی اور کسانوں کے پاس صرف ۱۰ فیصدی۔ بخارا میں کل قابل کاشت زمین کا ۵۷ فیصدی حصہ جاگیرداروں اور ۲۴ فیصدی اوقاف کی ملکیت تھا۔ کسان ٹیکسوں کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے۔ خیوا میں کسانوں سے ۲۵ قسم کے مختلف ٹیکس وصول کئے جاتے تھے اور بخارا میں ان کی تعداد ۵۵ تک پہنچتی تھی۔ نہریں تعمیر کرنے یا ان کی مرمت کے لئے کسانوں سے بیگار لی جاتی تھی۔ زمیندار بھی اپنے ذاتی کاموں کے لئے کسانوں سے بیگار لیتا تھا۔ انگریز مصنف وہیلر نے جرمن سیاح رکمیر رکمیرس اور بارتولد کی تصانیف سے بے جوڑ حوالے لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس زمانے میں بخارا بڑا ہی خوش حال

علاقہ تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ برسبیل تذکرہ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خود بارتولد نے امریکی سیاح شولر کی بخارا کے امیر مظفر کے بارے میں رائے نقل کی ہے۔ جس سے لوگ "غیر مصنف اور ظالم ہونے کے سبب" نفرت کرتے تھے۔ بارتولد لکھتا ہے کہ اس کی حکمرانی میں "استحصال کا ایک ایسا نظام تھا جس نے لوگوں کو تباہ حال کر رکھا تھا"۔ اس نے لکھا ہے کہ امیر کی تعریف میں زمین اور آسمان کے جو قلابے ملائے جاتے تھے ان پر روسی اخبارات نے بجا طور پر اعتراض کیا۔

جب وسطی ایشیا کا الحاق ہو چکا تو وہ سامراجی صنعتوں کے لئے خام سامان فراہم کرنے کا اڈہ بن گیا۔ زار کی حکومت نے یہاں کپاس کی کاشت پر خاص توجہ دی اور گیہوں اور دوسری زرعی پیداوار کی جگہ اس کی ہمت افزائی کی گئی۔ ۱۹۱۲ء میں ترکستان کے بندوبست اراضی کے مہتمم نے لکھا: "ترکستان میں اگر ایک سیر بھی گیہوں پیدا ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، اور ہر سیر کپاس کا امریکی کپاس سے۔ اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ اس سرزمین میں گیہوں کی درآمد کی جائے اور آبیار زمین کو کپاس کی کاشت کے لئے چھوڑ دیا جائے"۔ حکام نے باہر سے درآمد کی ہوئی کپاس پر بڑی چنگی لگا کر اندرونی منڈی میں زیادہ قیمتیں حاصل کیں۔ اور زمین پر کپاس اور اناج کی کاشت پر لگان برابر کر کے کپاس کی کاشت کو بڑھانے کی ترغیب دی گئی۔ اس طرح کپاس زراعت کی خاص پیداوار ہو گئی۔ اس کے علاوہ انتظامیہ نے چند زرعی ٹیکنیکی اقدام کر کے کپاس کی کاشت کو ترقی دینے میں مدد کی۔ ۱۸۹۲ء میں ترکستان نے روس کو امریکی قسم کی کپاس ۳۰ لاکھ پوڈ (ایک پوڈ لگ بھگ ساڑھے سولہ کلو گرام کے برابر ہوتا ہے) کی مقدار میں برآمد کی۔ ۱۸۸۰ء میں اگر کپاس کی برآمد ۸ لاکھ ۷۳ ہزار پوڈ تھی تو ۱۹۰۰ء میں یہ ۴۹ لاکھ ۶۰ ہزار اور ۱۹۱۳ء میں ایک کروڑ ۳۶ لاکھ، ۹۷ ہزار پوڈ ہو گئی۔ ازبیکوں کی سرزمین وسطی ایشیا میں کپاس کے خطے کا قلب تھی، اگرچہ قرغیزیہ کے جنوب اور موجودہ ترکمانیہ اور تاجکستان کے کچھ حصوں میں بھی اس کی کاشت کی جاتی تھی۔

لیکن کپاس کی کاشت کی ترقی سے دہقانوں کے حالات زندگی نہیں بدلے، وہ پہلے کی طرح غربت کا شکار رہے۔ جب بیرونی سرمایہ نے مقامی فرموں کے ذریعہ کپاس کی کاشت میں حصہ لینا شروع کیا تو ایک نیا لیٹرا پیدا ہو گیا۔ یہ تھا کپاس کا خریدار جو

صنعت کاروں اور کپاس پیدا کرنے والوں میں درمیانی آدمی کا رول ادا کرتا تھا اور کسانوں کا استحصال کرتا تھا۔ وہ کسانوں کو قرضہ دیتا اور سود کی بڑی شرح وصول کرتا تھا۔ وہ نجی بنکوں اور کپاس کی کمپنیوں سے قرضہ ۹-۸ فیصدی سود پر حاصل کرتا اور کپاس پیدا کرنے والوں سے ۴۰ سے ۶۰ فیصدی تک سود لیتا تھا۔ چھوٹے کسانوں کی اکثریت پر قرضے کا بوجھ اتنا زیادہ ہوجاتا تھا کہ وہ زندگی بھر اسے ادا نہیں کر پاتے تھے۔ اکثر انھیں اپنی زمین بائیوں کو بیچنا پڑتی تھی تاکہ قرضے سے نجات حاصل کرسکیں۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ۱۹۱۴ء میں فرغانہ کے ۲۵ فیصدی کسان خاندانوں کے پاس زمین نہیں تھی کیونکہ اسے وہ یا تو بیچ چکے تھے یا گروی رکھ چکے تھے۔ اکتوبر انقلاب سے عین پہلے سمرقند علاقے میں ۳۰،۷ فیصدی اور فرغانہ میں ۴،۵۵ فیصدی کسان گھرانوں کے پاس صرف ایک دلیسیاتین (ایک دلیسیاتینا ۲،۷ ایکڑ) تک زمین تھی۔ جب کپاس کی کاشت بڑھی تو زرعی معیشت میں خرید و فروخت کا بھی اضافہ ہوا اور اس طرح دیہات میں سرمایہ دارانہ تعلقات ابتدائی شکل میں ابھرنے لگے۔ لیکن کپاس کے ایسے بڑے سرمایہ دارانہ فارم شروع نہیں ہوئے جہاں اجرت پر مزدوری کی جاتی ہو۔ وسطی ایشیا میں بٹائی کا نظام غالب رہا۔

ترکمان، قرغیزوں اور قزاخ خانہ بدوشوں اور ایک قاراقلپکوں اور تاجکوں کے اس حصے کے معاشرتی ڈھانچے کی احتیاط سے تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے جو پہاڑیوں میں رہتے تھے۔ ان خانہ بدوش لوگوں میں قبائلی سرخیلی کی باقیات بہت زیادہ تھیں۔ ایک پیچیدہ قبائلی گھرانے کے نظام کی موجودگی سے بعض عالموں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان میں قبائلی نظام بیسویں صدی کے شروع تک جاری رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کئی صدیاں پہلے ان لوگوں میں قبائلی نظام ختم ہوگیا تھا اور اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انھوں نے معاشرتی ڈھانچے میں صرف اس کی بعض روایات محفوظ رکھی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم عنصر ان کی خانہ بدوش، نیم خانہ بدوش مویشی بانی کی معیشت تھا جس کی وجہ سے قبائلی سرخیلی روایات مدت تک جاری رہیں۔ استحصال کرنے والے طبقات مثلاً ترکمانوں میں خان اور

بیک، قرغیزوں میں مناپ (بڑی زمین یا بڑے گلے کے مالک) اور بی، بائی کا طبقاتی مفاد اسی میں تھا کہ قبائلی سرخیلی روایات برقرار رہیں تاکہ غریبوں کے استحصال پر پردہ پڑا رہے ایک ایسے معاشرے میں جہاں معاشی تفریق بہت وسیع تھی۔ چراگاہوں، زمین اور پانی کی مشترکہ ملکیت کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قبائلی سرخیلی شکل میں غریب خانہ بدوشوں کے استحصال کا جوہر دراصل جاگیردارانہ تھا۔

ترکمانوں میں رواج یہ تھا کہ ہر سال گاؤں کی برادری قابل کاشت زمین اور پانی تقسیم کیا کرتی تھی۔ اس عمل کو سناشک کہا جاتا تھا جس کا قانونی جواز زمین اور پانی کی مشترکہ قبائلی ملکیت تھی۔ قبیلے کے ارکان نہریں صاف کرتے تھے اور جنگ کے وقت اپنی خیمہ گاہ بستیوں کی حفاظت کرتے تھے۔ چنانچہ زمین اور پانی صرف بالغوں کو ملتا تھا جو نہریں کھود سکتے تھے اور ہتھیار استعمال کر سکتے تھے۔ اس کے بعد یہ ریت بدل گئی۔ اب زمین اور پانی ان لوگوں کو ملنے لگا جو قبیلے کے شادی شدہ ممبر تھے۔ دولت مند خاں، بیک اور بائی اپنی اولاد کی بچپن ہی میں شادی کر دیا کرتے تھے اس لئے انھیں زمین کے بڑے علاقے پر اختیار حاصل ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف اکثر غریب اس لئے شادی نہیں کر سکتے تھے کہ بیوی کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنا پڑتی تھی، چنانچہ وہ زمین سے محروم رہتے تھے۔ چراگاہیں استعمال کرنے کا حق قبیلے کے تمام ارکان کو تھا۔ لیکن کنوئیں اور جھلیں مالدار لوگوں کی ملکیت ہوتی تھیں جن کے بغیر مویشیوں کی افزائش نسل ممکن نہیں۔

قرغیز استحصال کرنے والے طبقات نے بھی قبائلی سرخیلی روایات استعمال کیں اور ان کی مدد سے اپنی بنیادی طور پر جاگیردارانہ لوٹ کھسوٹ کو چھپایا۔ بظاہر چراگاہوں کا مالک قبیلہ ہوتا تھا لیکن دراصل ان پر بی اور مناپ قابض رہتے تھے اور جاگیرداروں کی طرح لوگوں کا استحصال کرتے تھے۔ یہ حقیقت کہ مویشیوں کی ملکیت مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ میں تھی اس تحقیقات کے نتائج سے ثابت ہوتی ہے جو ۱۳-۱۹۱۲ء میں پیش بیک ضلع میں کی گئی تھی۔ کل گھرانوں کا ۵ء۲ فیصدی حصہ جو تین بالائی طبقوں پر مشتمل تھا (مناپ، بی اور بائی) پوری مویشی کے ۵۱ء۳۳ فیصدی حصے کا مالک تھا۔ اس کے مقابلے میں ۲۲ء۹۴-

فیصدی گھرانوں کے پاس صرف ۱۲ ـ ۱۱ فیصدی مویشی تھی۔ ۵ء ۷، ۴ فیصدی گھرانوں کے پاس اپنے ذاتی زرعی آلات نہیں تھے۔ اس سے قرغیز دیہی معاشرے میں طبقاتی تفریق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کئی روایتی قبائلی حقوق کے باوجود ـــــ مثلاً چراگاہوں کا اجتماعی استعمال اور زمین کی مشترکہ قبائلی ملکیت ـ یہ طبقاتی تفریق کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

ترکستان کا نظم و نسق وزارت داخلہ کے نہیں بلکہ وزارت جنگ کے تحت تھا۔ گورنر جنرل جسے خود زار مقرر کرتا تھا بے پناہ اقتدار کا مالک تھا۔ علاقے کا پورا فوجی اور مدنی نظم و نسق اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بخارا اور خیوا کے معاملات میں بھی اسے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ وہ روسی اشرافیہ اور فوجی افسروں میں سے صوبائی اور اضلاعی نظم و نسق کے لئے حکام مقرر کرتا تھا۔

صوبے کے نظم و نسق کا ناخدا فوجی گورنر ہوتا تھا جس کے ہاتھ میں فوجی، مدنی اور عدلیے کے تمام اختیارات ہوتے تھے ضلع اور شہروں کا نظم و نسق عام طور پر فوجی افسروں کے سپرد کیا جاتا تھا۔ صوبے اور ضلع کی سطح تک فوجی نظم و نسق کے علاوہ زار کی حکومت نام نہاد عوام کے انتخاب کئے ہوئے مقامی دیہی نظم و نسق کو بھی استعمال کرتی تھی سب سے نچلی نظم و نسق کی اکائی جو چند گاؤں پر مشتمل ہوتی تھی اس کے عہدے دار اور گاؤں کے حکام ـ انستارشینا (مکھیا)، اکساکال اور قاضی انتخاب کے ذریعہ چنے جاتے تھے۔ لیکن تقرر کی تصدیق صوبے کا فوجی گورنر کرتا تھا۔ یہ چنے ہوئے حکام ضلع کے نظم و نسق کے تحت کام کرتے تھے۔ انتخابات ڈھونگ تھے کیونکہ صرف دولت مند افراد ہی منتخب ہوتے تھے۔ اپنی دولت اور اثر سے فائدہ اٹھا کر بائی اور دوسرے جاگیردارانہ عناصر ہمیشہ ان عہدوں پر قابض رہتے تھے۔ کاؤنٹ پالین نے اپنے ترکستان کے معائنے کی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ ان انتخابات میں خوب رشوت چلتی تھی۔ اس کے علاوہ فوجی گورنر کے یہ اختیار میں تھا کہ وہ ان انتخابات کو بدل دے یا سب سے نچلی نظم و نسق کی اکائی کا ناظم، مکھیا یا قاضی انتخابات کے بغیر براہ راست مقرر کرے نام و نہاد منتخبہ حکام اور نوآبادیاتی نظم و نسق نے طبقاتی مفاد یکساں تھے۔ غریبوں کا

استحصال ۔ اس لئے دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی ۔ منتخبہ مقامی حکام روسی نوآبادکاروں کے ساتھ مل کر اپنے ہی محنت کش عوام کے خلاف صف آرا ہوتے تھے ۔ طرح طرح کی جبری وصولیاں اور اختیارات کا ناجائز استعمال روزمرہ کی باتیں تھیں ۔ مصنف پیرس لکھتا ہے مقامی اکائی کے اکثر کمانڈر "مقامی آبادی پر نئے نئے ٹیکس عائد کرتے تھے جن سے نہ صرف ان کے عام اخراجات پورے ہوتے تھے بلکہ وہ عیش کی زندگی گذارتے تھے" مزید : "یورپی روس کے فوجی انتظامیہ نے بدترین افسر ترکستان بھیج کر اپنے آپ کو ان سے نجات دلا دی تھی ۔"

خیوا اور بخارا کی قلمرو میں جاگیردارانہ مطلق العنان بادشاہوں کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں ۔ خان اور امیر کو اپنی رعیت کی زندگی اور موت پر مکمل اختیارات حاصل تھے ۔ وہ لوگوں پر دیہی اشرافیہ اور ملاؤں کے ذریعہ اپنی حکمرانی چلاتے تھے ۔ خیوا کی قلمرو کا علاقہ ۲۲ بیک عمل داریوں اور بخارا ۲۹ حاکمیتوں پر منقسم تھا ۔ بیک عمل داری کا سربراہ بیک ہوتا تھا اور حاکمیت کا حکم ۔ انھیں خان اور امیر مقرر کرتے تھے ۔ یہ حکام چھوٹے افسروں کے ذریعے من مانی حکومت چلاتے تھے ۔

اگرچہ زارشاہی نے جان بوجھ کر وسطی ایشیا کو زرعی خام مال کا اڈہ بنانے کی کوشش کی لیکن اپنے فوجی اور حکمت عملی کے تقاضوں اور روسی بورژوازی کے محدود مفادات نے بھی اسے چند مفید اقدام کرنے پر مجبور کیا ۔ اس نے ۷۷ ۳۳ کلومیٹر لمبی ریلوے تعمیر کی ، ۴۱ ریلوے ورکشاپ اور ڈپو کھولے جن میں لگ بھگ ۴۰۲ ہزار مزدور کام کرتے تھے ۔ ریلوے کی تعمیر وسطی ایشیا میں گذشتہ صدی کی نویں دہائی میں شروع ہو گئی تھی ۔ ۱۸۸۸ء میں ریل کے ذریعہ سمرقند کو کراسنوودسک سے ملا دیا گیا ۔ ۱۸۹۸ء میں اندیجان سے اور پھر تاشقند سے ۱۹۰۶ء میں ایک چھوٹی ریلوے لائن کے ذریعہ تاشقند کا اورین برگ کے ساتھ اتصال ہو گیا ۔ ریلوے کی آمد نے پورے وسطی ایشیا کے مختلف علاقوں کی باہمی معاشی علیحدگی کے خاتمے کی ابتداء کی اور ملک کے دوسرے علاقوں سے پورے وسطی ایشیا کی علیحدگی دور کرنے میں بڑا رول ادا کیا ۔ لیکن مختلف علاقوں کے درمیان اندرونی

اتصال پر ریلوں کا اثر بہت کم پڑا۔ اس کے باوجود یہ ایک ایسا نیا مظہر تھا جس نے اس خطے کے مستقبل کے لئے وسیع شاہراہیں کھول دیں۔

روسی بورژوازی کو اس علاقے میں خام مال کی صفائی اور تیاری کی صنعت کو بھی ترقی دینا پڑا۔ یہ خود اس کے مفاد میں تھا۔ اور اس میدان میں اس کا کوئی حریف بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وسطی ایشیا میں کپاس اور اون صاف کرنے، تیل، صابن، بیر اور اینٹیں تیار کرنے کی صنعتیں قائم ہونے شروع لگیں۔ ۱۹۱۴ء میں ترکستان میں نصف دست کار اداروں کی تعداد ۸۱۸ تک پہنچ گئی۔ ان میں سے ۴۲۵ ادارے موجودہ ازبیکستان کی سرزمین پر اور ۲۹ موجودہ ترکمانیہ کے ماورائے کیسپین کے علاقے میں تھے۔ ترکستان میں ۹ چھوٹے بجلی گھر بھی تعمیر کئے گئے جو سالانہ ۳۳ لاکھ کلو واٹ گھنٹے بجلی پیدا کرتے تھے۔ لیکن معدنیات نکالنے کا طریقہ فرسودہ ہی رہا اور تیل اور کوئلہ بھی بہت قلیل مقدار میں حاصل کیا گیا۔

وسطی ایشیا میں محدود صنعتی ترقی کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں کپاس کی صفائی کل صنعتی پیداوار کے ۸۱٫۲ فیصدی حصے پر مشتمل تھی۔ موجودہ ازبیکستان کے علاقے میں ۲۰۹ کپاس صاف کرنے کی ملیں تھیں۔ جو کارخانے زرعی خام اشیاء کو صاف اور تیار کرتے تھے وہ تمام صنعتی اداروں کے تقریباً ۹۰ فیصدی کے برابر تھے۔

ترکستان میں ۱۹۱۴ء میں صنعتی پرولیتاریہ کی کل تعداد ۴۹٫۹ ہزار تھی۔ ان میں سے ۲۵٫۵ ہزار (۵۱ فیصدی) صنعتوں میں اور ۲۴٫۴ ہزار (۴۹ فیصدی) ریلوے میں کام کرتے تھے۔ ۷۰ فیصدی صنعتی مزدوروں کا تعلق وسطی ایشیا کی مقامی قومیتوں سے تھا اور ۲۳ فیصدی روسی تھے۔ لیکن ریلوے میں اکثریت (۸۰ فیصدی) روسیوں کی تھی۔

اگرچہ ترکستان کی خاص پیداوار کپاس تھی لیکن کپڑے کی ملیں روس کے مرکزی علاقے میں تھیں۔ وسطی ایشیا کا بورژوازی جو تاجروں اور سود خوروں میں سے ابھر رہا تھا ابھی کمزور تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ بڑی صنعتیں قائم کر سکتا۔ اس لئے وہ روسی بورژوازی کے ماتحت کا رول ادا کرنے پر مطمئن ابھرا تھا۔ لیکن قرغیزوں، تاجکوں اور ترکمانوں میں وہ نہیں کے برابر تھا۔ صنعتی پرولیتاریہ بھی تعداد

کے لحاظ سے کم تھا۔ دوسری قومیتوں کے مقابلے میں اگرچہ ازبیکوں میں اس کی تعداد زیادہ تھی لیکن کل آبادی کے تناسب سے وہ بہت ہی قلیل تھا۔ انقلاب سے پہلے صرف ۱۲۷۰۲ ازبیک صنعتی مزدور تھے۔ جہاں تک ترکمانوں، قرغیزوں اور تاجکوں کا تعلق ہے تو وہاں سرمایہ دارانہ ارتقا کی سطح بے حد نیچی تھی۔ قرغیزیہ میں قومی بورژوازی صفر کے برابر تھا اور وہاں کانوں کا مالک روسی اور تاتار بورژوازی تھا۔ ۱۹۱۳ء میں قرغیز مزدوروں کی تعداد صرف ۱۱۱۴ تھی ترکمانیہ میں صنعت بس ماورائے کیسپین کے علاقے تک محدود تھی۔ اور وہاں ترکمان مزدور بھی بہت کم تھے۔ ۱۹۱۶ء میں ترکمانیہ میں صرف ۲۴۲ صنعتی مزدور تھے اور ان میں بھی فقط ۷ مزدور ہنر یافتہ تھے۔ تاجکستان میں کوئی جدید صنعت نہیں تھی۔ اس کے شمالی حصے (جواب لینن آباد کا علاقہ ہے) میں کپاس صاف کرنے اور تیل اور کوئلہ نکالنے کی چھ چھوٹی سی کمپنیاں تھیں جن میں ۲۰۶ تاجک مزدور کام کرتے تھے۔

چنانچہ انقلاب اکتوبر سے پہلے وسطی ایشیا کی معیشت پر جاگیردارانہ تعلقات پیداوار چھائے ہوئے تھے۔ لینن نے ترکستان کے متعلق لکھا کہ وہ ان ملکوں میں سے ہے جو سرمایہ دارانہ ارتقا کی راہ پر چلنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور جہاں "صنعتی پرولیتاریہ" نہیں کے برابر ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ نو آباد وسطی ایشیا میں سرمایہ دارانہ تعلقات کے ظہور میں آنے کا عمل شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس خطے میں سرمایہ دارانہ ارتقا بھرپور نہیں ہوا لیکن ریلوے اور خام زرعی اشیا کو صاف اور تیار کرنے والی صنعتوں کے قیام سے وہاں سرمایہ دارانہ ارتقا کی ابتدا ہو گئی تھی۔

زار شاہی کے نو آبادکاروں اور خیوا اور بخارا کے جاگیردار حکمرانوں کو لوگوں کی صحت اور ان کی ثقافتی ترقی کا کوئی خیال نہ تھا۔ کل ترکستان میں صرف ۲۱۲ ڈاکٹر تھے اور وہ بھی تقریباً سب کے سب شہروں میں۔ دیہات میں لوگ ہر طبی امداد سے محروم تھے بخارا اور خیوا میں طبی خدمت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ لوگوں کا دارومدار اکثر تعویذ گنڈوں اور نیم حکیموں پر تھا۔

تعلیم کے میدان میں بھی حالت ایسی ہی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں ترکستان کے ریاستی بجٹ

کا صرف ۲،۳ فیصدی حصہ صحت اور تعلیم کے لئے مقرر کیا گیا اور ۸۶،۷ فیصدی رقم فوج، قانون پر عمل درآمد اور انتظامی امور پر خرچ کی گئی۔ تعلیم زیادہ تر مساجد سے ملحق مدرسوں میں دی جاتی تھی۔ اس کا خاص مقصد ملاؤں کو تیار کرنا تھا۔ چنانچہ ترکستان میں ۱۱۸۶۰ ملّا تھے اور بخارا میں تو ان کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ازبکوں میں ۲ فیصدی، ترکمانوں میں ۰،۷ فیصدی، تاجکوں میں ۰،۵ فیصدی، قرغیزوں اور قاراقلپکوں میں ۰،۲ فیصدی تھی۔ قرغیزوں، قاراقلپکوں اور ترکمانوں کا تو رسم الخط تک نہ تھا۔

ثقافتی ترقی

اگرچہ نوآبادیاتی دور بنیادی طور پر ثقافتی پسماندگی کا دور تھا لیکن ثقافتی میدان میں ترقی کے چند آثار بھی تھے۔ ان میں ترکستان میں غیر مذہبی اسکولوں اور دیگر ثقافتی اداروں کا قیام تھا۔ پہلا روسی اسکول سمرقند میں ۱۸۷۰ء میں قائم کیا گیا۔ اس وقت کا گورنر جنرل کاؤفمان یہ بہت اہم سمجھتا تھا کہ روسی اسکولوں میں مقامی لوگ اپنے بچوں کو بھیجیں جہاں علمی مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن یہ سکول مقبول نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں اسلامی تعلیمات نہیں دی جاتی تھی بلکہ کلیسائی مذہب کا درس دیا جاتا تھا۔ مقامی بچوں کی دلچسپی کے لئے ایک اور تجربہ کیا گیا۔ یہ تھا خود مقامی لوگوں کی طرف سے روسی اسکولوں کا قیام۔ ایسا ایک اسکول ایک دولت مند ازبیک سعید غنی نے دسمبر ۱۸۸۴ء میں تاشقند میں کھولا۔ ۱۹۱۱ء تک ایسے اسکولوں کی تعداد ۵۰ تک پہنچ گئی۔ اسکول کا نصاب دو حصوں پر مشتمل تھا۔ روسی زبان اور حساب وغیرہ جنھیں روسی استاد پڑھاتا تھا اور اسلامی تعلیمات جو مولوی کے ذمے تھیں۔

یہ تبدیلیاں وسطی ایشیا کے باشندوں کی ثقافتی زندگی کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ روسی تہذیب کے زیر اثر پرانے مدرسوں اور مکتبوں کی اصلاح کا اور انھیں زندگی کے نئے حالات کے مطابق ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا۔ ان اسکولوں کو نئے طریقے کے اسکول کا نام دیا گیا کیونکہ انھوں نے آواز کو حروف کی شکل میں پیش کرنا شروع کیا تھا۔ اسے اصول جدید

کہا جاتا تھا اور اس کے بانی مجدد تھے۔ اس نئے طریقے کی تحریک ۱۹ ویں صدی کے آخر میں کرائمیا، تفقار اور دالگا علاقے میں شروع ہوئی تھی۔ اس کا علمبردار ایک تاتار بورژوا قوم پرست اسماعیل بیگ تھا۔

اصول جدید کی تحریک وسطی ایشیا میں بھی پھیلی۔ ۱۹۱۷ء تک ترکستان میں اصول جدید کے اسکولوں کی تعداد ۹۲ تھی۔ لیکن اس نئے عنصر کے باوجود ترکستان کا قدیم ثقافتی اور تعلیمی نظام باقی رہا۔ تعلیمی میدان میں پرانے مکتب اور مدرسے غالب رہے اور ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ مثال کے طور پر ۱۸۷۶ء میں تاشقند میں ۱۱ مدرسے تھے اور ۱۹۱۰ء میں ان کی تعداد دگنی ہو گئی، یعنی ۲۲۔ اسی طرح ترکستان کے تین صوبوں میں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۱ء تک ان کی تعداد ۳۱۳ سے ۳۲۸ تک پہنچ گئی۔ پورے وسطی ایشیا میں ۱۸۹۴ء میں مکتب اور مدرسے ۵۴۴۴ تھے اور ۱۹۱۳ء میں ۷۶۶۵۔

اس پر حیرت کرنے کی ضرورت نہیں کہ ترقی پسند روسی ثقافت کی جڑیں وسطی ایشیا کے عوام اور ان کی زندگی میں پیوست نہ ہو سکیں جس میں جدید اسکول، کتب خانے عجائب گھر، ہسپتال تھیٹر وغیرہ شامل تھے۔ راستے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ ایک طرف مطلق العنان زارشاہی اور روسی بورژوازی تھا تو دوسری جانب مقامی استحصال کرنے والے طبقات، جاگیرداری عناصر اور ملّا۔ لیکن اس کے باوجود کئی روسی عالموں، سائنس دانوں اور خدمت خلق کرنے والوں نے وہاں مفید کام کیا۔

جب وسطی ایشیا کو زار کے روس میں ملحق کر لیا گیا تو وہاں نہ صرف سامراجی روس کی غلاظت یعنی مدنی اور فوجی نوآبادیاتی افسر آئے بلکہ ترقی پسند روسی دانشور بھی پہنچے۔ عالم، استاد، جمہوریت پسند چھوٹے حکام، دست کار اور مزدور۔ سیمیونوف تیان شانسکی، سیورتسوف، فیدچینکو، مشن کیتوف اور رومانوفسکی جیسے عظیم روسی جغرافیہ دانوں، ارضیات اور حیاتیات کے ماہرین نے وسطی ایشیا کا طویل وعریض سفر کیا اور بڑی اہم معلومات فراہم کیں۔ یہاں بارتولد اور ویسیلوفسکی کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے اس علاقے کی تاریخ اور ثقافت پر قیمتی مواد کا مطالعہ کیا اور اسے ترتیب دیا۔ ۱۸۷۰ء میں تاشقند میں پبلک

کتب خانہ کھلا۔ یہ سینٹ پیٹرسبرگ اور ماسکو کے کئی ثقافتی اداروں کی تحفے میں دی ہوئی کتابوں اور کئی روسی عالموں کے چندے کا نتیجہ تھا۔ پھر فیدچینکو کی پہل پر ۱۸۷۰ء میں تاشقند میں ایک عجائب گھر قائم کیا گیا۔ اخبارات اور رسالوں کی اشاعت اور کتابوں کی طباعت بھی اس علاقے کی زندگی میں نیا عنصر تھی۔ روسی سائنس دانوں کی پہل پر سائنسی انجمنیں منظم کی گئیں جنھوں نے وسطی ایشیا کے جغرافیہ، علم انسان، فن تعمیر، فلکیات اور طب کا مطالعہ کیا۔ ان تمام باتوں سے اس علاقے کی ثقافتی زندگی آسودہ ہوئی۔

ان تبدیلیوں نے مقامی دانشوروں پر اثر ڈالا اور مقامی لوگوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی ترقی پسند روسی ثقافت کے نمائندوں سے متعارف ہونے سے ان میں نئے علم کی پیاس پیدا ہوئی اور اسے حاصل کرنے کے لئے ایک تحریک چل پڑی۔ نئی ثقافت اور تعلیم کی ترقی کی ایسی تحریک کو اکثر جدیدیت سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ وسطی ایشیا میں ۲۰ ویں صدی کے شروع میں عام روشن خیالی کی جمہوری تحریک کی جگہ جدیدیت کو دینا اور اسے مقامی دانشوروں کی ترقی پسند تحریک کہنا تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ کئی ملکوں میں جو حالی میں آزاد ہوئے ہیں قومی بورژوازی نے تحریک آزادی میں رہنمایانہ رول ادا کیا اور اب بھی نئے معاشرے کی تعمیر میں وہ کسی حد تک ترقی پسند رول ادا کر رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بذات خود ترقی پسند ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جدیدیت کے بارے میں غلط تصورات پیدا ہوئے۔

ترقی پسند روسی ثقافت کے زیر اثر وسطی ایشیا کے عوام میں ثقافتی بیداری نے عام روشن خیالی کی تحریک کو تشکیل دینے میں بڑا رول ادا کیا۔ ۱۹ویں صدی کی آٹھویں اور نویں دھائیوں زارشاہی کی ایشیائی نوآبادیات کے لوگوں میں سے دانشوروں کا ایک ایسا گروہ ابھر آیا جو روسی زبان اور ثقافت سیکھنے کا پرچار کرتا تھا۔ اسی نے روشن خیال اسکول کھولنے اور تعلیمی نظام میں اصلاحات کرنے کی تحریک شروع کی۔ ان دانشوروں کا مقصد لوگوں کو روشن خیال بنانا تھا۔ اس گروہ میں ایسے ماہرین تعلیم اور ادیب شامل تھے جیسے عبدالستار خان، اسحاق خان، فرقت، مقیمی، ذوقی، حمزہ حکیم زادے نیازی (ازبیک) احمد دانش اسیری، صدرالدین

یینی (تاجک)، چوکن ولی خان، عبرائی (الطنسن بن دقزاخ) انھوں نے نہ صرف نئی ترقی پسند ثقافت کی علمبرداری کی بلکہ بورژوا اخلاق اور رجعت پرست معاشرتی نظام کی قلعی بھی کھولی۔

ازبک شاعر فرقت، مقیمی اور ذوقی نے اپنی شاعری میں بائیوں، حکام اور ملاؤں کا خوب مذاق اڑایا۔ مقامی دانشوں کو بس قدیمیوں اور مجددوں میں تقسیم کرنا درست نہیں ہے۔

وسطی ایشیا کے ابھرتے ہوئے قومی بورژوازی نے ۲۰ ویں صدی کی ابتدا سے ہی لوگوں میں ثقافتی بے داری کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاریخی ادب میں ایک وقت ایک ایسی نظریاتی سیاسی تحریک کی تشکیل ہوئی جسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اس کے متعلق ازبیک سوویت مورخ وہابوف لکھتے ہیں: "جدیدیت نوآبادیاتی وسطی ایشیا کے مقامی بورژوازی کا قوم پرست نظریہ بن گئی۔ یہ نظریہ اس دور میں بڑھا جب مزدوروں کی انقلابی تحریک اور قومی آزادی کی عوامی جدوجہد ابھار پر تھی اور جب مقامی بورژوازی عوام الناس سے علیحدہ ہو کر زار شاہی اور روسی بورژوازی کا حلیف بن گیا تھا"

وسطی ایشیا کے بورژوازی کے سیاسی نظریے کو ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے قومی بورژوازی کے سیاسی نظریے سے کیا چیز متعلق بناتی ہے؟ یہ وسطی ایشیا کے مخصوص نوآبادیاتی حالات ہیں۔ کئی افریقی اور ایشیائی ممالک میں بورژوا کا سیاسی نظریہ ایسے حالات میں پروان چڑھا جب مزدور تحریک کمزور تھی۔ وسطی ایشیا میں جو زار کی روسی سلطنت کا حصہ تھا روسی اور مقامی دونوں بورژوازی روسی مزدوروں کی زبردست تحریک سے خائف تھے۔ اس کے علاوہ وسطی ایشیا کا بورژوازی بہت کمزور تھا، وہ آزاد کردار ادا نہیں کر سکتا تھا وہ صرف سامراجی روسی بورژوازی کی دلالی کرتا تھا۔

۷ـ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے برسوں میں مجددوں کی سرگرمیاں وسیع پیمانے پر تھیں۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۹ء تک انھوں نے کئی اخبار اور رسائل شائع کئے۔ "ترقی" "خورشید" "شہرت" اور "ایشیا"۔ مجددوں کا پریس کا اتحاد اسلامی کے خیالات کی تبلیغ کرتا تھا اور بااثر تاجروں اور بائیوں کو استعمال کر کے عوام کو اس پرچم تلے متحد کرنا چاہتا تھا۔ جدیدی اخباروں نے لوگوں کے مصائب، محنت کش کسانوں اور دست کاروں کی بڑھتی

ہوئی غربت، بائیوں اور سود خوروں کے ہاتھوں ان کے استحصال اور نوآبادیاتی نظم ونسق کی من مانی حرکتوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ یہی سوالات عام لوگوں کو پریشان کر رہے تھے۔ چنانچہ جدیدی اخباروں نے عوام کو کم متاثر کیا۔ ۱۹۱۶ء میں مسلح بغاوت کے وقت مجدد عوام کے خلاف صف آرا ہوئے اور زار کی حکومت کو لام بندی میں مدد دی۔ عوام ان کے رجعت پرست رول کو سمجھ گئے، اس لئے مجدد عوام سے بے گانہ ہو گئے۔

یہ درست ہے کہ ملائیت اور جاگیردارانہ عناصر کے مقابلے میں جدیدیت بعض اصلاح پسند رجحانات کی حامل تھی۔ مجددوں نے پرانے جاگیردارانہ رسم ورواج کی مخالفت اور ترقی پسند مغربی ثقافت کی حمایت کی۔ ان میں اور روشن خیال جمہوریت پسندوں میں یہ مشترک بات تھی۔ لیکن آخرالذکر کے مقابلے میں مجددوں نے عوام الناس کے مفادات کی مدافعت نہیں کی۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنے طبقے۔ بورژوازی کے مفادات کی علمبرداری کی۔ ملاؤں کے خلاف جدوجہد میں بھی انھوں نے ثابت قدمی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ کٹر عقائد کو بورژوازی کے مفادات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔

مجددوں کو قومی آزادی کے انقلاب کے دانشور نقیب کہنا صحیح نہیں ہے۔ ان کی اصلاح پسندی ایک گزری ہوئی منزل کی بات تھی کیونکہ اب وسطی ایشیا کے عوام پرولیتاری انقلاب کے لئے تیار تھے۔ مجددوں کا برصغیر ہند میں سر سید احمد خان یا راجہ رام موہن رائے کی معاشرتی اصلاحی اور ثقافتی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں سے مقابلہ کرنا غلط ہوگا۔ برصغیر ہند میں یہ تحریکیں اصلاحی اور روشن خیالی تھیں کیونکہ ان کے ذریعہ اعتدال پسند خیالات اس وقت پھیلائے گئے جب ہندستان کے سیاسی میدان میں معاشرے کے اندر انقلابی تبدیلی کرنے والی قوتیں نہیں اتری تھیں۔ چنانچہ مشہور جدیدی بہبودی خالص مصلح اور ماہر تعلیم نہیں رہا جب اس نے ایک علحدہ سیاسی پارٹی قائم کرنے اور سوشل ڈیموکریٹوں کے خلاف آئینی شاہ پرستوں کا ساتھ دینے کی اپیل کی۔ مجدد لیڈروں نے مسلم عوام سے کہا کہ وہ سب ایک قوم ہیں اور مختلف طبقات کے مابین کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کی انھوں نے اس وقت تعلیم دی جب طبقاتی تضاد شدید ہوتے جا رہے تھے اور انقلابی حالت

تیزی سے پختہ ہو رہی تھی۔ اس نئی انقلابی حالت کے پس منظر میں وسطی ایشیا کے مجددوں کا رجعت پرست رول انھیں ہندستان کے معاشرتی مصلحوں سے جدا کرتا ہے۔

اب وسطی ایشیا کے عوام کے معاشرتی اور طبقاتی ڈھانچے اور ان کے معاشی اور ثقافتی ارتقا کی سطح پر مندرجہ بالا بحث سے نتائج اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔ نوآبادیاتی دور میں ان کی معاشی اور ثقافتی زندگی میں کئی اہم تبدیلیوں (مثلاً نئے شہروں کا ظہور، ریلوں کی تعمیر، زراعت میں سرمایہ دارانہ تعلقات کا ابھرنا، ہلکی سرمایہ دار صنعتوں کا قیام، دانشوروں میں عام بیداری) کے باوجود عام حالت یہ تھی کہ قبل از سرمایہ داری کے تعلقات غالب تھے، ثقافتی پسماندگی اور جہالت چھائی ہوئی تھی اور کٹر عقیدہ پرستی کا راج تھا لیکن ساتھ ہی عوام کا جاگیرداروں، ملاؤں اور نوزائیدہ قومی بورژوازی سے علیحدہ ہونے کا عمل واضح تھا۔ یہ خاص کر ۷-۱۹۰۵ء کی انقلابی مزدور تحریک کے دوران نمایاں ہوا اور بعد میں بھی جب ۱۹۱۶ء میں قومی تحریک آزادی کا سرگرم دور شروع ہوا اور ۱۹۱۷ء کے فروری انقلاب کے بعد کے عہد میں تو وہ نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔

قوم پرست اور قومی آزادی کی تحریک

نوآبادیاتی دور میں زار کی حکومت کے خلاف وسطی ایشیا میں کئی مسلح بغاوتیں ہوئیں۔ لیکن سب کو قومی آزادی کی تحریکیں کہنا حق بجانب نہ ہوگا۔ ہم یہ پہلے لکھ چکے ہیں کہ نوآبادیاتی حکمرانی کے پہلے برسوں میں یہاں کے لوگوں کی معاشی اور ثقافتی زندگی میں کئی ترقی پسند تبدیلیاں ہوئیں۔ خانوں کی ظالم حکمرانی کے بعد جو مطلق العنانی اور جبریہ وصولیابیوں کے لئے مشہور تھی، لوگوں نے ان نئی تبدیلیوں کو بہ نظر استحسان دیکھا جو زار کے زمانے میں ہوئی تھیں۔ اسی لئے جب جاگیرداروں نے خان کی گدی کو بحال کرنے کے لئے مقدس جنگ کے نام پر قومی تحریکیں شروع کیں تو ان میں عام لوگ شریک نہیں ہوئے۔

۱۹ ویں صدی کی آٹھویں اور نویں دہائیوں میں ایسی بغاوتیں وادی فرغانہ تخت

کے مدعی خانوں" نے بھڑکائیں۔ ان بغاوتوں کے حامی زیادہ تر بڑے بڑے زمیندار اور ملا تھے جن کی مراعات اور مفادات کو زار کے نظم و نسق کے بعض اقدام نقصان پہنچا رہے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں درویش خاں تیورا نے خان کی حکمرانی بحال کرنے کے لئے ایسی ہی تحریک چلائی۔ اس میں مومن بائی بھی فرغانہ علاقے میں اپنا ایک دستہ لے کر شامل ہو گیا۔ زار کی فوج نے یہ بغاوت کچل ڈالی۔ درویش خاں کلشغر بھاگ گیا اور مومن بائی کو گرفتار کر لیا گیا۔

درویش خان کی بغاوت کو عام لوگوں کی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔ اسی طرح مدالی عیسٰی خان کی بغاوت بھی عوامی تحریک نہیں بنی جسے اندیجان بغاوت بھی کہا جاتا ہے۔ مدالی عیسٰی خان بخارا کا رہنے والا تھا جہاں امیر کی قلمرو میں تعلیم حاصل کر کے وہ ملازم ہو گیا تھا۔ وہ آٹھویں دہائی کے شروع میں اندیجان آیا۔ یہاں اس نے نہ معلوم کس طرح بڑی دولت جمع کر لی اور اپنے مریدوں کے ذریعے بااثر بن گیا۔ وہ گاؤں منگ تے پے میں آباد ہو گیا اور ایک مذہبی فرقے کی بنیاد ڈالی۔ اس کے زیادہ حامی زمیندار تھے۔ ۷ مئی ۱۸۹۸ء کو اس نے روسیوں کے خلاف مقدس جنگ کا اعلان کیا اور اندیجان کی جانب پیش قدمی کی۔ بغاوت کچل دی گئی اور مدالی عیسٰی خان پہاڑیوں میں بھاگ گیا۔ اس کے بعد نوآبادیاتی حکام نے لوگوں کے دلوں میں دہشت بٹھانے کے لئے سخت ظلم ڈھائے۔ منگ تے پے کو توپ خانے نے تہس نہس کر ڈالا اور ۲۰۸ آدمیوں کو قتل کر دیا گیا جن میں مدالی عیسٰی خاں بھی شامل تھا۔

سوویت یونین کی تاریخی تصانیف میں زار شاہی کے خلاف ان ابتدائی بغاوتوں کی نوعیت کے متعلق کافی بحث رہی۔ مثلاً "ازبیکستان کے عوام کی تاریخ" کے مصنفین نے مدالی کی بغاوت کو قومی آزادی کی جدوجہد قرار دیا۔ اخبار "ایزویستیا" نے اپنے تبصرے میں اس جاگیردارانہ قومی بغاوت کو جس کے رہنما مذہبی پیشوا تھے اور جسے سامراجی طاقتوں کے ایجنٹوں نے اکسایا تھا عوامی انقلابی تحریک قرار دینے پر نکتہ چینی کی۔

دنیا کے تمام ملکوں میں تاریخی واقعات کا بار بار تخمینہ کرنا ایک مسلسل عمل ہے اور

یہ ان واقعات اور تحریکوں پر اور بھی زیادہ صادق آتا ہے جنہیں گزرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ وقت کے گزرنے پر ہی صحیح تاریخی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل عام عمل ہے اور سوویت علم تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب سوویت مورخ (ازبیک اور روسی دونوں) وسطی ایشیا کے روس سے الحاق کی خارجی طور پر ترقی پسند اہمیت کو کچھ کم خیال کرتے تھے۔ اکتوبر انقلاب کے فوراً بعد ایسی سوچ قدرتی تھی جب قبل از انقلاب کی ہر چیز کو سرے سے ہی بُرا خیال کیا جاتا تھا اور اس کی تنقید کی جاتی تھی۔ ان حالات میں سوویت مورخوں نے نوآبادیاتی دور میں زارشاہی کے خلاف ہر تحریک کو آزادی کی عوامی انقلابی جدوجہد کہا۔ تیسری اور چوتھی دھائیوں میں کئی سوویت مصنفین کی تخلیقات میں یہ خیال موجود ہے۔ مثلاً فیودوروف اپنی کتاب "وسطی ایشیا میں قومی آزادی کی تحریک کا خاکہ" (تاشقند، ۱۹۲۵) میں نوآبادیاتی دور میں تمام تحریکوں کو، خواہ وہ عوامی نہ تھیں اور ان کے رہنما ملا تھے، ایک مد میں شامل کر لیتے ہیں۔ "قومی مذہبی تحریک آزادی" (صفحات ۱۸-۱۴)۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں اندیجان کی بغاوت کو قومی تحریک آزادی کہا۔ اسی طرح گالوزو نے اپنی تصنیف "ترکستان - ایک نوآبادی" (تاشقند، ۱۹۳۵ء) میں زارشاہی کے خلاف ہر اقدام کو قومی آزادی کی جدوجہد بتایا ہے ان میں گذشتہ صدی کی چوتھی دھائی میں سلطان کینسری کی قیادت میں بغاوت سے لے کر، ۱۸۶۸ء میں سمرقند میں بغاوت، بیکوں کی قلمرو کے شہر بنر میں بغاوت ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۶ء میں قوقند میں مسلح اقدام، ۱۸۹۲ء میں تاشقند میں ہیضے کا فساد، ۱۸۹۸ء میں مدالی عیسیٰ خان کی بغاوت اور ۱۹۱۶ء تک کی بغاوت شامل ہے۔

اس زمانے میں سوویت علم تاریخ کا یہ رویہ مثالی تھا اور اس کا ازبیک مصنفین کی "بورژوا قوم پرست گمرہی" سے کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ فیودوروف اور گالوزو دونوں ازبیک نہیں تھے۔ یہ ایک ایسے دور کی پیداوار تھا جب ماضی کی ہر بات کو برا کہا جاتا تھا۔

"ازبیکستان کے عوام کی تاریخ" نے ان روایات کو اس عہد میں بھی جاری رکھا جب سوویت

مورخوں سے ماضی کے واقعات کا خارجی طور پر جائزہ لینے کی توقع تھی۔ چنانچہ اخبار "ایز ویسیتنا" نے بجا طور پر اس پر تنقید کی۔

زار شاہی کے خلاف وسطی ایشیا میں تحریکوں کا موجودہ سوویت تخمینہ "عظیم روسی جارحانہ قوم پرستی کی کجروی" پر مبنی نہیں ہے۔ ایسا رچرڈ پائپس اور سیٹون واٹسن اور دوسرے مغربی بورژوا مصنف باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پائپس نے ایک مجموعے "سوویت نوآبادیاتی نظام" میں وسطی ایشیا پر روسی تسلط کے ترقی پسند پہلو کے متعلق لکھا ہے کہ یہ وسطی ایشیا کے لوگوں کو روسی بنانے کا تاریخی پہلو تھا۔ اسی طرح سیٹون واٹسن سوویٹ مورخوں کے دلائل کو "سفید فام انسان پر بوجھ کو جیسے کہ کپلنگ سمجھتا تھا نیم مارکسی اسلوب" بیان کرتا ہے۔ لیکن ان دعوؤں میں صداقت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے۔ وسطی ایشیا کے روس کے ساتھ الحاق کی خارجی طور پر ترقی پسند نوعیت کے بارے میں سوویت تاریخ دانوں کی موجودہ رائے حقائق کے خارجی تجزیہ پر مبنی ہے اور کافی غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس میں بعض مبالغہ آرائیوں کا امکان ہوسکتا ہے۔

یہ نقطہ نظر کہ زار شاہی کے خلاف تمام تحریکیں قومی آزادی کی تحریکیں تھیں اس لئے درست نہیں ہے کہ یہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتا ہے کہ ان میں تاشقند میں ۱۸۹۲ء میں ہیضہ کے فسادات اور ۱۹۱۶ء کی بغاوت کے علاوہ اور کسی بھی تحریک میں عوام نے حصہ نہیں لیا۔ سلطان کینسری کی بغاوت کو قزاخ عوام کی جدوجہد آزادی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدا میں کینسری چند قزاخ قبائل کو اپنے ساتھ شریک کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا لیکن بعد میں جب یہ پتہ چلا کہ اس کے مقاصد بھی جاگیردارانہ ہیں تو انہوں نے فوراً کینسری کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ خود زار کے روسی سپاہیوں سے نہیں بلکہ قرغیزیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ شہر سبز کے بیکوں کی تخت بخارا کی سازشوں اور وسطی ایشیا کی اشرافیہ کی مقدس جنگ کے نام پر لوگوں کو زار کے خلاف محاذ آرا کرنے کی کوششوں کو قومی آزادی کی تحریک کہنا تاریخ کو منہ چڑانا ہے۔ یہ واقعات توقند میں ۱۸۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں فرغانہ ۱۸۸۵ء اور اندیجان میں ۱۸۹۸ء میں ہوئے۔

وسطی ایشیا میں نوآبادیاتی دور میں قومی آزادی کی تحریک کے متعلق چند عام ملاحظات شاید اس تحریک کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد دیں۔ خانوں کی حکمرانی کے دور میں وسطی ایشیا کے لوگ ہلاکت آمیز جنگوں سے تھک گئے تھے۔ اس لئے شروع میں انھوں نے زارشاہی کے قائم کئے ہوئے نظم ونسق کا خیر مقدم کیا کیوں کہ انہیں اندرونی نظم اور ذاتی تحفظ حاصل ہوا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تاشقند جیسے بڑے شہر پر بس دو ہزار روسی سپاہیوں نے قبضہ کیا تھا۔ صرف ترکمان قبائل نے زار کی پیش قدمی کی سنجیدہ مزاحمت کی تھی۔

وسطی ایشیا پر زارشاہی کا تسلط برطانیہ کے ساتھ سخت رقابت کے ماحول میں ہوا۔ اس لئے زارشاہی نے اس علاقے کے لوگوں کی جانب محتاط رویہ اختیار کیا چنانچہ اس نے مذہب اسلام کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کی۔ عیسائی مبلغوں پر وسطی ایشیا کے مسلمانوں پر تبلیغ کرنے پر پابندیاں لگائی گیئں۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں جب روسی برطانوی رقابت کی شدت میں کمی ہوئی تو حالت بدل گئی اور زارشاہی کی تشدد آمیز پالیسی کا دور شروع ہو گیا۔ اس صدی کے آخر میں قومی آزادی کی تحریک کا ابھار بڑی حد تک وسطی ایشیا میں سرمایہ دارانہ تعلقات کے ظہور کا مرہون منت تھا۔ کیونکہ انھوں نے محنت کش لوگوں کی معاشی مصیبتوں میں اضافہ کر دیا تھا اور قومی شعور کی سطح بلند کر دی تھی۔ معاشی لحاظ سے تباہ شدہ دہقان اور غریب دستکار سیاسی عقل کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ تاشقند میں ہیضے کے فسادوں اور پورے ترکستان میں ۱۹۱۶ء میں بغاوت کا تعلق اسی دور سے ہے۔

ان دونوں تحریکوں کو صحیح معنوں میں نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف آزادی کی عوامی جدوجہد کہا جا سکتا ہے۔ انہیں ایسا تمام سوویت تاریخی تصنیفات میں تسلیم کیا گیا ہے۔ تاشقند میں ہیضے کے فساد کو تمام سوویت مورخوں نے عوامی تحریک کہا ہے حالانکہ اس میں مذہبی عناصر موجود تھے۔ مارکس ازم یہ تسلیم کرتا ہے کہ کسانوں کی مذہبی ایذا رسانی سے جنگ آزادی مذہبی رنگ میں شروع ہو سکتی ہے۔ بوہیمیا کے مذہبی پیشوا جان ہس کی رہنمائی میں جنگوں کو مارکس نے "مذہب کے پرچم تلے چیک کسانوں کی قومی جنگ" کہا۔ اسے یاد رکھنے کی

ضرورت ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ترکستان میں زارشاہی کی پالیسی مذہبی ایذا رسانی کی نہیں تھی اس لئے وسطی ایشیا میں قومی تحریک آزادی پر مذہب کا غلبہ زیادہ نہیں تھا۔

۱۹ ویں صدی کے آخر میں وسطی ایشیا کے کسانوں نے زارشاہی نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف سیاسی اقدام شروع کر دیئے۔ دیہی معیشت میں سرمایہ داری کے داخل ہونے سے دہقان تباہ حال ہو گئے تھے۔ انھوں نے دولت مندوں اور نوآبادیاتی حکام پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ یہ نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف ایک قسم کا احتجاج تھا۔ فرغانہ، سمرقند اور سیر دریا تین صوبوں جہاں استحصال نہایت شدید تھا۔ کپاس کی کاشت کرنے والے کسانوں کے چھاپے ہر سال بڑھتے رہے ۱۸۸۷ء اور ۱۸۹۸ء کے درمیان ایسے چھاپوں کی تعداد ۸۶۶ تک پہنچ گئی۔ فرغانہ میں کسانوں کی معاشی تباہی بے حد شدید تھی۔ وہاں ۲۹۴ چھاپے مارے گئے۔ اسی عرصے میں سمرقند میں چھاپوں کی تعداد ۱۸۲ اور سیر دریا میں ۵۷ تھی۔

کسان جدوجہد کی ایک اور شکل انتظامیہ سے تصادم تھی۔ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۸ء تک ایسے ۲۵ تصادم ہوئے جن میں ۳۴ افسروں پر حملہ کیا گیا اور ۲۰ مارے گئے۔ اس صدی کے آخر تک قومی آزادی اور طبقاتی جدوجہد میں دہقان اور خانہ بدوش روز افزوں زیادہ تعداد میں حصہ لینے لگے۔ مقامی گلے بان بھی دولت مند کسانوں اور کزاک نوآبادکاروں کے خلاف جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ اس کی شکل یہ تھی کہ وہ ان کے مویشی پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔

کسانوں کی یہ جدوجہد ان شکلوں میں ۲۰ ویں صدی کی پہلی دھائی تک جاری رہی۔ ۱۹۰۵ء میں روس میں انقلابی اتھل پتھل نے کسانوں کے چھاپوں کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا۔ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان وہ ۸۲۳ فیصدی بڑھ گئے۔ ۱۹۰۵ء کے انقلاب نے کسانوں کی جدوجہد کو ایک نئی منزل میں پہنچا دیا۔ اب کسان زارشاہی کے نوآبادیاتی نظام کے خلاف کھلی سیاسی جدوجہد کے میدان میں اتر آئے۔ لیکن اس جدوجہد کی کمزوری یہ تھی کہ وہ غیر منظم اور خود رو تھی ۷-۱۹۰۵ء کے انقلاب نے مقامی پرولیتاریہ کو سیاسی تعلیم دی جو اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کم تھا۔ جب ۱۹۰۶ء میں روسی مزدوروں نے ہڑتال کی اور ان کی جگہ مقامی قومیتوں کے مزدوروں کو بھرتی کیا گیا تو وہ بھی ہڑتال میں شریک ہو گئے۔ مقامی مزدوروں نے روسی مزدوروں

کے شانہ بشانہ جلسوں اور جلوسوں میں حصہ لیا۔ ماسکو کی دسمبر بغاوت ناکام ہونے کے بعد پورے ترکستان میں غیر معمولی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور سوشل ڈیموکریٹک تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی اور انھیں بری طرح کچلا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں روس میں پھر انقلابی تحریک کی نئی لہر ابھری۔ اس نے ترکستان کے مزدوروں اور سپاہیوں کو بھی متاثر کیا۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں تاشقند کے سپاہیوں نے مسلح بغاوت کی۔ لیکن نوآبادیاتی انتظامیہ نے اسے بے رحمی سے دبا دیا۔

وسطی ایشیا میں ۱۹۱۶ء میں زارشاہی کے خلاف قومی آزادی کے لئے جو بغاوت ہوئی وہ صحیح معنوں میں عوام کی بغاوت تھی۔ اس میں تمام عوام نے حصہ لیا۔ سامراجی جنگ نے وسطی ایشیا میں نوآبادیاتی استحصال اور لوٹ کھسوٹ مزید بڑھا دی۔ زار کے حکام زبردستی مویشیوں پر قبضہ کرتے تھے، ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ اس نے لوگوں کی معاشی زندگی کو اور بھی تباہ حال کر دیا۔ روس سے اناج کی برآمد کم ہو گئی اس لئے روٹی کی قیمت میں اضافہ ہو گیا پھر اس طرح یہ کہ اس سال فصل خراب ہوئی۔ پورے خطے پر فاقہ کشی منڈلانے لگی

زارشاہی کے خلاف عوامی جدوجہد کا اصل سبب حکومت کا ۲۵ جون ۱۹۱۶ء کا فرمان تھا۔ اس کے مطابق مقامی سرد آبادی کی محاذ کے عقب میں لام بندی کی گئی۔ جس طریقے سے مقامی حکام نے اس پر عمل کیا اس سے آبادی مشتعل ہو گئی۔ دولت مند لوگ رشوتیں دے کر یا اپنی جگہ دوسروں کو بھرتی کر کے بچ گئے اور فرمان کا سارا بوجھ غریبوں کو برداشت کرنا پڑا۔

وسطی ایشیا کے مختلف خطوں میں دہقانوں اور غریب شہریوں کی خود رو بغاوتیں ہونے لگیں۔ غضب ناک لوگوں کے ہجوم مقامی دفاتر پر حملے کرنے لگے اور بھرتی ہونے والوں کی فہرستیں پھاڑنے لگے۔ بعض اوقات انھوں نے حکام کو ٹھکانے لگا دیا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے یہ تحریک بنیادی طور پر غیر منظم تھی، اسے ضبط میں لانے والا اور رہبری کرنے والا کوئی مرکز نہیں تھا۔ اکثر اضلاع میں اس جدوجہد کا نشانہ زارشاہی کا من مانا نظم و نسق نوآبادیاتی نظام اور مقامی جاگیردارانہ عناصر بنے۔ اس تحریک آزادی کی نوعیت بنیادی طور پر ترقی پسند تھی۔ لیکن بعض اضلاع میں جاگیرداروں اور ملاؤں نے جرمن اور ترک جاسوسوں سے ساز باز کر کے جارحانہ روس دشمن قوم پرستی کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ جنزاک، تجن اور گیورگین میں

تحریک نے ایسی ہی شکل اختیار کر لی۔

زار شاہی کے مسلح دستوں نے ۱۹۱۶ء کی بغاوت کو بڑی بے رحمی سے کچل دیا۔ قرغیز خانہ بدوشوں پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ بیان سے باہر ہیں۔ تقریباً ۳ لاکھ قرغیزوں نے سیمی ریچ یے سے بھاگ کر چین میں پناہ لی۔ ان کی زمینیں ضبط کر لی گئیں اور ان پر روسیوں کو آباد کر دیا گیا۔ بغاوت ناکام رہی لیکن اس نے اس نوآبادیاتی علاقے کے عوام کی تاریخ میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ یہ تحریک نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہونے کے ساتھ جاگیرداری کے بھی خلاف تھی۔ ۱۹۱۶ء کی بغاوت کی ناکامی نے وسطی ایشیا کے عوام کو ایک عظیم سبق سکھایا۔ سبق یہ تھا کہ صرف روسی پرولیتاریہ کی امداد سے اور اشتراکی انقلاب کے ذریعے وہ قومی اور نوآبادیاتی ظلم سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ قومی بورژوازی اور بورژوا دانشوروں کی اس موقع پر غداری نے بھی عوام کی آنکھیں کھول دیں جو زار شاہی سامراج کے دلال بن گئے تھے۔ اس کی ابتدا بھرتی کے خلاف خود رو مظاہروں سے ہوئی، پھر وہ مسلح جدوجہد میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا مقصد روس سے علیحدہ ہونا نہیں بلکہ نوآبادیاتی ظلم سے نجات حاصل کرنا تھا۔ تحریک کی توانائی اور وسعت سے معلوم ہوتا تھا کہ وسطی ایشیا میں انقلابی حالت اٹھان پر ہے جن مزدوروں اور کسانوں کو روس میں کام کرنے کے لئے بھرتی کیا گیا تھا وہ روسی بولشویکوں کے زیر اثر سیاسی طور پر سرگرم ہو گئے۔ جب وہ ترکستان لوٹے تو فروری اور اکتوبر انقلاب کے درمیان انھوں نے مقامی عوام کے ہراول کا رول ادا کیا۔ اکتوبر انقلاب کے بعد یہی لوگ تھے جنھوں نے محنت کش مسلمانوں کی سوویتیں منظم کرنے میں پیش پیش حصہ لیا۔

۱۹۱۶ء کی بغاوت ناکام رہی لیکن اس نے وسطی ایشیا کے عوام کو سیاسی جدوجہد کا ایک عظیم سبق سکھایا۔ اس نے انھیں یقین دے دیا کہ صرف روسی پرولیتاریہ کی امداد اور قیادت اور اشتراکی انقلاب کے ذریعے وہ نوآبادیاتی ظلم سے اپنے آپ کو آزاد کر سکتے ہیں۔ قومی بورژوازی اور بورژوا دانشوروں کی غداری نے بھی جو ایسے نازک موقع پر زار شاہی سامراج کے دلال بن گئے تھے عوام کی آنکھیں کھول دیں۔

وسطی ایشیا میں اشتراکی انقلاب

سوویت یونین کے سوشلسٹ انقلاب کے متعلق سوشلسٹ عالموں میں مدتوں بحثیں ہوتی رہی ہیں کہ آیا ایک مقابلتہً پسماندہ ملک میں جہاں سرمایہ داری نے پوری طرح تسلط نہ جمایا ہو جہاں پرولتاریہ طبقہ مضبوط توانا نہ ہو اور عددی طور پر بھی اس کی چھاپ بہت گہری نہ ہو تو کیا وہاں سوشلسٹ انقلاب بپا کیا جا سکتا ہے، سوال جو سوویت یونین کے بارے میں کیئے جاتے رہے ہیں ان سوالوں کو کہیں زیادہ شدت کے ساتھ وسطی ایشیا میں سماجی انقلاب کے متعلق اٹھایا جاتا رہا ہے اور اب بھی اٹھایا جاتا ہے اور ایک عالم کو ان مغربی دانشوروں نے سوشلزم کے دشمن کا نقاب پہن کر یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وسطی ایشیا میں انقلاب بذریعہ تلوار لایا گیا اور روسی بولشویکوں نے ان خطوں میں انقلاب مسلط کیا ہے وگرنہ یہاں پر نہ تو انقلاب کے لیے فضا سازگار تھی اور نہ ہی یہاں پر اس قسم کی کوئی جاندار تحریک تھی لیکن حقائق ان تمام مشکوک کی نفی کرتے ہیں ویسے اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روسی بولشویکوں نے زبردست امداد کی اور کیوں نہ کرتے یہ ان کا قومی اور بین الاقوامی فریضہ تھا وگرنہ وسطی ایشیا میں اشتراکی انقلاب کے لئے معاشرتی معاشی اور سیاسی حالات پختہ تھے اس لئے وہ پھوٹ پڑا۔ بعض مصنف یہ کہتے ہیں کہ وسطی ایشیا میں پیداواری قوتوں کی سطح پست تھی، وہاں کے لوگوں کا ثقافتی معیار بلند نہیں تھا۔ اس لئے وہاں اشتراکی انقلاب کی شرائط پوری نہیں ہوتی تھیں۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ مقامی آبادی

میں صنعتی پرولیتاریہ بہت کم تھا جس کے بغیر اشتراکی انقلاب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔
ان تمام دلائل کا نچوڑ یہ ہے کہ اکتوبر انقلاب کی جڑیں وسطی ایشیا کی سرزمین میں نہیں تھیں اور وہاں اسے روسی بولشویکوں نے روس سے درآمد کیا۔ روس سے اشتراکی انقلاب کی درآمد کے سلسلے میں تاریخی اعتبار سے یہ غلط نتائج مغربی مصنفین نے بعض پرانے سوویت مورخوں کی غلط بیانیوں پر مبنی کئے ہیں۔ ان میں ایک سفاروف بھی ہیں جنھیں سوویت حکومت اور پارٹی میں اہم عہدے حاصل تھے۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے ایک تصنیف شائع کی جس میں لکھا کہ ترکستان میں فروری، ۱۹۱۷ء تک کوئی انقلابی تحریک نہیں تھی اور انقلاب وہاں "تار کے ذریعے" پہنچا وغیرہ وغیرہ۔

اس دعوی کو تاریخ کی کسوٹی پر کسنے کی ضرورت ہے۔ سامراج کے دور میں اشتراکی انقلاب کی شرائط کی موجودگی کے سوال کو عالمی سامراجی نظام کے پس منظر میں مطالعہ کرنا چاہیئے اور یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ جاگیرداری دشمن اور قومی آزادی کے انقلاب ترقی کر کے اشتراکی انقلاب بن سکتے ہیں۔

جہاں تک ترکستان کا سوال ہے تو اسے علیحدہ رکھ کر اشتراکی انقلاب کی شرائط کے تجزیے تک محدود نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اسے پورے ملک کے تعلق سے دیکھنا چاہیئے یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ زارشاہی کے نوآبادیاتی نظام کے خلاف وسطی ایشیا کے عوام کی جدوجہد آزادی روس میں انقلابی مزدور تحریک کے براہ راست تعلق سے اور اس کے زیر اثر سال بسال وسیع اور گہری ہوئی۔ اس کے علاوہ خارجی معاشرتی معاشی شرائط کے ماسوا داخلی عنصر کے رول کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

وسطی ایشیا کے روس میں شامل ہو جانے سے اشتراکی انقلاب کے معاشرتی معاشی حالات کو فروغ ہونے میں مدد ملی۔ نوآبادیاتی دور میں سرمایہ دارانہ تعلقات ابھرنے سے طبقاتی تضاد شدید ہوئے۔ وسطی ایشیا میں اشتراکی انقلاب کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ انقلاب سے پہلے ترکستان کی حالت کا جائزہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف پیداوری قوتوں کے ارتقا کو بلکہ طبقاتی جدوجہد کے حالات اور قومی ظلم کی شدت کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ اشتراکی انقلاب

کے لئے یہ لازمی نہیں ہے کہ کسی ملک کی معاشی اور سیاسی ترقی میں براہ راست متناسب تعلق ہو۔ اس سلسلے میں لینن نے لکھا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے "کون اسے شروع کرے گا اور کس کے ہاتھوں وہ ختم ہوگا۔ ترکستان میں اشتراکی انقلاب کی غیر پختگی کے متعلق جتنے غلط خیالات ہیں ان کا دراصل سرچشمہ وسطی ایشیا کی روس میں شمولیت کے خارجی ترقی پسند نتائج سے انکار اور اس کے سبب سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کی جانب آنکھیں بند کرنا ہے۔ اسی شمولیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذرائع پیداوار کے ساتھ مختلف طبقات کے تعلقات بدلے اور زراعت اور صنعت میں طبقاتی تفریق وسیع ہوگئی۔

یہ دعوی کہ وسطی ایشیا کے لوگوں میں طبقاتی تقسیم نہیں تھی اور اس لئے وہ طبقاتی جدوجہد سے بے گانہ تھے حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترکستان میں صنعتی پرولیتاریہ کی تعداد کم تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آبادی میں پرولیتاری عناصر کی اکثریت نہ تھی۔ زرعی پرولیتاریہ اور نیم پرولیتاری پوری آبادی پر غالب تھا۔ اس سلسلے میں لینن نے شہری پرولیتاریہ اور زرعی پرولیتاریہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دولت مند کسانوں اور کسان بورژوازی کے خلاف متحد ہوتے ہیں۔ انھوں نے غریب کسانوں کو نیم پرولیتاری قرار دیا ہے۔ انھوں نے "سوویت اقتدار پر دس مقالے" میں سوویت اقتدار کا ایک مقصد پرولیتاریہ اور غریب کسانوں کی آمریت کا قیام بتایا ہے۔

وسطی ایشیا کی تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ قاری اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ترکستانی دیہات کی آبادی کی اکثریت پرولیتاریہ اور نیم پرولیتاریہ پر مشتمل تھی۔ ۱۹۱۷ء کی کل روسی زرعی مردم شماری کے مطابق زراعت میں اجرتی مزدوروں کی تعداد صوبہ فرغانہ میں ۲۲۲۱۷، صوبہ سمرقند میں ۲۳۰۲۷ اور صوبہ سیردریا میں ۱۵۰۶۷ تھی۔ دوسرے علاقوں کے اعداد مکمل نہیں ہیں۔ لیکن جو اعداد و شمار دستیاب ہیں ان سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ دیہات میں طبقاتی تفریق کتنی گہری تھی۔ بتراکوں (بے زمین زرعی مزدور) کی فوج ہی زرعی پرولیتاریہ تھی۔ ان کے علاوہ ایسے غریب کسانوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی جو زمین سے محروم تھے اور دوسروں کی زمین پر فصل کی بٹائی کی بنیاد پر کام کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بٹائی کی شرطیں ان کے لئے

بہت سخت تھیں۔ ان کے علاوہ ترکستان میں دست کاری کی صنعتوں میں ۲۴۸۳۲۰ لوگ کام کرتے تھے۔ ان کی معاشرتی ساخت یہ تھی کہ ۱۹۰۸-۹ء میں ۴۰ فیصدی غریب دستکار تھے، ۲۵ فیصدی درمیانہ، ۲۴ فیصدی اجرت پر کام کرنے والے اور باقی خوش حال۔ یہ لوگ تھے اشتراکی انقلاب کے بانی اور نئی زندگی کے خالق۔

وسطی ایشیا کے روس میں شامل ہوتے ہی وہاں کے محنت کش عوام "دو قسم کے روس" سے دوچار ہوئے۔ ظالموں، استحصال کرنے والوں رومانوں اور استولیپنوں کے روس سے جو مقامی ایشائی لوگوں اور روسی عوام دونوں پر ظلم کرتا تھا اور انقلابیوں کے روس سے جو معاشرتی اور قومی ظلم کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا۔ وسطی ایشیا کے عوام کا صرف زار کے نوآبادکاروں، روسی دولت مند کسانوں اور تاجروں سے ہی واسطہ نہیں پڑا بلکہ وہ روسی کسانوں، صنعتی مزدوروں، سائنس دانوں، استادوں، مصنفوں اور انقلابیوں سے بھی واقف ہوئے۔

وسطی ایشیا کے محنت کش لوگوں کے عظیم روسی عوام سے میل جول کا ترقی پسند پہلو اس وقت مزید واضح ہوا جب روس عالمی انقلابی تحریک کا مرکز بن گیا اور روسی مزدور طبقہ اپنی مجاہدانہ انقلابی سیاسی پارٹی قائم کرنے کے بعد عالمی انقلابی تحریک کا ہراول تسلیم کیا جانے لگا۔ روس میں انقلاب کی بڑھتی ہوئی لہر نے بھی وسطی ایشیا کو کافی متاثر کیا۔ چنانچہ وسطی ایشیا کی ترقی پسند قوتوں نے جاگیر دارانہ اور نوآبادیاتی ظلم کے خلاف روسی پرولیتاریہ کے ساتھ متحدہ جدوجہد کے لئے آواز بلند کی۔ وہ یہ صحیح سمجھتی تھیں کہ روس کے محنت کش بھی ان ہی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ہاتھوں ظلم برداشت کر رہے ہیں جن کے جوئے میں وسطی ایشیا کے عوام بندھے ہوئے ہیں۔ اسی لئے انھیں اپنا اور روسی پرولیتاریہ کا مشترکہ مقدر صاف نظر آنے لگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روسی پرولیتاریہ نے وسطی ایشیا کے اشتراکی انقلاب میں ہراول کا رول ادا کیا۔ وہ مقامی مزدوروں کا طبقاتی شعور بیدار کرنے کا وسیلہ بنا اور دہقانوں کے ساتھ اس کا اتحاد قائم کرانے کا بھی جو آہستہ آہستہ جاگیرداروں اور ملاؤں کے اثر سے اپنے آپ کو آزاد کر رہے تھے۔ ان کسانوں نے ۱۹ویں صدی کے آخر سے سیاسی جدوجہد کے میدان میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا، اگرچہ یہ جدوجہد خودرو اور غیر منظم تھی۔

وسطی ایشیا کے روسی نوآبادیاتی نظام میں ایک نیا عنصر بھی تھا جو دوسری مغربی طاقتوں کی نوآبادیات میں موجود نہ تھا۔ یہ تھا روسی سلطنت کی نوآبادیاتی رعیت اور عام روسی لوگوں کے درمیان براہ راست تعلقات۔ روس کی نوآبادیات کا جغرافیائی لحاظ سے اس کے ساتھ ربط تھا اور بعد میں وہاں روسی لوگ بسائے گئے۔

روسی نوآبادیات میں اشتراکی انقلاب کی ضروری شرائط پوری کرانے میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کے برعکس کئی وجوہات کی بنا پر جن میں سے ایک جغرافیائی فاصلہ بھی تھا برطانوی پرولیتاریہ نوآبادیات میں اشتراکی انقلاب کے سلسلے میں پہل قدمی نہیں کر سکا۔ برطانوی پرولیتاریہ نوآبادیات میں (مثلاً برصغیر ہند) ترقی پسند رول اس لئے بھی ادا نہیں کر سکا کہ اکثر اس پر مزدور اشرافیہ کا اثر تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ برطانیہ کی لیبر پارٹی نے ہندوستان کے حق خود اختیاری کی کئی بار مخالفت کی۔ لیکن اگر برطانوی پرولیتاریہ مزدور اشرافیہ کے اثر سے آزاد ہوتا تب بھی جغرافیائی علیحدگی راہ میں حائل ہوتی۔ یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں انگریز مزدور نہیں رہا جب کہ وسطی ایشیا کی ریلوں اور دوسرے صنعتی اداروں میں ہزاروں روسی مزدور کام کرتے تھے۔ اگرچہ برطانوی سرمایہ نے خام مال کو بہتر طریقے سے حاصل کرنے کی خاطر ہندوستان میں ریلیں ضرور بنائیں۔ لیکن ان کی تعمیر میں ایک انگیز مزدور تک نے حصہ نہیں لیا۔ روسی مزدوروں کے علاوہ وسطی ایشیا میں کافی روسی کسان بھی آباد کئے گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے دولت مند کسان نہیں تھے اور ان کا مفاد دہقانوں کے مفاد سے مشترک تھا۔

بعض مصنفین نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ایشیا میں روسی آبادکاروں اور مقامی لوگوں کے مفادات میں مستقل تصادم رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان اتحاد ممکن ہی نہ تھا۔ سفاروف کا یہ دعویٰ کہ ترکستان میں روسی آبادی ایک تہائی سے لے کر نصف حصے تک "طفیل خور پرت" تھی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔" اس "طفیل خور" طبقے میں وہ بلا امتیاز پوری شہری روسی آبادی کو شامل کر دیتا ہے۔ اگر سفاروف کی بات مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام روسی ادیب اور سائنس داں جیسے پرزوالسکی سیمونوف تیان نسکی وغیرہ نوآبادکار تھے اور تمام روسی مزدور مراعات یافتہ اشرافیہ کے ارکان۔

ترکستان میں کل روسی آبادی تقریباً ۵ لاکھ ۰ ۴ ہزار تھی۔ اس میں سے لگ بھگ ایک لاکھ ۸۵ ہزار لوگ شہروں میں اور ۳ لاکھ ۳۰ ہزار دیہات میں رہتے تھے۔ ۱۴ ہزار ۶ سو شہر جیسی آبادیوں میں اور ۸ ہزار سے کچھ اوپر ریلوے لائن پر اسٹیشنوں کے قریب آباد تھے۔ شہر میں رہنے والے روسیوں میں مزدوروں کی تعداد ۲۶ ہزار تھی جن میں تقریباً ۲۰ ہزار ریلوے مزدور تھے۔ منز ہالا جیسے مزدور کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی ریلوے مزدوروں کو کوئی مراعات حاصل نہیں تھیں۔ انہیں وہی تنخواہیں ملتی تھیں جو روس میں ان کے ہم کاروں کو دی جاتی تھیں۔ روسی ہنرمند اور مقامی غیر ہنرمند مزدوروں کی تنخواہوں میں فرق کو بنیاد بنا کر یہ نتیجہ نکالنا کہ وسطی ایشیا میں مراعات یافتہ روسی مزدور اشرافیہ موجود تھی، مزدور اشرافیہ کے تصور کے متعلق اپنی جہالت کا ثبوت دینا ہے۔ اگر وسطی ایشیا میں روسی مزدوروں کا تعلق مزدور اشرافیہ سے ہوتا تو پھر ان میں بے چینی کیوں ہوتی اور ان کی ہڑتالوں اور مظاہروں کا کیا جواز ہوتا؟ اگر سامراجی ملک کا بورژوازی اپنے نوآبادیاتی زائد منافع سے مزدور اشرافیہ کو خرید لیتا تھا تو یہ اشرافیہ نوآبادیاتی استحصال میں ایک نفیس وسیلے کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ریلوں میں جو انگریز کام کرتے تھے (نگراں اور افسر) انھوں نے نہ کبھی ہڑتال کی اور نہ کبھی مظاہرہ کیا۔

یہ دعویٰ کہ دیہات میں آباد ہونے والے تمام روسی دولت مند استحصال کرنے والے کسان تھے سچائی کے بالکل برعکس ہے۔ روسی آبادکاروں کے ایک اہم علاقے سیمی ریچیے کے اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ ان میں طبقاتی تفریق کا عمل جاری تھا۔ وہاں پرانی روسی آبادیوں میں ۱۱۹۵۹ گھرانے تھے جن کی آبادی ۸۵۹۱ ۷ تھی۔ ان میں ۱۰۵۳۱ روسی گھرانے تھے جن کی آبادی ۷۲۱۱ ۷ تھی اور ۱۴۲۸ غیر روسی جو ۶۴۷ ۷ نفروں کی آبادی پر مشتمل تھے۔ ۲۲۳۳ (۱۹۰۵ فیصدی) گھرانے (جن میں سے ۲۲۰۴ یعنی ۰ ۷ فیصدی روسی اور ۱۱۱۸ یعنی ۳۰ فیصدی غیر روسی) زمین سے بالکل محروم تھے۔ بے زمین والے اور ۵ دیسیاتین تک زمین کے مالک کسان گھرانوں کی تعداد صوبے کے تمام گھرانوں کے نصف کے برابر تھی۔ ۶۸ فیصدی گھرانے کاشت کے علاوہ دوسرے ذیلی کام بھی کرتے تھے۔ جو لوگ زرعی مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے ان کی تعداد

.۲۶۶۰ تھی۔۔ ۳۷۷ افراد صنعتوں میں کام کرتے تھے اور ۲۰۸۲ دست کاری میں۔ صوبہ سیر دریا کے ضلع چیمکینٹ میں بھی روسی کسان آباد تھے۔ ان میں سے ۳۵ فیصدی کسان گھرانے کھیت مزدوروں کی طرح کام کرتے تھے اور ۳۴ فیصدی میں۔ ماورائے کیسپین کے حاکم نے لکھا کہ روسی آباد کاروں کی مادی حالت، لوگوں کے درمیانہ طبقے سے بھی بدتر ہے۔ بارتولد بتاتا ہے کہ روسی کسان جنھوں نے زمین کزاکوں سے لگان پر لی تھی حکومت کی مخالفت کے باوجود چھوڑ کر چلے گئے۔

ہندوستان کے حالات مختلف تھے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں یورپی نسل کے ۹۰۶۰۸ لوگ رہتے تھے۔ ان میں سے ۵۹۶۹۲ فوج اور پولیس میں، ۳۹۷۲ انتظامیہ میں، ۳۵۰۷ تجارت میں، ۶۷۵۸ نقل و حمل میں، ۴۰۰۸ صنعت میں، ۱۴۳۵ معدنیات میں، ۳۰۶۹ مویشی کی افزائش نسل اور باغبانی میں اور ۴۰۱۲ مختلف پیشوں اور لبرل فنون میں کام کرتے تھے۔ مردم شماری کی رپورٹ میں ٹھوس طور پر یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کیا کام کرتے تھے لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ صنعت، معدنیات اور نقل و حمل میں یورپین چوٹی کے عہدوں پر فائز تھے اور جہاں تک کہ مویشیوں کی افزائش نسل اور باغبانی کا تعلق ہے تو وہ بڑے بڑے فارموں کے مالک تھے ان میں شاید ہی کوئی مزدور ہو۔ اسی طرح یورپی نسل کی جو عورتیں ہندوستان میں رہتی تھیں ان کی تعداد ۸۳۱۳ تھی۔ ان میں سے ۵۰۸۹ مختلف پیشوں اور لبرل فنون میں کام کرتی تھیں۔

وسطی ایشیا میں اشتراکی انقلاب ایسے مخصوص حالات میں ہوا جب قبل از سرمایہ داری کے تعلقات حاوی تھے۔ یہ عظیم اکتوبر اشتراکی انقلاب کا ایک اٹوٹ حصہ تھا اور ان واقعات کا تسلسل اور مزید ارتقا جو اکتوبر ۱۹۱۷ء میں پیٹروگراد اور ماسکو میں شروع ہوئے تھے۔ مرکزی روس میں اکتوبر انقلاب کی کامیابی اور روسی پرولیتاریہ کی امداد نے وسطی ایشیا میں انقلاب کی قیادت یقینی روسی پرولیتاریہ کے ہاتھ میں تھی جسے ترکستان کے محنت کشوں کا اعتماد اور حمایت حاصل تھی۔

اشتراکی روس کی امداد کے بغیر وسطی ایشیا میں انقلاب کامران نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ روسی مزدوروں نے وسطی ایشیا پر انقلاب عائد کیا۔ وسطی ایشیا

کے محنت کشوں نے اپنا معاملہ سمجھ کر انقلاب کا خیر مقدم کیا اور اسے برپا کرنے اور اس کی مدافعت میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اگر انقلاب کی جڑیں عوام الناس میں گہری نہ ہوں اور اسے باہر سے تھوپا جائے تو وہ کبھی دیرپا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا انقلاب تاریخی حادثے کے طور پر کامیاب ہو بھی جائے تو وہ طاقتور اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا کامیابی سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وسطی ایشیا کے عوام نے خود انقلاب کی راہ منتخب کی، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اس کی حاصلات کی مدافعت کی۔

۲۰ ویں صدی کی ابتداء سے زارشاہی اور مقامی بائیوں اور ملاؤں کے درمیان روسی پرولیتاریہ اور وسطی ایشیا کے مزدوروں اور دہقانوں کے اتحاد کے خلاف ساز باز شروع ہونے لگی تھی۔ مقامی عوام کی قومی بورژوازی سے علیحدگی ۷-۱۹۰۵ سے ہونے لگی اور ۱۹۱۶ء کی بغاوت تک مکمل ہو گئی۔ وسطی ایشیا کے قومی بورژوازی کا رول روسی سامراجی بورژوازی کے تحت کا رول تھا۔ چنانچہ اس نے عوام کے مفاد سے غداری کی۔ روس میں فروری ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی کامیابی نے نوآبادی ترکستان میں قومی تحریک آزادی کے لئے وسیع شاہراہیں کھول دیں۔ اس وقت ترکستان کے محنت کشوں کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ روسی پرولیتاریہ کی امداد سے قومی اور نوآبادیاتی استحصال سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور انھوں نے سیاسی اقدام منظم کرنا شروع کر دیئے۔ فروری انقلاب کے بعد کئی طبقاتی تنظیمیں قائم کی گئیں۔ مقامی محنت کشوں کی سوویتیں، کمیٹیاں اور یونینیں۔ ۱۹۱۷ء کے مئی کے آخر اور جون کے شروع میں مقامی محنت کشوں کی سوویتیں ظہور میں آئیں۔ ان کی تنظیم میں روسی پرولیتاریہ نے ہاتھ بٹایا۔ مقامی مزدور محاذ کے عقب میں کام کرنے کے بعد جب وطن لوٹے تو انھوں نے سب سے آگے بڑھ کر ان تنظیموں کی تشکیل میں حصہ لیا۔ ابتدا ہی سے مسلمان مزدوروں کے نمائندوں کی سوویتوں نے مقامی استحصال کرنے والوں کے خلاف مصمم جدوجہد کی۔ استحصال کرنے والے عناصر بھی "شورۂ اسلامیہ" اور "اتحاد علما" جیسی جماعتوں میں منظم تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ شروع شروع میں عوام کے ایک اچھے خاصے حصے کا اعتماد ان

جماعتوں پر تھا کیونکہ پسماندہ علاقوں میں مسجد کا ملّا سب سے اہم ذریعہ تبلیغ ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے سیاسی شعور اور علم کی روشنی پھیلتی ہے، علم کا مطلب صرف کتابی علم ہی نہیں ہوتا بلکہ جیسے جیسے طبقاتی شعور تیز ہوتا ہے تو وہ بھی آبادی کو ایک خاص قسم کا شعور اور علم کی دولت سے منور کر دیتا ہے چنانچہ جیسے جیسے ان علاقوں میں طبقاتی تضادات شدید ہوتے گئے ویسے ان کا اعتقاد ان علماء کی تنظیموں سے اٹھتا چلا گیا کیا ہمارے ہاں یہی عمل نہیں دہرایا جا رہا چنانچہ جب یہ حقیقت ہے کہ اکتوبر انقلاب کے دو موقع پہ طبقاتی قوتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہی تھیں ایک طرف وسطی ایشیا کا محنت کش، پسماندہ، غریب، بیمار، فاقہ زدہ محنت کش عوام تھے تو دوسری طرف امرا جاگیردار، ان کے حاشیہ بردار ملّا تھے چنانچہ انقلابی حالات سازگار تھے اور جیسے ہی پیٹروگراد اور روسی علاقوں میں انقلاب کا بگل بجا تو ان خطوں میں بھی اسی دور میں انقلاب کا لاوا پھٹ پڑا اور صدیوں کا پسماندہ علاقہ سوشلسٹ انقلاب کی زد میں آ گیا۔

کمیونسٹ اور قوموں
کا
حق خود ارادیت

وسطی ایشیا کی ریاستوں میں سوشلسٹ انقلاب کی کامیابیوں کی سب سے اہم وجہ روسی مزدوروں اور ان کی پالیسیوں پر ان ریاستوں کے محنت کشوں کا اعتماد بھی تھا لیکن یہ اعتماد کوئی ایک دن میں پیدا نہیں ہو گیا تھا بلکہ روسی مزدور طبقے نے اپنی کمیونسٹ پارٹی کے پرچم تلے جو مسلسل جدوجہد کی تھی اور جس پامردی سے انہوں نے اپنے اصولوں کے لئے قربانیاں دی تھیں اس نے ان خطوں میں زبردست اعتماد اور اعتقاد پیدا کر دیا تھا اور اس میں سب سے اہم رول بولشویک یعنی کمیونسٹ پارٹی کی قوموں کی خود اختیاری کے بارے میں پالیسیاں تھیں اور یہ پالیسیاں اور یہ وعدے انہوں نے کوئی انتخاب لڑنے کے لئے نہیں کئے تھے بلکہ قومی خود ارادیت کا جائزہ انہوں نے پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے لگایا تھا اور اس بنیاد پر انہوں نے زارشاہی پر تابڑ توڑ حملے کئے تھے اور ساتھ ہی ان روسی دانشوروں کو بھی بے نقاب کیا تھا جو وہ اپنے قومی تفاخر اور برتری کے جذبے سے مسحور تھے اور دوسری قوموں کو جاہل اور پسماندہ سمجھتے تھے ۔

حق خود اختیاری کے بارے میں سب سے پہلی قرارداد اور روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی بین الاقوامی کانگرس جو ۱۸۹۶ء میں لندن میں منعقد ہوئی تھی میں کہا گیا تھا ۔

”یہ کانگرس اعلان کرتی ہے کہ وہ ساری قوموں کے مکمل حقِ خود اختیاری کی تائید اور حمایت کرتی ہے، ان تمام ملکوں کے مزدوروں کے

لئے ہمدردی کا اظہار کرتی ہے جن کے گلے میں اس وقت فوجی، قومی یا کسی اور قسم کی استبدادیت کا جوا پڑا ہوا ہے اور یہ کانگرس ان سب ملکوں کے مزدوروں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ آئیں اور آکر دنیا بھر کے طبقاتی شعور رکھنے والے مزدوروں کی صفوں میں شامل ہو جائیں۔ وہ لوگ جو اپنے طبقاتی مفاد کو سمجھتے ہیں اور بین الاقوامی سرمایہ داری کی شکست اور بین الاقوامی سوشل ڈیموکریسی کے اصولوں کی جیت کے لئے ان کے شانہ بشانہ لڑیں۔"

اس کے بعد ۱۹۰۳ء جب روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی دو واضح گروپوں میں تقسیم ہوئی تو اس موقع پر بھی بولشویکوں نے اپنے پروگرام میں واضح طور پر اعلان کیا

روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی دوسری کانگرس یہ اعلان کرنا اپنا اولین فرض سمجھتی ہے کہ گرجا کی بالادستی کو ختم کیا جائے اور مذہب کی بنیاد پر بنائے ہوئے تمام قوانین جو آمریت اور مطلق العنانیت کو سہارا دیتے ہیں کو ختم کیا جائے اور ملک کو ایک جمہوری ریپبلک بنانے کی ضمانت دی جائے کہ :-

۱- بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابات کرائے جائیں، ہر وہ باشندہ مرد اور عورت جس کی عمر ۲۰ سال ہو کو ووٹ کا اختیار ہونا چاہیئے اور رائے شماری خفیہ ہو۔

۲- بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر عوامی نمائندے منتخب ہوں اور یہ نمائندے آئین تیار کریں اور ایک مجلس قانون ساز تشکیل کریں۔

۳- ان تمام علاقوں اور قوموں کو جہاں لوگ اپنے مخصوص عادات واطوار رکھتے ہیں ان کی آبادیاں خصوصی امتیازات کی حامل ہیں اور زبانیں مختلف ہیں ان کو مقامی طور پر خود انتظامی اور خود اختیاری کے وسیع اختیارات دیئے جائیں۔

۴۔ جماعتیں بنانے کی آزادی ملنی چاہیئے۔

۵۔ پریس آزاد ہونا چاہیئے، جلسے جلوس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔

۶۔ ہڑتال اور یونین سازی کا حق ہونا چاہیئے۔

۷۔ آمدورفت کی آزادی ہونی چاہیئے۔

۸۔ مذہب، نسل اور قومیت کی بنیاد پر تمام امتیازات کو ختم کیا جائے اور برابری کے اصولوں پر تمام شہریوں کو مساوی حقوق ملنے چاہیں۔

۹۔ مادری زبانوں کو مقامی اور ریاستی اداروں میں نافذ کیا جائے۔ سکولوں میں تعلیم مادری زبان میں دی جائے اور سرکاری احکامات مادری زبانوں میں جاری کیئے جائیں تاکہ عام لوگ ان کو سمجھ سکیں۔

۱۰۔ وفاق میں شامل تمام اقوام کو حق خوداختیاری حاصل ہونا چاہیئے۔

۱۱۔ شہریوں کے حقوق کی حفاظت ہونی چاہیئے اور انہیں ان کی خلاف ورزی کے خلاف عدالت میں رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔

۱۲۔ عدالتوں کے نظام کو جمہوری بنیادوں پر استوار کیا جائے اور ججوں کو عوام کی طرف سے باقاعدہ منتخب ہونا چاہیئے۔

۱۳ عوامی بنیادوں پر فوج کا قیام عمل میں آنا چاہیئے۔

۱۴۔ مذہب کا ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔

۱۵۔ تعلیم کو مذہبی توہم پرستی سے نجات دلائی جائے۔

۱۶۔ سولہ برس تک لڑکے لڑکیوں کو مفت تعلیم دی جائے اور تعلیم لازمی کی جائے مستحق بچیوں کو سرکاری طور پر خوراک، لباس اور کتابیں مہیا کی جائیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم عام کی جائے۔

یہ پروگرام ۱۹۰۳ء میں منظور ہوا پھر ۱۹۱۳ء میں لینن نے قوموں کے حق خوداختیاری کے موضوع کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم کے بادل یورپ پر منڈلا رہے تھے اور دوسری انٹرنیشنل میں جنگ کے بارے میں

ردّ یدہ کے سلسلے میں زبردست بحثیں ہو رہی تھیں اور اسی ضمن میں قوموں کے حق خود اختیاری کا موضوع بھی زبردست اہمیت اختیار کر گیا تھا اور روس کے اندر بھی اس موضوع پر بحثیں جاری تھیں چنانچہ اس موقع پر لینن نے پارٹی کے اخبار پراودا میں ایک مضمون لکھتے ہوئے کہا تھا۔

روس قومی اعتبار سے متعدد قوموں کا ملا جلا ملک ہے لیکن حکومت کی پالیسی جو زمینداروں جن کو بورژوازی کی حمایت حاصل ہے سر سے پاؤں تک بدترین قسم کی متعصب قوم پرستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے

روس کی قومیتوں کی اکثریت جو ملک کی آبادی کی اکثریت بھی ہے اس متعصب قوم پرستی کا تختہ مشق بنی ہوئی ہے اس کے علاوہ دوسری قومیتوں مثلاً پولش یہودی، یوکرینی، جارجیاں وغیرہ — کی اپنی بورژوا قوم پرستی بھی ہے اور یہ بورژوا قوم پرستی قومی جدوجہد یا قومی کلچر کے لئے جدوجہد کے ذریعے مزدور طبقے کا دھیان اس کے مہدا فرین اہمیت رکھنے والے کاموں کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہے۔

یہ چیز بہت ضروری ہے کہ سارے طبقاتی شعور رکھنے والے مزدور قومی سوال کی صاف اور واضح تعریف و ترتیب کریں اور اس کا صاف اور واضح حل نکالیں۔

یاد رکھنا چاہیئے جب بورژوا طبقہ آزادی کے لئے عوام کے پہلو بہ پہلو محنت کش جنتا کے پہلو بہ پہلو لڑ رہا تھا اس وقت وہ قوموں کی مکمل آزادی اور مکمل مساوات کا علمبردار تھا۔ ترقی یافتہ ملک — مثلاً سوئیزرلینڈ، بلجیم ناروے وغیرہ — ہمارے سامنے اس چیز کی مثال پیش کرتے ہیں کہ ایک سچے جمہوری نظام کے تحت آزاد قومیں کس طرح پر امن طریقے سے مل جل کر رہ سکتی ہیں یا پر امن طریقے سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔

اب بورژوا طبقہ مزدوروں سے خوف زدہ ہے اور وہ اپنے ملکوں کے بدترین رجعت پسندوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی فکر میں رہتا ہے وہ جمہوریت کے

ساتھ غداری کرتا ہے، ظلم و جبر یا قومی نابرابری کی حمایت کرتا ہے اور مزدوروں کو قوم پرست نعروں کی رشوت دیتا ہے۔

آج صرف پرولیتاریہ ہی قوموں کی سچی آزادی اور ساری قوموں کے مزدوروں کے اتحاد کا علم بردار ہے تاکہ مختلف قومیں اپنی سہولت کے مطابق آزادانہ، پرامن طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہ سکیں یا جب ضروری سمجھیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنی الگ ریاستیں قائم کر سکیں، اس چیز کے واسطے مکمل جمہوریت کی ضرورت ہے جن کی علمبرداری مزدور طبقہ کرتا ہے۔ کسی قوم یا زبان کو کوئی امتیازی حق بالکل نہیں ملنا چاہیئے! کسی قومی اقلیت پر خفیف سے خفیف ظلم و جبر یا اس کے ساتھ ذرا سی بھی ناانصافی نہیں ہونی چاہیئے، یہ ہیں مزدور طبقہ کی جمہوریت کے اصول۔ اس کے مقابلے میں سرمایہ دار اور زمیندار مختلف قوموں کے مزدوروں میں پھوٹ ڈالنے کے خواہشمند ہیں اور ساتھ ہی یہ ارباب اقتدار خود آپس میں بڑی صلح صفائی سے رہتے ہیں۔ مثلاً لاکھوں کروڑوں کے منافع والے کاروبار۔ اس میں سب قوموں کے سرمایہ دار شامل ہوتے ہیں اور یہ سب مل کر متحدہ کوششوں سے ساری قوموں کے مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں۔

طبقاتی شعور رکھنے والے مزدور تمام قوموں کے مزدوروں اور تمام تعلیمی، سیاسی، ٹریڈ یونین اور دوسری مزدور تنظیموں کے واسطے مکمل مساوات چاہتے ہیں۔ کیڈٹ حضرات یوکرینوں کی مساوات سے انکار کر کے یا اس کی اہمیت گھٹا کر ذلیل ہوتے ہیں تو ہونے دیجئے۔ ساری قوموں کے بورژوا قومی کلچر اور قومی فریضوں وغیرہ کے پرفریب فقروں سے اپنے دل کی تسلی کرتے ہیں تو کرنے دیجئے۔

مزدور قومی کلچر یا قومی تہذیبی خودمختاری کے متعلق میٹھی میٹھی تقریروں سے اپنی

صفوں میں پھوٹ نہیں پڑنے دیں گے تمام قوموں کے مزدور متحدہ اور دوستانہ طریقے سے اور مشترکہ تنظیموں کے ذریعے مکمل آزادی اور مکمل مساوات کا پرچم بلند کرتے ہیں جو سچے کلچر کی ضامن ہیں۔

تمام دنیا میں مزدور اپنے بین الاقوامی کلچر کی تخلیق کر رہے ہیں جس کی نیاری آزادی کے حامی اور ظلم و جبر کے مخالف ایک عرصے سے کر رہے تھے، پرانی دنیا کے مقابلے میں جو قومی ظلم و جبر، قومی مخاصمت اور قومی علیحدگی کی دنیا ہے، مزدور اپنی نئی دنیا بنا رہے ہیں جو تمام قوموں کے مزدوروں کی ایکتا کی دنیا ہے ایک ایسی دنیا ہے جس میں کسی امتیازی حق کی کوئی گنجائش نہیں ہے، انسان پر انسان کے خفیف سے خفیف ظلم و جبر کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہی اصول اور پالیسی تھی جس کا اندازہ ۱۹۱۷ کے انقلاب کے فوراً بعد دیکھنے میں آیا چنانچہ جو فرامین جاری ہوئے ان میں سب سے مقدم قوموں کے حق خود ارادیت اور امن سے متعلق فرمان کو رکھا گیا۔ یہ فرمان خود لینن نے تحریر کیا تھا اس لحاظ سے یہ ایک بے مثال دستاویز ہے اس فرمان میں واضح کیا گیا تھا کہ تمام عوام اور قوموں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر منصفانہ اور جمہوری امن قائم کیا جائے۔ اس میں بدیسی سرزمینوں کے الحاق کی مذمت کی گئی۔ فرمان میں کہا گیا کہ "عام طور پر جمہوریت پسندوں اور خاص طور سے محنت کش لوگوں کے تصور انصاف کے مطابق حکومت بدیسی سرزمینوں کا الحاق کرنے یا ان پر قبضہ کرنے کا یہ مطلب سمجھتی ہے کہ چھوٹی یا کمزور قوم کو اس کی باضابطہ، واضح اور رضا کارانہ مرضی اور خواہش کے بغیر بڑی یا طاقتور ریاست میں شامل کیا جائے، بلا لحاظ اس وقت کے جب یہ جبریہ شمولیت کی گئی، بلا لحاظ معین ریاست میں جبریہ شامل کی جانے والی قوم کے ارتقا یا پسماندگی کی سطح کے اور بلا لحاظ اس کے کہ یہ قوم یورپ میں رہتی ہے یا دور دراز سمندر پار ملکوں میں بستی ہے۔"

فرمان کا یہ حصہ حق خود ارادیت کے اصول کے جوہر، ماخیہ اور دائرہ عمل پر روشنی ڈالتا ہے۔ فرمان میں اعلان کیا گیا کہ یہ اصول نہ صرف محنت کش لوگوں بلکہ عام طور پر جمہوریت پسندوں کے تصور انصاف کے عین مطابق ہے۔ دراصل حق خود ارادیت کا نعرہ بورژوا جمہوری پروگرام

کا ایک جزو ہے۔ فرمان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی قوم کی سیاسی معاشی اور ثقافتی ارتقا کی سطح خواہ کچھ بھی ہو اسے اپنے معاملات کو سنبھالنے کے حق سے محروم کرنے کا بہانہ نہیں بنایا جاسکتا اس فرمان نے نوآبادکاروں کے اس دعوٰی پر شدید ضرب لگائی کہ وہ دوسری قوموں کو اس لئے غلام بناتے ہیں کہ وہ اپنے کاروبار چلانے کے اہل نہیں ہیں۔

اگرچہ امن کے فرمان میں قومی حق خودارادیت کے اصول کا اعلان بنیادی طور پر بین الاقوامی قانون کے ایک اصول کی طرح کیا گیا تھا لیکن محنت کش اور استحصال کئے جانے والے عوام کے حقوق کے اعلان نامے میں اسے سوویت ریاست کے اندر قومی ارتقا کے ایک اعلان نامے میں کہا گیا کہ سوویت حکومت سوویتوں کی پہلی اور دوسری کانگریسوں کی قوموں کے حق خودارادیت کے متعلق تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں اپنی قومی پالیسی مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی کرتی ہے:

۱۔ روس کے عوام کی مساوات اور اقتدار اعلیٰ۔

۲۔ روس کے عوام کا حق خودارادیت علیحدگی اور آزاد ریاستوں کے قیام کے حق سمیت۔

۳۔ تمام قومی اور مذہبی مراعات اور پابندیوں کی تنسیخ۔

۴۔ روس کے علاقے میں آباد قومی اقلیتوں اور نسلیاتی لسانی گروہوں کا آزاد ارتقا۔

یہ تھے وہ اصول جنھوں نے وسطی ایشیا ہی نہیں بلکہ ان تمام قوموں کے عوام اور محنت کشوں کے دل میں اس انقلاب کے لئے محبت، یقین اور اعتماد کی شمع روشن کی اور اس انقلاب نے ان سابقہ مظلوم قوموں کو نہ صرف علیحدہ ہونے کی آزادی دی بلکہ ساتھ رہنے پر آزاد اور بھرپور ارتقا کی بھی ضمانت دی اور اس ضمانت کو عملی شکل دینے کے لئے ایک وفاق قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ عوام کے حقوق کے اعلان نامے میں واضح طور پر کہا گیا تھا۔

روسی اشتراکی ریپبلک آزاد قوموں کے آزاد اتحاد کے اصول پر سوویت قومی ریپبلکوں کے وفاق کی طرح قائم کی گئی ہے۔"

یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیئے کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا وفاق تھا جس میں وفاق میں شامل ہونے والی ریاست کو اپنی شرائط خود طے کرنے کی آزادی دے دی گئی تھی چنانچہ اعلان میں کہا گیا۔

ہر قوم کے مزدوروں اور کسانوں پر اپنی نمائندہ با اختیار سوویتوں کی کانگرس میں

مرضی سے فیصلہ کرنے کی پوری پوری آزادی ہے اور وہ یہ طے کرنے کے پورے مجاز ہیں کہ آیا وفاقی حکومت اور دوسرے وفاقی اداروں میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نہیں اگر شامل ہونا چاہتے ہیں تو کن شرائط پر!

سوویتوں کی تیسری کل روسی کانگرس نے اس اعلان نامے کی تصدیق کی اور اسے روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کے آئین میں باقاعدہ ایک شق کے طور پر شامل کیا گیا چنانچہ اس طرح سے پہلی اشتراکی ریاست کا وفاقی ڈھانچہ وجود میں آیا لیکن یہاں اس موقع پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سوشلسٹ انقلاب کی پوری ماہیت میرے پڑھنے والوں کے ذہن میں آجائے اس کا کافی تفصیلی نقشہ میں نے اپنی کتاب "ارضِ جنت" میں لکھا ہے۔

یہ سوویت جس کا مطلب پنچایت ہے اصل میں ۱۹۰۵ء میں روسی مزدوروں کی انقلابی تحریک کے دوران وجود میں آئی تھیں، اس انقلاب کے دوران مزدوروں نے کارخانوں کا نظم و نسق سنبھالنے اور روزمرہ کا کام چلانے کے لئے اپنے لئے یہ جمہوری ادارے خود تخلیق کئے تھے اور یہ ادارے ان کے خون میں رچ بس گئے تھے، یہ ان کی انقلابی روایات کا ایک اہم ترین حصہ بن گئے تھے چنانچہ اشتراکی انقلاب کے بعد تمام طبقوں میں یہ سوویتیں قائم ہونے لگیں۔ یہ فوجی انقلابی کمیٹیاں، کارخانوں کی کمیٹیاں، مزدوروں کی انجمنیں، لال گارڈ کے دستے، یہ تمام ادارے دراصل مزدوروں، کسانوں، فوجیوں اور محنت کرنے والے اہل علم کی بے پناہ انقلابی تخلیقی قوت تھے چنانچہ سوویت اقتدار کے سب سے اعلیٰ ادارہ جو مجلسِ وزارت کہلایا تھا اسے عوامی کیسار بھی کہتے تھے نے ایک کمیشن قائم کرنے کا اعلان کیا یہ کمیشن "کل روس ہنگامی کمیشن" کے نام سے موسوم ہوا جس کو روسی "چیکا" کہتے تھے، اس کا کام یہ تھا کہ انقلاب کی مخالف اور دشمن طاقتوں کا پتہ چلائے اور ان کا قلع قمع کرے۔

ابتدائی دو تین مہینوں میں سوویت حکومت نے جو فرامین اور احکام جاری کئے وہ بنیاد تھے۔ اس نئے نظام کے اور یہ احکام سوویت حکومت اور کمیونسٹ پارٹی کے اداروں کی نشاندہی کر رہے تھے اور یہ بھی ان سے پتہ چلتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے نزدیک پرولتاریہ کی "آمریت" کا کیا مطلب ہے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۱۷ء کو فرمان جاری کیا گیا جس نے فوج کے پرانے ڈھانچے کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور اس کو جمہوری بنیاد پر استوار کرنے کا فیصلہ کیا گیا، فوج کے اندر تمام اختیارات افسروں اور جرنیلوں سے لے کر فوجیوں کی خود چنی ہوئی کمیٹیوں یعنی پنچایتوں کے حوالے کر دیئے گئے، اوپر کے تمام عہدے چناؤ پر چھوڑ دیئے گئے۔ پرانے تمام عہدے، خطابات اور تمغے سب یک قلم موقوف کر دیئے گئے۔

- ۱۰ جنوری ۱۹۱۸ء کو ایک فرمان جاری ہوا کہ مزدوروں اور کسانوں کی سرخ فوج بنائی جائے۔
- یکم فروری ۱۹۱۸ء کو فرمان جاری ہوا کہ مزدوروں اور کسانوں کا سرخ بحری بیڑہ قائم کیا جائے چنانچہ ان دو فرامین کے تحت رضاکارانہ بنیاد پر سرخ فوج وجود میں آنی شروع ہو گئی۔
- سوویت اقتدار نے اولین فرمانوں کے تحت زمینداری اور جاگیرداری کا قلع قمع کر دیا تھا۔
- ۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو فرمان جاری کیا گیا جس میں مرد اور عورت کی مساوات کو تسلیم کیا گیا اور سرکاری رجسٹر میں اندراج کے بغیر شادی ممنوع قرار دے دی گئی۔
- ۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کے فرمان کے مطابق کلیسا یا مذہبی اداروں کو حکومت اور سرکار سے بالکل لاتعلق کر دیا گیا اور تعلیم اور مدارس کو مذہبی اداروں یا کلیساؤں سے الگ کر دیا گیا۔
- اقتصادی میدان میں سوویت اقتدار نے ایک اشتراکی قلب ماہیت شروع کر دی۔ زمین کو قومی ملکیت بنانے یعنی کسانوں کی ملکیت قرار دینے کے فوراً بعد
- ۱۴ نومبر ۱۹۱۷ء کو پیداوار اور اس کی تقسیم پر مزدوروں کے کنٹرول کا

فرمان نافذ کر دیا گیا۔

- جہاں تک اسٹیٹ بنک کا تعلق تھا وہ انقلاب کے دن، ۷ر نومبر ۱۹۱۷ء ہی کو قومی تصرف میں لے لیا گیا تھا۔
- اس کے بعد کارخانوں کو بھی بالخصوص ان کارخانوں کو جن کے مالکان نے انقلاب کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی تھیں سرکاری کنٹرول میں لے لیا گیا۔
- ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو ملک کی اقتصادی زندگی کی سربراہی اور رہنمائی کے لئے قومی معیشت کی ایک اعلیٰ کونسل کا وجود عمل میں لایا گیا۔
- ۱۴ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو کل روس مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے تمام پرائیویٹ بنکوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس طرح سے سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ سے ایک اور ہتھیار چھین لیا گیا۔
- ۲۱ر جنوری ۱۹۱۸ء کو ایک فرمان جاری کیا گیا جس کے تحت تمام غیر ملکی اور ملکی قرضے جو زار کی حکومت نے اور سرمایہ داروں کی عارضی حکومت نے جاری کئے تھے یا لئے تھے وہ یک قلم منسوخ کر دیئے گئے۔
- ۲۲ر اپریل ۱۹۱۸ء کو غیر ملکی تجارت اور ٹرانسپورٹ کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔

سوویت روس کی انقلابی حکومت جو سماجی اور معاشی تبدیلیاں لا رہی تھی ان تبدیلیوں کو پائیدار اور مستحکم بنانے کے لئے کل روس پیمانے پر سوویتوں کی تیسری کانگریس طلب کی گئی، یہ کانگریس ۲۳ر جنوری ۱۹۱۸ء سے شروع ہو کر ۳۱ر جنوری ۱۹۱۸ء تک چلتی رہی۔ اسی کے ساتھ انہی دنوں کسانوں کے نمائندوں کی بھی کل روس تیسری کانگریس بلائی گئی اور ۲۶ر جنوری ۱۹۱۸ء کو دونوں کانگریسوں کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کے ادغام سے ملک کے تمام حصوں میں کسانوں کے نمائندوں کی سوویتوں اور مزدوروں کے نمائندوں کی سوویتوں کے مل جانے سے انقلابی عمل بہت تیز ہو گیا اور اس کی بدولت سوویت ریاست کی سیاسی بنیاد اور پرولتاریوں کی امریت کی بنیاد زیادہ وسیع اور مضبوط ہوتی چلی گئی، صرف یہی

نہیں بلکہ ان کانگرسوں کے ادغام کے موقع پر "محنت کش اور دبے اور کچلے ہوئے لوگوں کے حقوق کا اعلان" بھی منظور کیا گیا جسے لینن نے تیار کیا تھا۔ اس اعلان کی رو سے روس کو سوویتوں کی ری پبلک قرار دے دیا گیا، تمام اختیارات سوویتوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور باقاعدہ تسلیم کیا گیا کہ یہ سوویت اور پنچائتی راج ہی پرولتاریوں کی ڈکٹیٹرشپ کی سرکاری شکل ہے۔ اس اعلان میں سوویت اقتدار کے اغراض و مقاصد بھی کھول کر بیان کر دیئے گئے۔

- سوویت اقتدار کو انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کی جتنی بھی شکلیں ہیں ان سب کو مٹا دینا ہے۔
- سماج جو طبقوں میں تقسیم ہے اس تقسیم کو ختم کرنا ہے۔
- جو طبقے دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں انہیں بے رحمی سے کچل دینا ہے۔
- سماج کے اشتراکی طرز پر تعمیر کی بنیاد رکھنا اور پھر مکمل اشتراکیت کی تعمیر۔

اسی کانگرس میں پورے ملک کو "سوویت وفاقی سوشلسٹ ریپبلک" قرار دیا گیا۔

ان انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جو سوویت روس کی سیاسی اور معاشی زندگی میں رونما ہو رہی تھیں۔ سوویت اقتدار نے کلچر کے میدان میں بے پناہ تبدیلیاں کیں انہوں نے کلچر اور آرٹ عام مزدوروں اور کسانوں کے لئے عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ محنت کشوں کی کلچر اور آرٹ سے محبت اس وقت تک اجاگر نہیں ہو سکتی جب تک ان میں کلچر، آرٹ سینما، رقص، موسیقی، ادب اور شاعری سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کا ملکہ نہ ہو اب تک تہذیب اور تمدن کے ان شعبوں پر اوپر کے طبقوں کا تسلط تھا وہ اس طرح سے کہ تعلیم صرف ان کو حاصل تھی، پیسہ صرف ان طبقوں کے پاس تھا اس لئے یہ اوپری طبقے اس مصوری اس رقص سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے اور رقص گاہوں میں بھاری بھرکم ٹکٹ خرید کر بھی جا سکتے تھے لیکن ان کے الٹ محنت کش ایک طرف سے عاری تھا اس لئے ان کا ذوق حسن اور اس سے لطف اندوز ہونے کے شعور کی سطح اتنی بلند نہ تھی کہ وہ پشکن کی شاعری ہو یا

مصوری اور سنگ تراشی کے بہترین نمونے ہوں ان سے خط اٹھا سکیں۔ اس لئے سودیت حکومت نے سب سے پہلے محنت کشوں پر سکولوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے چوپٹ کھول دیئے، دھڑا دھڑ لائبریریاں کھلنے لگیں، تھیٹر اور عجائب گھر قائم کئے گئے اور ہر کارخانے اور کھیت میں تعلیم بالغان کے مرکز قائم ہوئے اور اس طرح سے ان پڑھ بالغوں میں سے جہالت دور کرنے کی مہم پورے زور وشور سے شروع کی گئی۔ پریس، اخبارات، ادب، آرٹ اور علم و فن و تہذیب کے سارے کارنامے محنت کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دیئے گئے، چنانچہ بالشویکوں نے اعلان کیا۔

"چاہے دوسرے اخراجات کم کر دیئے جائیں لیکن تعلیم عامہ پر اخراجات زیادہ ہونے چاہئیں۔ تعلیم کا فیاضانہ بجٹ ہر قوم کے لئے عزت و شہرت کا باعث ہوتا ہے ہمارا پہلا مقصد جہالت کے خلاف جدوجہد ہونا چاہیئے۔"

ہر جگہ سکول کھولے گئے حتیٰ کہ محلوں، پارکوں، کارخانوں اور کھیتوں میں بھی ان کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوتا اور بڑے بڑے کتبے آویزاں ہوتے کہ "بچے۔ دنیا کی امید ہیں" لیکن ان سکولوں میں لکھو کھہا بچے آنے شروع ہو گئے ان میں ایسے بچے بھی تھے جن کی عمریں چالیس اور ساٹھ سال کے درمیان تھیں، ان میں بوڑھی عورتیں بھی تھیں اور سفید ریش کسان بھی جو اپنے پوتوں پڑپوتوں کے ہمراہ ان نئے سکولوں میں علم کی تشنگی بجھانے جوق در جوق آ رہے تھے اور ایک پوری قوم اور پورا ملک لکھنا پڑھنا سیکھ رہا تھا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب انقلاب دشمن طاقتیں اس انقلاب کو تباہ کرنے کے لئے، اس کو ملیامیٹ کرنے کے لئے توپ و تفنگ سے لیس حملہ آور ہو رہی تھیں، لیکن ان حاکموں نے یہ نہیں کہا تھا کہ سکول بند کر دو، تعلیم دینا روک دو، انقلابی اقدام سے ہاتھ کھینچ لو اور اپنے دشمن سے نبرد آزما ہو لو بلکہ انہوں نے کہا کہ دشمن سے نپٹنے کے لئے ہم کو انقلابی اقدام اور تیز کر دینے چاہئیں۔ یہ بنیادی فرق ہوتا ہے سرمایہ دار اور زمیندار حاکموں میں اور مزدوروں کسانوں کی حکومت کے رہنماؤں میں۔

اس کھچاؤ اور جنگی فضا میں ایک طرف انقلابی اعلانات شائع ہو رہے تھے لیکن ساتھ ہی تھیٹر، رقص اور موسیقی کے پروگراموں میں لوگوں کو بلایا جا رہا تھا، ان کے اشتہارات دیواروں

پر چسپاں ہو رہے تھے، دیواروں، کھیتوں کی باڑوں پر ہر جگہ دنیا بھر کے انقلابیوں کی سوانح عمریاں اشتہاروں کی صورت میں چسپاں ہوتیں، صحت، آرٹ اور سائنس کے بارے میں طویل مضامین بھی اشتہاروں کی صورت میں نظر آتے، اہل علم کو کہا جاتا کہ وہ کارخانے اور کھیتوں میں جائیں اور عام لوگوں کو پڑھائیں، لکھائیں ان کا شعور تیز کریں۔ صرف یہی نہیں کہ بالشویک اور کمیونسٹ محنت کشوں کے آئینی اور تہذیبی شعور کی سطح ہی بلند کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ان محنت کشوں کے درمیان سے بیماری اور معذوری بھی دور کرنی چاہیے چنانچہ اس مقصد کے لئے کئی فرمان جاری کئے گئے مثلاً:

- آٹھ گھنٹے کا کام اور اس کے متعلق قانون۔
- ہر صنعت اور کارخانے کو ہر دو سو مزدور عورتوں پر زچہ بچہ کے لئے ایک بستر فراہم کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔
- بچے کی پیدائش سے آٹھ ہفتے پہلے اور آٹھ ہفتے بعد تک عورت کو کام سے با تنخواہ چھٹی کا حق تسلیم کیا گیا۔
- مختلف علاقوں میں بچہ جننے والی خواتین کے آرام کے لئے "مادر محل" قائم کئے گئے۔
- اب امیروں کی بجائے پھلوں، دودھ ایسی نعمتوں پر اولیں حق بچوں کا تسلیم کیا گیا اور سکولوں میں دودھ اور پھل مہیا کئے جانے لگے۔
- رہائشی مکانات کے قانون کے مطابق کسی امیر کو دس یا بیس کمروں کا مکان یا ایک سے زیادہ مکان رکھنے کا حق چھین لیا گیا۔
- ہر بچے کے حلالی ہونے کا حق تسلیم کیا گیا اور حرامی ہونے کا کلنک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

یہ سب اقدام یاد رہے آج سے ساٹھ برس پہلے کئے گئے، اس وقت انسانوں کے حقوق کے بارے میں سرمایہ دار اور مغربی جمہوریتوں کے نام لیواؤں کے ممالک میں کیا ہو رہا تھا ذرا خدا اور اس پر دھیان دیجیے، میرے روسی عالم دوست اس پر اصرار کر رہے تھے،

اور یہ سچ بھی ہے دراصل سوویت روس کے بارے میں ہمارے ہاں کے عالم فاضل بھی چونکہ نہیں پڑھتے اور ان کے اعصاب پر مغربی اخبارات کا پروپیگنڈا اتنا حاوی ہوتا ہے کہ وہ ان عالموں کی روح کا حصہ بن جاتا ہے اور وہ تصویر کا دوسرا رخ جاننے اور سمجھنے کے لئے اکثر تیار نہیں ہوتے اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مغرب کا پروپیگنڈہ ان کی یہ صلاحیت ہی سلب کر لیتا ہے۔

ان معاشی۔ سماجی اور تہذیبی اقدام اور تبدیلیوں نے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں" رجعت پسند سرکاری ملازمین اور نوکر شاہی کے کل پرزوں اور انقلاب دشمن جماعتوں کی طاقت کو ہلا کر رکھ دیا اور جو کارخانہ دار اور زمیندار اپنی املاک یعنی کارخانوں اور زمینوں سے محروم ہوئے تھے اور وہ گھسر پھسر کے ذریعے عوام کو انقلاب کے خلاف ورغلانے اور ان کو توڑ پھوڑ پر مائل کرنے میں مصروف تھے بلکہ تو تہنا رہ گئے تھے ادھر لینن اور کمیونسٹ پارٹی نے نوکر شاہی کی تمام کلیدی اسامیوں پر منجھے ہوئے کمیونسٹوں کو تعینات کرنا شروع کر دیا جس سے عوام میں اور اعتماد بڑھا چنانچہ ان حالات نے وسطی ایشیا کی قوموں کے محنت کشوں اور غریب آبادی کو یقین و اعتماد بخشا اور انہوں نے اپنے ہاں کے امرا اور ان کے حاشیہ بردار ملاؤں کو مار بھگایا لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اس عمل میں، اس یقین و اعتماد کے پیدا کرنے میں کتنی محنت، کتنی ریاضت اور کتنا مسلسل پراپیگنڈہ درکار ہے چنانچہ لینن نے اس دور میں دن رات کمیونسٹوں کو اسی طرف متوجہ رکھا اور قدم قدم پر غلطیاں کرنے والوں کو برملا ٹوکا چنانچہ لینن نے روسی کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں کانگرس جو مارچ ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوئی تھی میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہمارے یہاں بشکیری، قرغیزی اور دوسری بہت سی قومیتیں بستی ہیں اور ان کو تسلیم کرنے سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ ہم سابق روسی سلطنت کی حدود میں رہنے والی کسی ایک بھی قومیت کو تسلیم کرنے سے انکاری نہیں ہو سکتے۔ ہم فرض کیئے لیتے ہیں کہ ہماری مدد سے بشکیری اپنے لوٹنے والوں کا تختہ الٹ دیں گے۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب انقلاب نے پختگی اور تکمیل کی حدیں چھو لی ہوں۔ اور اس کام میں بہت پھونک پھونک

کر قدم رکھنا ہوگا تاکہ یہ اپنی دخل اندازی پرولتاریہ کی بورژوازی سے علیحدگی اور امتیاز کے اس عمل کی رفتار الٹی اور سست نہ کر دے جسے ہم کو تیز کرنا چاہیئے۔ تو ہمیں قرغیزوں، ازبکوں، تاجکوں اور ترکمانیوں کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے جو آج تک اپنے ملاؤں کے اثر میں ہیں؟ یہاں روس میں، لوگوں کو پادریوں سے اتنے عرصے سے سابقہ پڑتا رہا تھا کہ انہوں نے ان پادریوں کی طاقت کا قلع قمع کرنے میں ہماری مدد کی۔ لیکن پھر بھی آپ دیکھتے ہیں کہ سول میرج کا قانون کس قدر سستی سے جڑ پکڑ رہا ہے۔ تو ہم ان قوموں کے پاس جا کر کہہ سکتے ہیں۔ "ہم تمہارا استحصال کرنے والوں کا تختہ الٹ دیں گے"؟ نہیں کیونکہ یہ تو میں پوری طرح اپنے ملاؤں کے اثر میں ہیں ہمیں چاہیئے کہ زیر بحث قوم میں پرولتاریوں کی بورژوا عناصر سے ناگزیر علیحدگی اور امتیاز کا اور اس قوم کی نشو و نما کا انتظار کریں۔

کامریڈ بخارین انتظار کے قائل نہیں ہیں۔ وہ تو بے صبر ہوئے جا رہے ہیں: "ہم کیوں انتظار کریں؟ جب خود ہم نے بورژوازی کا تختہ الٹ دیا۔ سوویت حکومت کا اور پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ کا اعلان کر دیا تو ہم یہ طرز عمل کیوں اختیار کریں؟" یہ بات ابھارنے اور جوش دلانے والی اپیل کا سا اثر رکھتی ہے، اس میں ہمارے راستے کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے پروگرام میں صرف یہی ایک بات کہیں تو وہ پروگرام کے بجائے اعلان ہو جائے گا ہم سوویت حکومت اور پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ کا اعلان ضرور کریں اور بورژوا طبقے کے لئے اپنی بے اندازہ حقارت کا اظہار بھی بھلے ہی کریں۔ اور وہ ایک بار نہیں ہزار بار اس کا مستحق ہے لیکن حقیقت میں جو چیز موجود ہے اپنے پروگرام میں تو ہمیں اسی کو انتہائی صحت اور احتیاط کے ساتھ سامنے لانا چاہیئے۔ اس وقت ہمارا پروگرام ناقابل تردید ہوگا۔

ہمارا نقطہ نظر سو فی صدی طبقاتی نقطہ نظر ہے۔ ہم نے اپنے پروگرام میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس وقت سے کر اب تک ہونے والے تمام واقعات کا اعتراف ہے جب ہم نے قوموں کے حق خود اختیاری کے بارے میں عام طور پر لکھا تھا۔ اس وقت کسی پرولتاری ری پبلک کا وجود نہیں تھا۔ پرولتاری ری پبلکوں کے وجود میں آنے کے بعد ہی اور جس طرح وہ وجود میں آئیں صرف اس حد تک ہم نے وہ سب کچھ لکھا تھا۔ اس وقت کسی پرولتاری ری پبلک کا

وجود نہیں تھا۔ پرولتاری ری پبلکوں کے وجود میں آنے کے بعد ہی اور جس طرح وہ وجود میں آئیں صرف اس حد تک ہم وہ سب کچھ لکھ سکے جو یہاں اس وقت موجود ہے۔ یعنی "سودیت قسم کی ریاستوں کا وفاق" سودیت قسم ابھی روس کی سودیتوں کا ہم معنی نہیں ہوا ہے لیکن سودیت قسم بین الاقوامی ہوتی جا رہی ہے اور ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے ایک قدم آگے جانا، سر مو تجاویز کرنا بھی غلط ہوگا اور چونکہ غلط ہوگا اس لئے ہمارے پروگرام کے لئے ناموزوں ہوگا۔

ہم کہتے ہیں کہ کوئی زیر بحث قوم قرون وسطی کے نظام سے نکل کر بورژوا جمہوریت اور بورژوا جمہوریت سے گزر کر پرولتاری جمہوریت کی سمت بڑھنے کی کس منزل میں ہے، اس چیز کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اور یہ قطعی صحیح بات ہے۔ ساری قوموں کو خود اختیاری کا حق ہے۔ خاص طور پر ہوٹن ٹوٹس اور بش مین کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دنیا کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت غالباً اس کا نو بٹہ دس حصہ یا شاید پچانوے فی صد حصہ اس زمرے میں آ جاتا ہے۔ کیونکہ سبھی ملک یا تو قرون وسطی کے نظام سے نکل کر بورژوا جمہوریت کے میدان میں قدم رکھ رہے ہیں یا بورژوا جمہوریت سے گزر کر پرولتاری جمہوریت کے میدان میں۔ یہ راستہ اٹل اور ناگزیر ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس سے آگے کچھ کہنا غلط ہوگا اور غلط اس لئے ہوگا کہ حقیقت میں اس وقت جو کچھ موجود ہے وہ اس پر مبنی نہیں ہوگا۔ قوموں کی خود اختیاری کو مسترد کرنا اور محنت کشوں کی خود اختیاری کو اس کی جگہ دے دینا غلط ہوگا کیونکہ اس قسم کا نقطۂ نظر اس چیز کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ قوموں کے اندر پرولتاریہ کے بورژوازی سے علیحدہ ممیز ہونے کا راستہ کس قدر پیچ در پیچ ہے اور اس راہ میں کتنی کٹھنائیاں ہوتی ہیں۔ جرمنی میں اس کی نوعیت ہمارے ملک سے بالکل مختلف ہے۔ بعض لحاظ سے وہاں یہ عمل ہمارے ملک سے زیادہ تیز رفتار ہے اور بعض اعتبار سے ہمارے یہاں کی بہ نسبت زیادہ سستی اور زیادہ خون خرابے کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں کسی ایک پارٹی نے بھی سودیتوں اور آئین ساز مجلس کو ملانے کے انتہائی بھونڈے اور مکروہ خیال کو نہیں اپنایا۔ لیکن بہر حال ہمیں ان قوموں کے پہلو بہ پہلو

رہتا ہے۔ سارے کے سارے شائڈ مال پرست تو ابھی سے کہنے لگے ہیں کہ ہم جرمنی کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ محض بکواس ہے، لغویت ہے۔ لیکن بورژوا طبقے کے اپنے الگ مفاد ہیں، اس کے اپنے اخبار رسالے ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں چیخ چیخ کر دنیا سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اور ولسن اپنے فائدے کے لئے اس چیز کو ہوا دے رہا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ بالشویکوں کے پاس بہت بڑی فوج ہے اور یہ بالشویک جرمنی کو فتح کر کے وہاں اپنے بالشویزم کا بیج بونا چاہتے ہیں۔ جرمنی میں بہترین فرزندوں کو کمیونسٹوں کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ مزدوروں سے کہا جاتا ہے: ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو کہ بالشویکوں کی کیا حالت ہے! اور یہ واقعہ ہے کہ ہم اپنے حالات کو بہت اچھا نہیں کہہ سکتے۔ سو جرمنی میں ہمارے دشمن اس دلیل سے جنتا کو متاثر کرتے ہیں کہ روس کی طرح جرمنی میں بھی پرولتاری انقلاب اسی بدنظمی اور طوائف الملوکی کو جنم دے گا۔ ہماری بدنظمی اور انتشار ایک طویل مرض ہے۔ اپنی پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کی تعمیر میں ہمیں بڑی بھاری کٹھنائیوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جس وقت تک بورژوا یا پیٹی بورژوا طبقہ، بلکہ جرمن مزدوروں تک کا ایک حصہ، اس ہوے سے سہما ہوا ہے کہ "بالشویک تشدد اور زبردستی کے ذریعے اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں" اس وقت تک "محنت کشوں کی خود اختیاری" کا نعرہ کسی کام نہیں آ سکتا۔ ہمیں اس طرح کرنا چاہیئے کہ جرمن سوشل غدار یہ نہ کہہ سکیں کہ بالشویک تو اپنا مکمل نظام ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں جو گویا سرخ فوج کی سنگینوں کی مدد سے برلن لایا جا سکتا ہے اور اگر قوموں کی خود اختیاری کے اصول کو ٹھکرا دیا گیا تو یہی انجام ہوگا۔

ہمارے پروگرام میں محنت کشوں کی خود اختیاری کا تذکرہ نہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ غلط بات ہوگی۔ پروگرام میں اسی چیز کا تذکرہ ہونا چاہیئے جو حقیقت میں موجود ہے چونکہ مختلف قومیں قرون وسطی سے بورژوا جمہوریت اور بورژوا جمہوریت سے پرولتاری جمہوریت کے راستے کی مختلف منزلوں پر ہیں اس لئے ہمارا پروگرام سو فی صدی صحیح ہے۔

ہمارے ملک نے اس راہ میں بہت چکر کھائے ہیں۔ ہر قوم کو حق خود اختیاری حاصل ہونا چاہیئے،

اور یہ چیز محنت کشوں کی خود اختیاری کو زیادہ سہل بنا دے گی۔ فن لینڈ میں پرولتاریہ کے بورژوازی سے علیحدہ اور ممیز ہونے کا عمل حیرت انگیز حد تک صاف، پرزور اور دور رس ہے۔ بہرحال وہاں جو تبدیلیاں ہوں گی ان کی نوعیت وہ نہیں ہوگی جو ہمارے یہاں ہے۔ اگر ہم یہ اعلان کر دیتے کہ ہم فنلش قوم کو تسلیم ہی نہیں کرتے، ہم تو فقط فن لینڈ کے محنت کشوں کے وجود کو مانتے ہیں تو یہ سراسر حماقت ہوتی۔ جو چیز حقیقت میں موجود ہے اس کے وجود سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود ہی زبردستی ہم سے اپنے وجود کا اعتراف کرالے گی۔ پرولتاری اور بورژوا طبقوں کی علیحدگی اور امتیاز ہر ملک میں اس کے اپنے مخصوص انداز سے بڑھ رہا ہے۔ یہاں ہمیں بے حد پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ ہمیں مختلف قوموں کے سلسلے میں خاص طور پر محتاط رہنا چاہیئے کیونکہ کسی قوم کی بے اعتباری سے بدتر چیز کوئی نہیں ہوسکتی۔ پولینڈ میں پرولتاریہ کی خود اختیاری کا عمل جاری ہے۔ لیجئے یہ ہمیں وارسا کے مزدوروں کے نمائندوں کی سودیت کی ساخت کے سلسلے میں کچھ اعداد و شمار: پولش سوشل غدار۔ ۳۳۳، کمیونسٹ — ۲۹۷ — اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے انقلابی کلنڈر کا اکتوبر وہاں کچھ بہت دور نہیں ہے۔ وہاں اس وقت بس اگست یا ستمبر ۱۹۱۷ء سمجھ لیجئے۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی ایسا فرمان جاری نہیں ہوا ہے کہ دنیا کے سارے ملکوں کو بالشویک انقلابی کلنڈر کے مطابق چلنا چاہیئے اور اگر کوئی ایسا فرمان جاری ہوا بھی ہوتا تب بھی اس پر عمل نہ کیا جاتا۔ دوسرے اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پولش مزدوروں کی اکثریت کا نقطہ نظر، جو ہمارے مزدوروں سے زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ مہذب ہیں سوشل حفاظت وطن اور سوشل وطن پرستی ہے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔ ہم یہاں محنت کشوں کی خود اختیاری کی بات نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس علیحدگی اور امتیاز کو بڑھانے اور پھیلانے کے لئے پرچار کرنا چاہیئے۔ اور ہم یہی کر رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس بارے میں ذرہ برابر شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس وقت ہمیں پولش قوم کی خود اختیاری کو تسلیم کرنا ہی ہے یہ بات صاف ہے۔ پولینڈ میں پرولتاری تحریک وہی راستہ اختیار کر رہی ہے جو ہماری پرولتاری تحریک نے کیا تھا۔ یعنی پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ کا راستہ — لیکن اس کا طریقہ وہ نہیں ہے

جو روس میں تھا۔ پولینڈ میں مزدوروں کو یہ کہہ کہہ کر ڈرایا سمہایا جا رہا ہے کہ وہی ماسکو والے اور مہاروسی جنہوں نے ہمیشہ پولش قوم پر ظلم اور زیادتیاں کی ہیں، آج اپنے مہاروسی شاوزم پر کمیونزم کی چھاپ لگا کر اسے پھر پولینڈ پر مسلط کرنا چاہ رہے ہیں۔ کمیونزم کبھی زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں نے ایک بہت ہی اچھے پولش کمیونسٹ ساتھی سے کہا "آپ لوگوں کا طریقہ ہم سے مختلف ہوگا، تو انہوں نے جواب دیا: نہیں ہم کریں گے تو وہی جو آپ لوگوں نے کیا مگر بہتر طور پر"۔ اس بات پر مجھے قطعی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیں چاہیئے کہ ان کے لئے ہمارے سوویت اقتدار سے بہتر سوویت اقتدار قائم کرنے کی اس چھوٹی سی خواہش کی آسودگی کے موقعے مہیا کریں۔ ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ وہاں حالات کی نوعیت ایک مخصوص قسم کی ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے "قوموں کا حق خود اختیاری مردہ باد! ہم صرف محنت کش جنتا کو حق خود اختیاری عطا کریں گے"۔ ایسی خود اختیاری بڑی پیچ در پیچ اور کٹھن راہوں سے گزرتی ہے۔ اور اس وقت اس کا وجود صرف روس میں ہے ہمیں دوسرے ملکوں کے ارتقا کی ہر ہر منزل کی پیش بینی تو ضرور کرنی چاہیئے لیکن ماسکو سے کسی قسم کے فرمان ہرگز جاری نہ کرنے چاہئیں۔"

وسطی ایشیا کی جمہوریتوں کی طرف پہلا قدم

کمیونسٹ عملی انسان ہوتے ہیں وہ خیالوں کی دنیا میں نہیں رہتے، جس وقت سوشلسٹ انقلاب ۱۹۱۷ء میں برپا ہوا تو اس وقت وسطی ایشیا میں قومی ریاستیں وجود میں نہیں آئی تھیں بلکہ زار شاہی نے انتظامی سہولتوں کے لئے پورے وسطی ایشیا کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا حالانکہ اس تقسیم سے کوئی انتظامی سہولت بھی نہ تھی۔ بہر حال ایک تو ترکستان تھا، ایک بخارا اور ایک خیوا۔ ان تمام انتظامی حصوں میں کئی ایک قومیں آباد تھیں اس لئے قومی اتحاد کے لئے از سر نو تنظیم کی ضرورت تھی اور اس کیلئے وقت درکار تھا۔ ان ابتدائی دنوں میں سر فہرست کام تو انقلاب کو بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے محفوظ کرنا تھا ہی نہیں بلکہ ان دنوں میں مختلف رجحانات اور متصادم رفتار ایک دوسرے سے دست و گریبان بھی ہو رہے تھے چنانچہ ان شدید طبقاتی جدوجہد کے غیر معمولی پیچیدہ حالات میں ۱۵ نومبر ۱۹۱۷ء کو مزدوروں اور سپاہیوں کے نمائندوں کی سوویتوں کی تیسری علاقائی کانگرس تاشقند میں شروع ہوئی اور یہ کانگرس مسلسل ایک ہفتہ جاری رہی اور اسی زمانے میں تاشقند میں ہی رجعت پسندوں نے مسلم کانگرس کا اجلاس طلب کیا اس کانگرس کے شرکا میں مقامی زمیندار جو قوم پرستی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے ان کے ہمنوا دانشور اور رجعت پرست ملاؤں کے نمائندے شامل تھے۔

اس مسلم کانگرس نے ۱۷ نومبر کے اجلاس میں اقتدار محنت کشوں کی سوویتوں کے حوالے کرنے کی زبردست مخالفت کی اور ملاؤں کے نمائندے شیر علی اور

اور روسی بورژوازی پر مشتمل علاقائی ادارے تشکیل دیئے جائیں اور ان روسی اور مسلمان نمائندوں کو اقتدار سونپا جائے لیکن اس کانگریس کے مقابلے میں محنت کشوں کی سودیتوں کی کانگریس نے کثرت رائے سے ایک اعلان نامہ مرتب کیا جس میں ترکستان میں سوویت اقتدار کے قیام کا واضح طور پر اعلان کیا گیا تھا اور اس اقتدار میں مقامی بورژوا قوم پرستوں، ملاؤں اور سمجھوتے باز اور ابن الوقت روسی گروہوں کو اقتدار میں شریک کرنے کی تمام تجاویز کو قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ ان عناصر کو بھی اس کانگریس میں بے نقاب کیا گیا جنہوں نے سرمایہ داروں کی عارضی حکومت کی حمایت کی تھی، یا جو انقلاب کے خلاف صف آرا ہوئے تھے اور انقلابی جمہوریت سے غداری کی تھی۔

رجعت پسندوں نے اپنی شکستوں کا بدلہ چکانے کے لئے زبردست پراپگنڈہ شروع کیا کہ بولشویک، کمیونسٹ مذہب کے مخالف ہیں اور اس نعرے پر عوام کو سوویت اقتدار کے خلاف منظم کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں چنانچہ نومبر ۱۹۱۷ء کے آخر میں ہی بورژوا قوم پرستوں نے سوویت اقتدار کی کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی تھی جب سودیتوں کی تیسری کانگریس نے اختیارات بورژوا قوم پرستوں کو اختیارات سونپنے سے انکار کر دیا تو توقند میں مسلم کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اس کے روح رواں ازبک، قزاخ، تاجک اور قرغیزی بورژوا قوم پرست تھے یہ تمام لوگ "شورہ اسلامیہ علما" وغیرہ تنظیموں میں منظم تھے ان میں غریب لوگوں کا کوئی نمائندہ موجود نہ تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان قسطوں کے اوپری طبقوں میں قسم قسم کے نظریات اور افکار کام کر رہے تھے، بعض اتحاد اسلامی کے حامی تھے اور روس میں بسنے والے تمام مسلمانوں کو ایک واحد متحد قوم قرار دیتے تھے ان کے خیال میں روس کے تمام مسلمانوں کے مفادات یکساں اور مشترک ہیں پھر کچھ لوگ ترکوں کے اتحاد کے حامی تھے اور وہ ایک ایسی مصنوعی ترک قوم کی تشکیل چاہتے تھے جو تاتاروں، ازبائیجانیوں، ازبیکوں، قزاقوں ترکمانوں اور قرغیزیوں پر مشتمل ہو اصل میں وہ تاتار بورژوازی کے نمائندے تھے جو روس کے ان تمام مسلمانوں پر اپنی طبقاتی چوہدواہٹ جمانا چاہتے تھے جن کا تعلق ترک لسانی گروپ سے تھا در اصل ہمارے ہاں ان خطوں کی تاریخ کے بارے میں اتنی سطحی واقفیت ہے کہ ہم ہر

بات کو جو مغربی مداحوں نے قلم بند کر دی ہے اس کو من وعن تسلیم کر لیتے ہیں اور پھر انہی کے حوالوں سے کمیونسٹوں کے خلاف فتوے صادر کرنے لگتے ہیں حالانکہ اس خطے کے اس زمانے کے اوپری طبقے کے سیاستدانوں اور دانشوروں میں کوئی فکری یکجہتی موجود نہ تھی چنانچہ یہ لوگ کبھی اتحاد اسلامی کی طرف جھکتے اور کبھی ترک اتحاد کا نعرہ بلند کرتے تو کبھی یہ بورژوا قومی پرستی کے نعروں سے مسحور ہو جاتے۔ اگر اس زمانے کی کل روسی مسلم کانگرسوں کی کارروائیوں پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ مقامی بورژوا قوم پرستوں کے اندر نظریاتی افراتفری اور تضادات پھیلے ہوئے تھے۔ پہلی کل روسی مسلم کانگرس ماسکو میں مئی ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ اس نے جو تجویز منظور کی اس میں وفاقی بنیاد پر جمہوری ریپبلک کے اندر "قومی علاقائی خود اختیاری" مانگی گئی۔ دوسری کانگرس جولائی ۱۹۱۷ء میں قازان میں منعقد کی گئی اس میں "قومی ثقافتی خود اختیاری" کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اس دوسری کانگریس کے ساتھ علما اور مقامی سپاہیوں کی کانگریسیں بھی قازان میں ہوئیں۔ اور تینوں کانگریسوں نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا کہ روس کے تمام ترک تاتار عوام کی "قومی ثقافتی خود اختیاری" کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

مقامی بورژوا قوم پرستوں کے اس متضاد رویے کی روشنی میں پہلی کل روسی مسلم کانگریس کی "قومی علاقائی خود اختیاری" کے اصول کو کیسے سنجیدگی سے اہمیت دی جا سکتی ہے اگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ مقامی بورژوا قوم پرستوں کا قومی علاقائی خود اختیاری کے بارے میں کوئی واضح معقول پروگرام تھا تو یہ مبالغہ آرائی ہو گی یہاں یہ بھی ذکر کر دیا جائے کہ پہلی مسلم کانگریس نے زمین کے متعلق کافی انقلابی تجویز منظور کی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ہر قسم کی زمین کو تمام عوام کی ملکیت قرار دیا جائے اور زمین کی ہر قسم کی نجی ملکیت مکمل طور پر ختم کر دی جائے، کسانوں کو اجرت پر محنت حاصل کئے بغیر زمین کے استعمال کا حق دیا جائے۔ مسلم کانگریس نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ دستور ساز اسمبلی کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر زرعی اصلاحات فوراً نافذ کی جائیں۔ دراصل یہ بولشویکوں کا زرعی پروگرام تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مقامی بورژوا قوم پرست زرعی مسئلے کو واقعی انقلابی طریقے سے حل کرنا چاہتے تھے۔ دراصل یہ کھوکھلی لفاظی تھی۔ قومی علاقائی خود اختیاری اور زمین کو قومی ملکیت بنانا۔ بولشویکوں

کے یہ دو بنیادی نظریے محنت کش عوام میں روز افزوں مقبول ہو رہے تھے۔ لہٰذا دنیا کے دوسرے ملکوں کے بورژوازی کی طرح محنت کشوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر مقامی بورژوا قوم پرستوں نے بھی ان نعروں کو اپنانے میں تیزی دکھائی۔

یہ پہلو بالکل نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ کبھی کبھی بورژوا قوم پرستوں میں جاگیرداری اور ملائیت سے علیحدہ ہونے کا رجحان بھی ابھرتا تھا لیکن کمزور ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ان سے بالکل آزاد نہیں کر سکے۔ دوسری غیر معمولی علاقائی مسلم کانگریس ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ اس نے ایسی خود اختیار ترکستان ریپبلک کا مطالبہ کیا جس میں پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہو۔ بالائی ایوان علما کی مجلس ہو جو اس بات کی نگرانی کرے کہ پارلیمنٹ کے منظور شدہ تمام قوانین شریعت کے مطابق ہیں۔ یہ مجلس بلند ترین عدلیہ بھی ہو۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خود اختیاری کا تصور قومی علاقائی خود اختیاری نہیں تھا۔ مجددوں نے وسطی ایشیا کی خود اختیاری کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مشکل ہی سے کوئی ٹھوس اقدام کیے۔ انھیں ملاؤں کے اثر کا خوف تھا، چنانچہ آہستہ آہستہ مجددوں نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ملاؤں کو نہ تو خود اختیاری سے دلچسپی تھی اور نہ آزادی سے۔ ملاؤں کا فائدہ تو بس اس میں تھا کہ وسطی ایشیا میں ان کا اثر جما رہے۔

مغرب کے کئی مورخین نے ترکستان کے پرانے بولشویکوں کو حق خود اختیاری کا کٹر دشمن بنایا ہے۔ بعض سوویت مصنفوں نے بھی ان پر الزام لگایا ہے کہ اپریل ۱۹۱۸ء میں پانچویں علاقائی کانگریس سے پہلے خود اختیاری کی جانب ان کا رویہ منفی تھا۔ اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ترکستان کی خود اختیاری کے متعلق مقامی بولشویکوں کے رویے کو مناسب جواز پیش کیے بغیر منفی کہہ کر ان کی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو ترکستان کی خود اختیاری کے مطالبے کی حمایت میں مظاہرے کی تیاری کے سلسلے میں پرانے تاشقند میں ایک جلسہ ہوا۔ اس میں تاشقند سوویت کا نمائندہ موجود تھا۔ عوامی کمیساروں کی کونسل کے صدر کولے سوف نے مظاہرین سے خطاب کیا اور ترکستان کی خود اختیاری کا اعلان کیا۔ رجعت پرست روسیوں نے گڑبڑ پیدا کرنے

کی کوشش کی لیکن مقامی محنت کشوں نے ان کی تقریر توجہ سے سنی۔ یہ مظاہرہ پرامن رہتا لیکن رجعت پرست روسیوں کے اشتعال دلانے پر مظاہرین تشدد پر اتر آئے اور دورِ یہ جیسے کئی انقلاب دشمنوں کو جیلوں سے رہا کر دیا اگر اس مظاہرے پر گولی چلی اور چند معصوم جانیں ضائع ہوئیں تو اس کی ساری ذمے داری روسی انقلاب دشمنوں پر ہے۔

تاشقند سوویت کے ترجمان "نا شاگز تیا" نے ۱۳ دسمبر کو اپنے اداریے میں لکھا کہ بولشویک اصولی طور پر خود اختیاری کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن وہ ایک چھوٹے سے گروپ کے ضرور مخالف ہیں جو خود اختیاری کے نام پر پسماندہ مسلم عوام کا مزید استحصال کرنا اور انہیں غلامی کی زنجیروں میں مزید جکڑنا چاہتا ہے نقلی خود اختیاری کے مقابلے میں انہوں نے واقعی اصلی خود اختیاری کی حمایت کی۔ اس کا اعلان منعقد کی جانے والی عوام کی منتخب کی ہوئی آئین ساز مجلس (یعنی سوویتوں کی کانگریس) کرنے والی تھی۔

سوویتوں کی چوتھی کانگریس کا اجلاس تاشقند میں ۱۹ جنوری سے ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء تک ہوا۔ اس نے انقلاب کے بعد چند ماہ میں سوویت اقتدار کے قیام میں کامیابی اور معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلیوں کا جائزہ لیا۔ خود اختیاری کا سوال بھی زیر بحث رہا۔ بولشویک رہنما تو بولین پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ترکستان کے حق خود اختیاری کے خلاف تھا۔ اس نے کانگریس میں جو تقریر کی وہ اس الزام کی بالکل تردید کرتی ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس کا ایک معقول حصہ یہاں نقل کیا جائے۔

اس ملک کے اصلی مالک جس کے حق خود اختیاری کی ہم بات کرتے ہیں اس کے عوام ہیں۔ ہم صرف حق خود ارادیت کی بات نہیں کرتے بلکہ اس خیال کو ہر طرح سے عملی جامہ پہناتے ہیں.... ہم ہتھیار لے کر انقلاب دشمنی کے خلاف لڑتے ہیں، اس کا سرچشمہ خواہ کچھ بھی ہو مقامی بورژوازی یا روسی بورژوازی۔ ساتھ ہی ہم اس علاقے کے لوگوں کو نہ صرف حق خود اختیاری دینے کے لئے بلکہ گروہ چاہیں تو مکمل علیحدگی کے حق کی بھی مدافعت کرنے کے لئے تیار ہیں... ہم کہتے ہیں کہ ماضی میں ترکستان کا علاقہ تشدد کے ذریعے مفتوح کیا گیا اور تشدد کے ذریعے سے ہی اس کو قبضہ میں رکھا گیا۔ اس لئے اگر عوام عام استصواب رائے

کے ذریعے روس سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں تو ہم ان کے حق علیحدگی کی مدافعت کریں گے۔ اس نے مزید کہا۔

"ہم اپنے مطالبے کو باقاعدہ مرتب کریں گے۔ مسلمان عوام میں مزدوروں کے نمائندوں کی سوویتیں قائم کر کے ہم اقتدار کا ایک ایسا ذریعہ پیدا کر رہے ہیں جو مستقبل کے آزاد ترکستان ملک کے لئے ضروری ہوگا۔" وقت کے ساتھ صورت حال واضح ہونی شروع ہوگئی چنانچہ چوتھی کانگریس میں بولشویک گروپ نے جو تجویز رکھی وہ بھاری اکثریت سے منظور کر لی گئی۔ تجویز میں اعلان کیا گیا کہ خود اختیاری کے سوال کا تعلق عام طور پر قومی مسلے سے ہے۔ اسے روسی انقلاب نے موجودہ دور میں پیش کیا ہے۔ اور اس کو صرف انقلابی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اس میں بتایا گیا کہ حق خود ارادیت کے سوال کو اشتراکیت کے مقصد کے تابع رکھنا چاہیئے اور اسے محنت کش طبقات کا حق خود ارادیت سمجھنا چاہیئے بولشویک تجویز یہ تھی کہ تمام اقتدار کو سوویتوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ اس نے صرف مزدوروں کسانوں، سپاہیوں اور مسلمان مزدوروں کے نمائندوں کی سوویتوں کو تسلیم کیا اور مخلوط حکومت کے تمام مشورے مسترد کر دیئے۔ تجویز کے آخر میں اعلان کیا گیا کہ مٹھی بھر روسی اور مقامی بورژوازی نے جس خود اختیاری کا دعوٰی کیا ہے اس کے خلاف ثابت قدمی سے جدوجہد کی جائے گی۔ تجویز میں یقین دلایا گیا کہ سوشل ڈیموکریٹوں (بولشویکوں) کی پارٹی اس علاقے کی پرولتاری خود اختیاری کے لئے کوشش کرے گی۔

اس تجویز سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ بولشویکوں کو بذات خود خود اختیاری پر اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ صرف بورژوا خود اختیاری کے خلاف تھے۔ انھوں نے بجا طور پر بورژوا خود اختیاری کے مقابلے میں پرولتاری خود اختیاری پیش کی۔

مارچ ۱۹۱۸ء میں مرکزی سوویت حکومت کا خاص کمیسار اور روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی مرکزی کمیٹی کا نمائندہ کوبزیف تاشقند پہنچا اسے ترکستان میں سوویت اقتدار کو مستحکم کرنے اور ترکستان خود اختیار اشتراکی سوویت ریپبلک قائم کرنے کے سلسلے میں مقامی پارٹی اور سوویت اقتدار کے اداروں کو عملی مدد دینے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اپریل

۱۹۱۸ء میں مزدوروں، کسانوں، سپاہیوں اور مسلمان دہقانوں کے نمائندوں کی پانچویں علاقائی کانگریس منعقد ہوئی۔ کانگریس کے زیادہ تر مندوبین مقامی لوگوں پر مشتمل تھے۔ نمائندوں کی تقریروں کا ترجمہ ازبیک زبان میں بھی سنایا گیا۔ کانگریس کو لینن اور استالین کا تار ۲۲ اپریل کو موصول ہوا جس میں وعدہ کیا گیا کہ سوویت حکومت سوویت بنیاد پر اس علاقے میں خود اختیاری کی حمایت کرے گی۔ ۳۰ اپریل کو پانچویں کانگریس نے "روسی وفاق کی ترکستان سوویت ریپبلک پر خاص قانون" منظور کیا۔ اس قانون کے نکات ۱ اور ۲ میں ریپبلک کا ریاستی ڈھانچہ اس کی سرحدیں اور روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کے ساتھ باہمی قانونی رابطے معین کئے گئے۔ ترکستان کی سوویت وفاقی ریپبلک کو خود اختیاری اور خود انتظامی اعلان کیا گیا۔ لیکن اس نے مرکزی حکومت کے اختیارات تسلیم کئے اور اس کے ساتھ اپنی سرگرمیاں مربوط کیں۔ کانگریس نے ایک کمیشن منتخب کیا اور اسے مرکز اور ترکستان ریپبلک کے درمیان باہمی تعلقات معین کرنے کے لئے ماسکو بھیجا۔

پانچویں کانگریس میں حق خود اختیاری کا اعلان کرنا قومی مسئلے پر کمیونسٹ پارٹی کی لینن پالیسی کے بنیادی اصولوں کی فتح تھی اس نے ترکستان میں سوویت اقتدار کے مزید استحکام کے لئے ضروری حالات پیدا کئے۔ کانگریس نے ترکستان سوویت ریپبلک کے اعلیٰ ادارے منتخب کئے۔ مرکزی انتظامیہ کمیٹی اور عوامی کمیساروں کی کونسل۔ ریاست کے ان بلند ترین اداروں میں مقامی لوگوں کے نمائندے چنے گئے تھے۔ پانچویں کانگریس نے ترکستان علاقے کی خود اختیاری کا اعلان کر کے ایک عظیم تاریخی فریضہ انجام دیا۔ وسطی ایشیا میں ترکستان کی سوویت خود اختیاری قومی سوویت ریپبلکوں کے قیام کی جانب ایک اہم قدم تھا۔

۱۹۱۸ء میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا۔ جون میں ترکستان کی تمام بولشویک تنظیمیں روسی کمیونسٹ پارٹی کے ایک اٹوٹ حصے کی طرح کمیونسٹ پارٹی ترکستان میں متحد ہو گئیں۔ ان کی پہلی کانگریس منعقد ہوئی۔ کانگریس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں ریاست کے نظم و نسق میں مقامی لوگوں کی شرکت، پارٹی پروپیگنڈے میں اصلاح، صوبائی، اصلاعی اور مقامی باشندوں کی سطح پر قومیتوں کے مسائل پر کمیشنوں کی تشکیل اور کانگریس کی کاروائی

کی مقامی زبانوں میں اشاعت کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

ترکستان کی تمام قومیتوں کے محنت کش عوام سوویت تعمیر میں روز افزوں شریک ہونے لگے۔ ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کے ۱۱ رجولائی ۱۹۸۸ء کے فیصلے کے مطابق وسطی ایشیا کی زبانیں روسی زبان کی سطح کے برابر ریاستی زبانیں تسلیم کر لی گئیں۔

۲۱ راپریل ۱۹۱۸ء کو تاشقند میں ترکستان عوامی یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اور جولائی ۱۹۱۸ء سے ازبیک زبان میں اخبار" اشتراکیوں" شائع ہونے لگا۔

اکتوبر ۱۹۱۸ء میں سوویتوں کی چھٹی کانگریس نے ترکستان خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک کے پہلے آئین کی تصدیق کی۔ ترکستان کی سوویت خود اختیاری کے اعلان اور اس کے آئین کی منظوری پر لینن قومی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے میں پارٹی کی جدوجہد کا ایک دور ختم ہو گیا۔ خود اختیار ترکستان کثیر قومی ریپبلک تھا جہاں تمام بسنے والی قومیتوں کو مساوی حقوق کی ضمانت تھی۔ سیاسی حقوق میں مساوات حاصل کرنے کے بعد اب یہ کام باقی تھا کہ اشتراکی نشو ونما اور سوویت قومی ریپبلکوں کے لئے زمین ہموار کی جائے۔

خیوا میں انقلاب

انقلاب بپا کرنا ایک عمل ہے اور وہ بہت جان لیوا عمل ہے اور نہ ہی یہ سیدھی راہ ہے اور نہ ہی اس میں یکسانیت ہے، جس پر امن طریقے سے ترکستان کی آزاد جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا وہ عمل خیوا اور بخارا کے علاقوں میں رونما نہ ہو سکا یہاں ان علاقوں میں انقلاب مقابلتاً ٹیڑھی میڑھی راہوں سے آیا چنانچہ سب سے پہلے خیوا کی اس زمانے کی صورت حال کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلی جنگ عظیم نے خیوا کی معاشی حالت کو شدید طور پر متاثر کیا روس سے جو اناج درآمد ہوتا تھا جنگ کی وجہ سے اس کی مقدار آدھی سے بھی کم رہ گئی اور اس نے قحط کی صورت پیدا کر دی، دوسری صنعتی اشیاء کی درآمد بھی متاثر ہوئی اس صورت حال میں مزید خرابی اس وقت رونما

ہوئی جب خیوا کے حاکم جنید خاں نے ۱۹۱۸ــــ ۱۹۲۰ء کے دوران میں اوپر تلے ٹیکسوں میں اضافے کرنے شروع کر دیے جس سے کسانوں اور عام لوگوں کی زندگیاں اجیرن ہو گئیں اس پر نظم و نسق کی حالت بھی بگڑنی شروع ہو گئی۔ خان کے حکام اور قزاق کھلم کھلا بے یار و مددگار لوگوں پر چھاپے مارتے تھے۔ خیوا کی قلمرو میں کئی قومیتوں کے لوگ آباد تھے ازبیک، ترکمان، قارا قلپیک، قزاخ، رجعت پرست عناصر ہمیشہ آپس میں فساد کراتے رہتے تھے۔ اکتوبر انقلاب سے پہلے کی دہائی میں وہاں قومی مسئلے نے شدت اختیار کر لی تھی۔ ازبیک اشرافیہ ازبیک محنت کشوں کا استحصال کرنے کے علاوہ ترکمانوں اور قاراقلپکوں کو بھی لوٹتی کھسوٹتی تھی۔

روس میں بورژوا عارضی حکومت، جس نے فروری انقلاب کے نتیجے میں اقتدار حاصل کیا تھا، خان کی مطلق العنان حکمرانی کی حامی تھی۔ اس کے پاس مسلح فوج تھی جو ازبیک، ترکمان، قاراقلپک دہقانوں اور دیہات کے غریبوں کی بغاوتیں کچلنے کے لئے مقصود تھی۔ چنانچہ خیوا قلمرو کے کسان اور دستکار خان کے حکام کی من مانی حرکتوں اور بائیوں اور ملاؤں کے استحصال کے خلاف خود رو طریقے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے جاگیردار بائیوں اور بیگوں کی جائدادیں جلا ڈالیں اور ان کے مویشیوں اور اناج پر قبضہ کر لیا۔ ۲۲ مئی ۱۹۱۷ء کو قلمرو کے دارالخلافہ خیوا کے بھوکے لوگوں نے چاول کے ذخیروں پر قبضہ کر لیا۔ خیوا میں روسی کزاک حفاظتی فوج نے اس "بھوک کے فساد" کو بری طرح کچل دیا۔

مئی ـ جون ۱۹۱۷ء میں قونیہ اور غلیج علاقے میں دہقانوں کی مسلح بغاوت شروع ہوئی۔ یہ تحریک اتنی مضبوط ہو گئی کہ خاں کو عارضی بورژوا حکومت سے فوجی امداد لینی پڑی۔ عارضی حکومت نے زائے تسیف کی کمان میں کزاک سپاہی بھیجے۔ زائے تسیف نے خوشحال کسانوں اور بائیوں کی مسلح فوج منظم کرنے میں بھی مدد دی جو جنید خاں کے ماتحت تھی۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء کو زائے تسیف اور جنید خان کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا اس کے مطابق دونوں نے مشترکہ طور سے خوارزم کے نخلستان میں انقلابی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی۔

جب روس اور ترکستان میں اکتوبر انقلاب فتح یاب ہوا تو اس نے خیوا میں خان کے خلاف عوام کی انقلابی جدوجہد پر گہرا اثر ڈالا۔ خیوا کی قلمرو اب ایک علیحدہ نوآبادی نہیں تھی۔ وہاں کے عوام خان کی مطلق العنان حکمرانی سے نجات حاصل کرنے کا فریضہ پورا کرنے میں نئے نظام کی پوری ہمدردی اور امداد پر بھروسہ کر سکتے تھے۔ جنید خان کے سپاہیوں اور گماشتوں کی دہشت انگیزی کے باوجود شہروں اور قریوں میں محنت کش عوام نے مطلق العنانی اور ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اسی عوامی جدوجہد کے دوران خیوا کی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد پڑی جس نے خان کے جبر و ظلم کے خلاف عوام کی جدوجہد کی قیادت اور تنظیم شروع کی۔

سوویت حکومت نے ابتدا ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ خیوا کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتی ہے۔ روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک اور ترکستان ریپبلک نے اپنی جانب سے یہ خواہش ظاہر کر دی تھی کہ وہ خیوا کے ساتھ اچھے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتی ہیں لیکن خیوا کے حکمران حلقے سوویت اقتدار کے خلاف اپنی نفرت سے اندھے ہو کر خیوا کے عوام پر اس کے روز افزوں اثر سے ڈر کر سامراجیوں کے کیمپ سے جا ملے۔

اکتوبر انقلاب کی ابتدا ہی سے خیوا وسطی ایشیا میں سوویت دشمنی اور انقلاب دشمنی کا اڈہ بن گیا تھا۔ یہاں سفید محافظ، مینشویک، اشتراکی انقلابی، بورژوا قوم پرست اور بھانت بھانت کے انقلاب دشمن عناصر ہر طرف سے جمع ہونے لگے۔ یہیں وہ برطانوی سامراج کے ایجنٹوں سے ملے۔ اس کے بعد دونوں نے مشترکہ طور سے سوویت وسطی ایشیا پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کی۔ اس سوویت دشمن منصوبے میں زائے تسیف کو اہم مقام حاصل تھا۔ قوقند کے بورژوا خود اختیاری پرستوں اور ادرین برگ کے کزاک لیڈر دوتوف سے ملاقات کرنے کے بعد زائے تسیف سوویت اقتدار کے خلاف مجوزہ حملے میں جنید خان کے ساتھ شریک ہونے پر راضی ہو گیا۔ ان کے منصوبے کے مطابق پہلے چارجوئی پر قبضہ کرنا تھا اور پھر ریلوے لائن پر کاغان، سمرقند اور جزاک فتح کرنے کے بعد تاشقند کی جانب پیش قدمی کرنی تھی۔ یہیں پر قوقند کے بورژوا خود اختیاری پرست ان کے ساتھ شریک ہونے والے تھے۔ جنید خان کو یہ کام بھی سپرد کیا گیا کہ وہ آمو دریا علاقے (موجودہ قاراقلپک

خود اختیار سوویت اشتراکی علاقہ) میں سوویت اقتدار کو ختم کر دے۔ خیوا کے انقلاب دشمنوں کا تاشقند میں ایک غیر قانونی سوویت دشمن تنظیم سے تعلق تھا۔ یہ ترکستان کی فوجی تنظیم کے نام سے پکاری جاتی تھی اور اس کے قیام میں امریکی قونصل، فرانسیسی ایجنٹ کاسٹین اور برطانوی جاسوس کرنل بیلے نے سرگرم حصہ لیا تھا۔ جنید خان کی سپاہ نے عشق آباد میں انقلاب دشمن اقتدار قائم کرنے میں حصہ لیا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۱۸ء کو جنید خان آمودریا کے سوویت علاقے میں داخل ہوا اور وہاں قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا۔ اس نے کپ چاک اور چہابائی تسخیر کر لئے اور تورت کل کو محاصرے میں لے لیا۔ تورت کل کے جانباز مدافعین نے جنید خان کے دانت کھٹے کر دیئے اور گیارہ دن تک محاصرے کے بعد اسے پسپا ہونا پڑا۔ جنوری ۱۹۱۹ء میں جنید خان نے دوبارہ سوویت علاقے پر حملہ کیا لیکن اس بار پھر اسے مار بھگا دیا گیا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں اس نے امن کے نئے سوویت حکومت سے گفت و شنید کی۔ ۹ر اپریل ۱۹۱۹ء کو تخته قلعہ میں روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک اور خیوا کے نمائندوں نے ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ مئی ۱۹۱۹ء میں ترکستان ریپبلک کی مرکزی انتظامی کمیٹی اور خیوا کے خان سید عبداللہ نے اس کی توثیق کر دی۔ اس معاہدے کے مطابق جنید نے وعدہ کیا کہ وہ سوویت اقتدار کے خلاف مسلح اقدام نہیں کرے گا۔ معاہدے میں آبی اور بری راستوں پر تجارت کی آزادی اور حفاظت تسلیم کی گئی اور طے پایا کہ سفارتی مشنوں کا تبادلہ کیا جائے۔

لیکن خیوا نے اس معاہدے پر کبھی عمل نہیں کیا۔ سوویت حکومت نے تجارتی معاہدہ کرنے کی کئی بار پیش کش کی لیکن ہر مرتبہ خیوا نے اسے ٹھکرا دیا۔ اور جنید خان نے اپنی سوویت دشمن سرگرمیاں بھی ختم نہیں کیں۔ جون ۱۹۱۹ء میں اس نے نئی لام بندی کا حکم دیا اور انقلاب دشمن روسی جنرل کولچاک سے ربط و ضبط قائم کیا۔ اسی مہینے میں خیوا اور بخارا نے وفدوں کا تبادلہ کیا۔ اگست میں اورال کے کزاکوں نے سوویت حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور مقامی جاگیرداروں کی مدد سے چمبائی اور نوتوس پر قبضہ کر لیا۔ وہاں پر آمودریا حکومت قائم کی گئی جس کا سربراہ ایک زمیندار قبلی چیف تھا۔ جنید خاں نے فوراً اسے تسلیم کر لیا۔ ۱۹۱۹ء کے آخر میں جب ماورائے کیسپین کے علاقے میں سفید محافظوں کو اور عشق آباد میں اشتراکی انقلابیوں

اور مینشویکوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو یہ سب بھاگ کر خیوا میں پناہ گزین ہوئے اور جنید خان کے مشیر بن گئے۔

جب جنید خان سوویت اقتدار کے خلاف سازشیں کر رہا تھا خیوا میں کسانوں کی انقلابی تحریک بڑھتی جا رہی تھی۔ غریب گلے بانوں اور دہقانوں نے چھاپہ مار دستے منظم کر لئے تھے اور ان کا مرکز تورتکل تھا۔ ترکستان کے کمیشن نے جس کے رہنما فرونزے اور کوئی بیشیف جیسے کہنہ مشق بولشویک تھے خیوا کے کمیونسٹوں کو انقلابی تحریک منظم کرنے میں بڑی مدد دی۔ ان میں قابل ذکر نام یہ ہیں۔ رحمان پرم بے توف، احمد جان ابراہیموف، قربان بیک نیازوف، عبداللطیف سلالوف وغیرہ۔ انھوں نے دائیں بازو والے خیوا کے ان نوجوانوں کا پردہ چاک کیا جو جنید خان کی مدد کرنے لگے تھے۔ بائیں بازو والے نوجوانوں نے بھی (پہلوان نیاز یوسوپوف، نذیر شالی کاروف وغیرہ) جو مقامی دانشوروں اور درمیانہ بورژوازی سے تعلق رکھتے تھے۔ جاگیردارانہ ظلم و ستم کے خلاف جدوجہد کی۔ خیوا کے نوجوان کسان اور دستکار اس تحریک سے علیحدہ ہو کر خیوا کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے

خیوا کے کمیونسٹوں نے مسلح انقلابی رضاکاروں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ ان کی قیادت میں نومبر ۱۹۱۹ء میں کئی مقامات پر مسلح بغاوتیں ہوئی۔ مثلاً قونغراد، خوجیلی، ایلیالنک قوینیہ اور غینچ کی صوبیداریاں۔ خیوا کے عوام کی درخواست پر سوویت حکومت نے سفید محافظوں کے خلاف جدوجہد میں مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کو سوویت فوج خیوا میں داخل ہوئی۔ ۲ فروری ۱۹۲۰ء کو خیوا میں انقلاب فتحیاب ہو چکا تھا۔ جنید خان کے پٹھو سید عبداللہ خاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ۲ فروری ۱۹۲۰ کو خیوا کی کمیونسٹ پارٹی نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جس میں خان کے جبر و ظلم کے خاتمے اور عوامی اقتدار کے قیام کا خیر مقدم کیا گیا۔ جلسے نے سرخ فوج کا پر خلوص شکریہ بھی ادا کیا جس نے خان اور بیرونی سامراجیوں کے جوئے سے خیوا کے عوام کو نجات دلانے میں مدد دی۔ عارضی انقلابی حکومت نے قرولتائی (عوامی نمائندوں کی کانگریس) منعقد کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

عوامی نمائندوں کی پہلی کل خوارزم کانگریس اپریل ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوئی اور اس نے خیوا کی سابق قلمرو کو خوارزم سوویت عوامی ریپبلک میں تبدیل کرنے کا اعلان کیا۔ کانگریس نے مرکزی انتظامیہ کمیٹی کا انتخاب کیا اور حکومت کی تشکیل کی جسے عوامی ناظروں کی کونسل کہا جاتا تھا۔ عوامی نمائندوں کی پہلی کانگریس نے خوارزم سوویت عوامی ریپبلک کا پہلا آئین منظور کیا۔ اس کے مطابق تمام ریپبلک کے مرکز کو اور محنت کش لوگوں کو مقامی سوویتوں کے سپرد کردیا گیا۔ اقتدار کا اعلیٰ ترین ادارہ قرولتائی قرار دیا گیا۔ آئین نے خیوا کے لوگوں کو تقریر، تحریر، اجتماع وغیرہ کی آزادی دی۔ خان اور بڑے بڑے حکام کی جائداد جو انقلاب کے وقت ضبط کرلی گئی تھی عوامی ملکیت قرار دی گئی۔ سوائے انقلاب دشمنوں، خانوں اور ان کے رشتے داروں خان کے انتظامیہ کے بڑے حاکموں اور زمینداروں کے ۱۸ برس اور اس سے زیادہ عمر کے تمام لوگوں کو حق رائے دیا گیا۔ خوارزم سوویت عوامی ریپبلک کے آئین نے یہ بھی اعلان کیا کہ تمام قومیتوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔

خیوا کے انقلاب کی اپنی ممتاز خصوصیات تھیں۔ اس وقت تعداد کے لحاظ سے صنعتی پرولتاریہ بہت کم تھا اور آبادی کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی۔ اسی لئے پہلی منزل میں انقلاب کی نوعیت اشتراکی نہیں بلکہ عوامی جمہوری تھی۔ اس نے محنت کشوں کی انقلابی جمہوری آمریت قائم کی۔ اپنی پہلی منزل میں انقلاب کو دوسری اشتراکی منزل تک عبور کی تیاری کرنا تھی۔ بورژوا جمہوری انقلاب کا یہ فریضہ بورژوازی نہیں بلکہ عوام الناس کی انقلابی آمریت انجام دے سکتی تھی۔

انقلاب کے بعد خیوا میں جو پہلی حکومت یوسوپوف کی رہنمائی میں قائم ہوئی اس میں ایسے مقامی عناصر بھی موجود تھے جو سوویت کے فرائض پورے نہیں کرنا چاہتے تھے اس میں ایسے بورژوا قوم پرست بھی تھے جو خوارزم کو سوویت روس سے علیحدہ رکھنا پسند کرتے تھے تاکہ وہ پھر برطانیہ کی نوآبادی بن جائے۔ ان لوگوں نے زرعی اصلاحات نافذ کرنے میں روڑے اٹکائے۔ خانوں کی زمینیں جو ضبط کرلی گئی تھیں زیادہ تر دولت مند کاشتکاروں اور سود خوروں میں تقسیم کی گئیں اوقاف کی زمین کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ جب کسان ان پر قبضہ کرنے لگے تو انھیں سزائیں دی گئیں۔

نئی حکومت نے ازبکوں اور ترکمانوں کے درمیان قومی تعصبات بھی بھڑکائے۔

خیوا کی کمیونسٹ پارٹی کے سامنے پیچیدہ سنجیدہ مسائل تھے اسے زمین اور پانی کے مسئلے کا انقلابی حل کرنا تھا اور قومی تعلقات میں استواری پیدا کرنا تھی۔ اور یہ کام بیگانہ عناصر سے اپنے آپ کو پاک وصاف کئے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کے ترکستان کمیشن اور ترکستان بیورو کی مدد سے اس سمت میں کام شروع ہوگیا۔ زیادہ سے زیادہ غریب لوگوں کو پارٹی میں شامل کیا گیا اور بورژوا قوم پرستوں کے خلاف جدوجہد کی گئی۔ ۶ر مارچ ۱۹۲۱ء کو محنت کش عوام کا خیوا میں ایک زبردست جلسہ ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ حکومت سے مخالف عناصر نکال دیئے جائیں۔ دوسری قرولتائی کے انعقاد تک نئی عارضی انقلابی حکومت قائم کی گئی۔

مئی ۱۹۲۱ء میں دوسری قرولتائی کا اجلاس ہوا۔ اس کے ۲۴۰ مندوبین میں سے اکثریت غریب اور متوسط کسانوں کی تھی۔ اس نے اوقاف کی زمین کو ریاست سے علیحدہ کردیا اور زمین کا رقبہ فرد کی محنت کی صلاحیت کے مطابق معین کیا۔ ۱۴ ہزار تاناپ زمین کسانوں میں تقسیم کی گئی۔ دوسری قرولتائی نے روسی اشتراکی وفاقی سوویت ریپبلک سے سیاسی اور فوجی سمجھوتے کی توثیق کی۔ روسی ریپبلک نے خیوا کے لوگوں کو معاشی، سیاسی اور ثقافتی پسماندگی دور کرنے میں بہت مدد دی۔ اس نے خیوا ریپبلک کی آزادی اور اس کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا۔ اس سابق قلمرو کی سرزمین پر گذشتہ روسی حکومتوں کو جو نوآبادیاتی حقوق اور مراعات حاصل تھیں ان سب سے روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک دستبردار ہوگئی۔ خیوا میں اس کی جو جائداد، فیکٹریاں، زمین اور بحری جہاز وغیرہ تھے ان سب کو بلا معاوضہ ریپبلک کی نئی حکومت کے سپرد کردیا گیا جب خوارزم کی سوویت عوامی ریپبلک نے اپنے عوام کا معاشی اور ثقافتی معیار بلند کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو سوویت حکومت نے اسے امداد دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھائی۔ اسے سوویت حکومت کی طرف سے ۵۰ کروڑ روبل کی یکمشت رقم بطور امداد ملی۔ اس کے علاوہ روس سے وہاں بڑی تعداد میں ماہرین، انجینئر، ڈاکٹر، مدرس وغیرہ بھیجے گئے۔

بخارا کا انقلاب

خیوا کی طرح بخارا میں بھی جاگیردارانہ مطلق العنان حکمرانی تھی اور وہ بھی زار شاہی کے روس کے زیر نگرانی تھا۔ زارشاہی کے روس کے لئے یہ کپاس کا دوسرا سب سے بڑا ذریعہ تھا، پہلی جگہ فرغانہ کو حاصل تھی۔ بخارا روس کو جو سامان برآمد کرتا تھا اس میں کپاس کا حصہ ۸۰ فیصدی تھا۔ اور وہاں کی ۹۰ فیصدی کپاس روس کو برآمد کی جاتی تھی۔ بخارا میں سرمایہ دارانہ قسم کی کوئی بڑی پیداواری صنعتیں نہ تھیں۔ بخارا میں کل ۲۵ فیکٹریاں تھیں جن میں سے ۲۶ کپاس صاف کیا کرتی تھیں۔ آبادی میں اکثریت کسانوں کی تھی جن کے حالات زندگی روز افزوں ابتر ہو رہے تھے۔ بخارا میں ملاؤں کا بہت اثر تھا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں مکتبوں اور مدرسوں میں ۲۰ ہزار طالب علم پڑھتے تھے۔ جدید تعلیم صفر کے برابر تھی۔

پہلے روسی انقلاب (۷-۱۹۰۵ء) کے زیر اثر بخارا میں مشہور بورژوا قوم پرست تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس کا نام تھا جدیدیت۔ لیکن مجددین نے اپنی سرگرمیاں صرف ثقافتی اور تعلیمی مسائل تک محدود رکھیں۔ انھوں نے اپنے لئے یہ فریضہ معین نہیں کیا کہ مروجہ جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ انھیں امیر اور اس کے خدا ترس وزیروں کے احساس عدل و انصاف سے بڑی خوش عقیدگی تھی۔ روس میں فروری انقلاب کے زیر اثر مجددوں نے جو اپنے آپ کو نوجوان ترکوں کی طرح نوجوان بخاری کہتے تھے جزوی اصلاحات کا مطالبہ شروع کیا۔ مجددین اصلاحات کے علمبردار تھے، نہ کہ انقلاب کے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ معین محصول مقرر کئے جائیں اور مجلس (پارلیمنٹ) قائم کی جائے۔ امیر بخارا نے ۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو اپنے منشور میں جن اصلاحات کا وعدہ کیا تھا وہ کبھی عمل میں نہیں لائی گئیں۔

اکتوبر انقلاب ۱۹۱۷ء کی کامرانی نے بخارا کو روس کے نوآبادیاتی استحصال سے نجات دلا دی۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں بخارا میں تمام روسی آبادیں۔ نیا بخارا، چارجوئی، کیرکی، ترمذ

میں اقتدار سوویتوں کے ہاتھ میں آگیا۔ بخارا کی سرزمین پر سوویتوں کے ایک حلقے کا قیام وہاں مستقبل میں انقلابی تحریک کے فروغ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوا۔

سوویت اقتدار کی جانب امیر بخارا کا رویہ شروع سے ہی معاندانہ تھا۔ نومبر ۱۹۱۷ء اور مارچ ۱۹۱۸ء کے درمیان اس نے تین بار فوجی بھرتی کے احکام جاری کئے۔ اس نے اورین برگ کے کزاک فوجیوں کے لیڈر دوتوف اور توقند کے بورژوا قوم پرستوں سے اپنے رابطے قائم کئے۔ انکی کا ملے سن سے بھی میل جول تھا جو ایران میں برطانوی افواج کا کمانڈر تھا امیر کی فوج ۲ ہزار زر خرید افغانی سپاہیوں پر مشتمل تھی اور اس کی کمان انگریز افسر کرتے تھے۔ ۱۹۱۸ء کے شروع میں امیر نے ریلوے لائن کے قریب ۳۰ ہزار فوجی مستعد حالت میں رکھے۔ اس سے ترکستان میں سوویت اقتدار کو سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ سوویت حکومت نے ہر ممکن کوشش کی کہ بخارا کے ساتھ اس کے حسب معمول تعلقات قائم ہوں۔ اس مقصد کے لئے اس نے دسمبر ۱۹۱۷ء میں ایک سفارتی مشن بخارا بھیجا۔ لیکن امیر نے اسے ملاقات کا شرف تک نہیں بخشا۔

۶ دسمبر ۱۹۱۷ء کو نوجوان بخاریوں کا ایک وفد تاشقند آیا۔ اس نے سوویت حکام کو بخارا میں انقلاب کی تیاریوں سے باخبر کیا جس میں تقریباً ۳ ہزار مسلح عوام حصہ لینے والے تھے۔ انقلاب کی تیاریوں کے مبالغہ بیانی نے سوویت حکام کو گمراہ کر دیا۔ چنانچہ ترکستان کی عوامی کیساروں کی کونسل نے یہ غلط فیصلہ کر ڈالا کہ بخارا کے عوام کو امداد پہنچائی جائے۔ ۲۸ فروری ۱۹۱۸ء کو خود ترکستان کی عوامی کیساروں کی کونسل کا صدر کولے سوف ۶۰۰ - ۵۰۰ سرخ محافظوں کو اپنی قیادت میں لے کر بخارا روانہ ہو گیا۔ اس نے امیر سے مطالبہ کیا کہ بخارا میں روسی آبادیوں میں سوویت اقتدار کو تسلیم کیا جائے اور نوجوان بخاریوں کے نمائندوں میں سے منتخب کر کے ایک انتظامیہ کمیٹی بنائی جائے تاکہ انتظامیہ جمہوری خطوط پر چلے۔ امیر نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے جواب میں کولے سوف نے ۲ مارچ ۱۹۱۸ء کو فوجی اقدام شروع کر دیا۔ اس کی زیر کمان ۲ ہزار دگ تھے۔ امیر نے جنگ بندی کی درخواست کی تاکہ اسے جنگی تیاریوں کے لئے وقت

مل سکے۔ وہ سمرقند سے ریلوے لائن کو قطع کرنے میں کامیاب ہوگیا اور کولے سوف کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ کولے سوف کو سمرقند کی طرف پسپا ہونا پڑا اور ترکستان سے عین وقت پر کمک آنے کی بدولت قلع قمع ہونے سے بال بال بچ گیا۔ بعد میں امیر کے مجبور ہو کر ۲۵ مارچ ۱۹۱۸ء کو قزل تے پے میں معاہدے پر دستخط کئے۔ اس کے تحت اس نے فوجی بھرتی ختم کرنے، بخارا کی سرزمین سے انقلاب دشمن روسیوں کو باہر نکال دینے، تباہ شدہ ریلوے لائن کو بحال کرنے اور بخارا میں سوویت کمیسار سے ملاقات کرنے کا وعدہ کیا۔ اس طرح امیر کا تختہ الٹنے کی پہلی کوشش ناکام رہی۔ نوجوان بخاریوں کو عوام کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ اس کی جانب لینن نے روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی آٹھویں کانگریس میں اپنی تقریر میں اشارہ کیا اور زور دیا کہ پسماندہ علاقوں میں انقلابی تبدیلیاں نافذ کرنے میں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

قزل تے پے کے معاہدے سے ترکستان کو ضروری تحفظ حاصل نہیں ہوا کیونکہ مارچ کے واقعات کے بعد امیر برطانوی سامراجیوں سے بہت نزدیک ہوگیا تھا۔ ۱۹۱۹ء کے اپریل اور مئی میں برطانوی ہتھیاروں سے لدے ہوئے کئی سو اونٹ افغانستان کے راستے سے بخارا پہنچے۔ اپریل میں امیر کو ۲۰ ہزار مائیکلیس ملیں اور مئی میں ۸ ہزار مزید۔ ۱۹۱۹ء کے موسم بہار تک امیر کی فوج کو تربیت دینے والے انگریز افسروں کی تعداد ۶۰۰ ہو گئی۔ ۱۹۱۹ء کی گرمیوں میں امیر نے ماورائے کیسپین کے سفید محافظوں کے ساتھ ساز باز کر کے اور براہ راست برطانیہ کی شرکت سے کیرکی کے خلاف ایک مسلح مہم روانہ کی۔

اس ناکام مہم کے سربراہ ترکستان کا سابق وزیر جنگ اوسیپوف اور برطانوی کرنل وٹ کارٹ تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں کرنل بیلی تاشقند سے بخارا پہنچ گیا اور سوویت ترکستان کے خلاف اقدام کرنے کا منصوبہ تیار کرنے لگا۔ خود امیر نے ۱۵ اپریل ۱۹۱۹ء کو انجمن اقوام کے نام جو یادداشت پیش کی اس میں تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کی افغانستان، خیوا اور برطانیہ سے ساز باز تھی۔

امیر کے جارحانہ ارادوں کے باوجود ترکستان کے بولشویک اس کی جانب پرامن پالیسی

پر قائم رہے۔ سوویت حکومت نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ امیر بخارا کے ساتھ تعلقات نیک ہمسایانہ ہوں۔ ترکستان کی سوویتوں کی پانچویں کانگریس نے بخارا کی آزادی تسلیم کر لی اور بعد میں اسے کافی مالی امداد بھی دی۔ جب ۱۹۱۸ء کی خزاں میں بخارا کو انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو ایسے نازک وقت سوویت حکومت اس کے آڑے آئی اور ڈیڑھ کروڑ روبل کا اسے قرضہ دیا۔ لیکن حسب معمول امیر کا رویہ سوویت حکومت کے خلاف رہا۔ اس نے زار کی کرنسی کو زیادہ قیمت پر خریدنے کی ہمت افزائی کی اور اسے ہندستان کی منڈی میں استعمال کیا۔ چنانچہ سوویت کرنسی کی قیمت گھٹ گئی اور اس کی وجہ سے بخارا اور سوویت ترکستان کے درمیان مالیاتی تعلقات الجھ گئے۔ امیر نے جو مستقل محاذ آرائی اختیار کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکستان اور بخارا کے درمیان تجارت ٹھپ ہو گئی۔ سوویت حکومت نے بنولے کے تیل اور چاول کے عوض کپاس لینے کی پیش کش کی لیکن اسے بخارا کے حکمران حلقوں نے ٹھکرا دیا۔ ظاہر ہے کہ امیر بخارا برطانوی اور دوسری سامراجی طاقتوں کو سوویت روس کے خلاف معاشی ناکہ بندی میں مدد دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سوویت ترکستان سے تجارت بندی کر دی اور وہ اپنی خاص پیداوار کپاس اور اون برطانیہ اور افغانستان کو ہتھیاروں کے بدلے فروخت کرنے لگا۔ بخارا میں جو سوویت نمائندے موجود تھے ان کے معمول کے کاموں میں امیر کے حکام روڑے اٹکاتے۔ ماورائے کیسپین میں سفید محافظوں کو بخارا نے ضروری سامان فراہم کیا۔ اور ریلوے پٹریاں اکھاڑ کر، ٹیلی گراف کے تار کاٹ کر، اور دہقانوں پر ریلوے اسٹیشنوں کے قریب آنے اور سوویت سپاہیوں کو غذائی اشیاء بیچنے پر پابندی لگا کر سفید محافظوں کے خلاف سوویت فوجی اقدامات کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔

ترکستان کے کمیشن نے بخارا آ کر وہاں کے امور پر خاص توجہ دی۔ ۷ر جنوری ۱۹۲۰ء کو کمیشن کے امیر سعید علیم خان سے ملاقات کی۔ انھوں نے امیر کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف سوویت روس کے ساتھ قریبی تعلقات ہی بخارا کی مکمل آزادی اور اس کی معاشی اور ثقافتی ترقی کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ پھر ۱۴ر مارچ ۱۹۲۰ء کو فرونزے کمیشن کے دیگر ممبروں

کے ہمراہ بخارا آئے اور امیر سے ملاقات کی۔ لیکن امیر کو راہ راست پر لانے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور تمام پرامن سوویت تجاویز کو ٹھکرا دیا گیا۔ امیر مشہد میں برطانیہ سے پینگیں بڑھانے لگا اور افغانستان کے ساتھ ایک فوجی معاہدہ کر لیا۔ بولشویکوں کے خلاف جذبات بھڑکانے کے لئے اس نے ملاؤں کو بھی استعمال کئے اور اگست ۱۹۲۰ء میں ۵۰ ہزار نفوس پر مشتمل فوج کی لام بندی کر کے بولشویکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

اس سے بخارا کے عام لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ سمجھ گئے کہ امیر اور اس کے حکام برطانوی سامراجیوں سے مل کر اپنا اقتدار محفوظ رکھنے کے لئے سوویت ترکستان کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

بخارا کے عوام نے یہ بھی سمجھ لیا کہ ان کی نجات کا راستہ امیر کی جابر حکومت کے خلاف انقلاب اور مسلح جدوجہد ہے اور اس جدوجہد میں وہ سوویت ترکستان کے محنت کش لوگوں کی امداد پر پوری طرح بھروسہ کر سکتے ہیں۔

بخارا کے عوام کو مسلح بغاوت کے لئے تیار کرنے میں بخارا کی کمیونسٹ پارٹی نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ پارٹی تشکیل کرنے کا فیصلہ تاشقند کے ایک جلسے میں ۲۵ ستمبر ۱۹۱۸ء کو کیا گیا تھا۔ اسی جلسے میں مرکزی کمیٹی چنی گئی اور اس کے صدر عظیم جان یعقوبوف چنے گئے۔ دسمبر ۱۹۱۸ء تک پارٹی کی شاخیں کاغان، نیا بخارا، پرانا بخارا، سمرقند، قطعہ، کرغان، کیرکی اور ترمز میں منظم کر لی گئیں۔ اگست ۱۹۱۹ء میں چارجوئی میں بھی پارٹی کی شاخ قائم ہو گئی۔ پارٹی کے پروگرام میں اعلان کیا گیا کہ امیر کی امارت کو ختم کر کے اس کی جگہ عوامی ریپبلک قائم کی جائے۔

اکتوبر انقلاب کے زیر اثر بخارا میں انقلابی تحریک بڑھنے لگی تھی۔ عوام کے معاشی حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ اپنی کپاس اور اون روس کو برآمد کرنا مشکل تھا۔ امیر سوویت اقتدار کے خلاف جنگ کی تیاریوں کا خرچ پورا کرنے کے لئے نت نئے ٹیکس عائد کر کے ان کا بوجھ عوام پر لادتا رہا۔ یہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ دہقانوں اور دستکاروں نے شہر سبز (فروری ۱۹۱۹ء) قراقل اور واب کینٹ (مارچ ۱۹۱۹) اور پرانے بخارا (جون ۱۹۱۹ء)

میں عام مسلح بغاوتوں میں حصہ لیا۔ یہ بغاوتیں بخارا کی کمیونسٹ پارٹی نے منتظم کیں۔ انھیں امیر نے بڑی بے رحمی سے کچل دیا۔ صرف پرانے بخارا میں ۵۰۰ لوگ گرفتار کئے گئے اور ۶۹ کو پھانسی دی گئی۔

ان انقلابی عوامی لڑائیوں کی رہنمائی کر کے بخارا کی کمیونسٹ پارٹی نے محنت کشوں دہقانوں اور دستکاروں میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی۔ پارٹی کی دوسری کانگریس تاشقند میں ۲۷ - ۲۶ جون ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ اس نے پارٹی سے اپیل کی کہ وہ عوام میں اپنا پروپیگنڈہ بڑھانے اور اپنی صفوں میں لوگوں کے مختلف حصوں کو شامل کرنے کے لئے زیادہ موثر تدابیر اختیار کرے۔ حسینوف کو مرکزی کمیٹی کا نیا صدر چنا گیا۔ تاشقند میں بخارا کی کمیونسٹ پارٹی کی جب تیسری کانگریس ۳۱ - ۲۶ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہوئی تو اس وقت پارٹی کی ۲۷ شاخیں کام کر رہی تھیں۔ ۴۲ کسانوں اور دستکاروں میں اور ۱۳ فوج میں۔ تیسری کانگریس نے پھر پروپیگنڈہ وسیع کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور اسی مقصد سے ۱۹۲۰ء سے دو رسالے "تونگ" (طلوع) اور "کوتولش" (آزادی) تاشقند اور بخارا سے شائع ہونے لگے۔ ۱۹۲۰ء کی گرمیوں تک بخارا میں انقلابی حالات پختہ ہو چکے تھے۔ وہاں کے مزدور، کسان اور دستکار قابل نفریں اور جابر امیر کی حکمرانی کا تختہ الٹنے کے لئے تیار تھے۔ اس وقت پارٹی کی ۳۴ شاخیں سرگرم عمل تھیں اور پارٹی ممبروں کی تعداد ۵ ہزار تھی۔ پارٹی کے ہمدرد لگ بھگ ۲۰ ہزار تھے خود پرانے بخارا میں پارٹی کی ۲۱ ہزار شاخیں تھی اور ڈیڑھ ہزار پارٹی کے ممبر۔ بخارا کے کمیونسٹ امیر کی فوج میں بھی سرگرم تھے۔ ارغاش موسی بائیف فوج میں پارٹی پروپیگنڈے کے سربراہ تھے۔ سمرقند میں امیر کی فوج کے مفرور سپاہیوں کا ایک مسلح گروپ منظم کیا گیا۔ پارٹی کی چوتھی کانگریس چارجوئی میں ۱۶ راگست سے ۱۹ راگست تک ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ امیر کے اقتدار کے خلاف مسلح انقلابی اقدام کیا جائے۔

ابھی تک ہم نے بخارا کی کمیونسٹ پارٹی اور نوجوان بخاریوں کے درمیان تعلق کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ نوجوان بخاریوں کی پارٹی مارچ ۱۹۱۸ء میں ناکامی کے بعد کچھ

سوہے کے لئے منظر سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن جنوری ۱۹۲۰ء میں ترکستان کی سرزمین پر وہ پھر ابھرنے لگی۔ مشرق میں بین الاقوامی پروپیگنڈے کی کونسل نے ۶ فروری ۱۹۲۰ء کو اس کی سرگرمیوں کا اعتراف کیا اور ترکستان کے کمیشن نے بھی تصدیق کی۔ جب ۲۵ مارچ ۱۹۲۰ء کو مشرق میں بین الاقوامی پروپیگنڈے کی کونسل کا اجلاس ہوا تو بخارا کی کمیونسٹ پارٹی اور نوجوان بخاریوں کی پارٹی کے درمیان تعلقات کے مسئلے پر بحث ہوئی۔ کونسل نے بخارا کمیونسٹوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا کہ وہ امیر کے خلاف اپنی جدوجہد نوجوان بخاریوں کی مفاہمت سے کریں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بخارا کی کمیونسٹ پارٹی خوش نہیں تھی اس کی رائے میں نوجوان بخاریوں کی پارٹی بورژوا قوم پرستوں کی پارٹی تھی۔ اس جدوجہد کا رخ ہمیشہ بخارا کے کمیونسٹوں کے خلاف رہا تھا اور وہ بنیادی طور پر سوویت دشمن تھی چنانچہ ۱۹ جون ۱۹۲۰ء کو کونسل اور ترکستان کے کمیشن کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ اس نے نوجوان بخاریوں کی پارٹی کے بارے میں بخارا کی کمیونسٹ پارٹی کی رائے سے اتفاق کیا اور فیصلہ کیا کہ نوجوان بخاریوں کی پارٹی ختم کر دی جائے اور اس کے ترقی پسند ممبر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ اجلاس نے صرف پروپیگنڈے کے کام کے لئے کونسل کی زیر نگرانی نوجوان بخاریوں کی مالی امداد منظور کی۔ ۳۰ جون ۱۹۲۰ء کو ترکستان کے کمیشن کا جلسہ ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ امیر کا تختہ الٹنے کے لئے تیاریاں شروع کر دی جائیں اور بین الاقوامی پروپیگنڈے کی کونسل کو ہدایت کی کہ وہ صرف بخارا کی کمیونسٹ پارٹی کی معاونت کرے۔ کمیشن نے نوجوان بخاریوں کی پارٹی کو فروری انقلاب اور بخارا کے کمیونسٹوں کو اکتوبر انقلاب قرار دیا۔

لیکن کونسل کا رجحان یہ تھا کہ تمام ترقی پسند اور جمہوری قوتوں کا ایک وسیع محاذ قائم کیا جائے۔ اس کی رائے میں نوجوان بخاریوں کی پارٹی سے بالکل کنارہ کشی کرنا بخارا کے انقلاب کے لئے مضر تھا۔ نوجوان بخاریوں کی پارٹی کے مرکزی بیورو نے بھی لینن کو خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ اس کے پروگرام کا جائزہ لیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کے تنظیمی بیورو نے یہ فیصلہ کیا کہ نوجوان بخاریوں کو ان کے موجودہ

پروگرام کی بنیاد پر کمیونسٹ پارٹی میں شامل کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس نے امیر کے خلاف انقلابی جدوجہد میں ان کے ساتھ تعاون کرنے کی سفارش کی۔

اس سفارش کی روشنی میں ترکستان کے کمیشن، بین الاقوامی پروپیگنڈے کی کونسل، نوجوان بخاریوں کے نمائندوں اور بخارا کی کمیونسٹ پارٹی کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا تاکہ دونوں پارٹیوں کے ایک دوسرے میں ضم ہونے کے سوال پر بحث کی جائے۔ نوجوان بخاریوں کی پارٹی کے نمائندوں نے بتایا کہ ان کے اور کمیونسٹ پارٹی کے پروگراموں میں اختلاف صرف طریقہ کار کا ہے، اور یہ اس لئے ہے کہ وہ لوگ جو کمیونسٹ پروگرام سے متفق نہیں ہیں انھیں امیر کی مطلق العنانی کے خلاف مشترکہ انقلابی جدوجہد میں شامل کرایا جاسکے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ بخارا میں انقلاب کی کامرانی کے بعد نوجوان بخاری کمیونسٹ پارٹی کا نام اور پروگرام اختیار کر لیں گے۔ اس مفاہمت کی بنیاد پر ترکستان کے کمیشن نے نوجوان بخاریوں کو امداد دینے کا فیصلہ کیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ بخارا کے کمیونسٹوں سے متحدہ محاذ قائم رکھیں، ان کے خلاف جدوجہد کرنے سے باز رہیں اور ہر طرح سے اس کی تیاری کریں کہ مستقبل میں دونوں پارٹیاں ایک ہو جائیں۔ ان سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ ان اصولوں کی روشنی میں وہ تحریری اعلان پیش کریں یہ ۱۶ اگست ۱۹۲۰ء کو دونوں پارٹیوں نے سپرد کر دیئے۔ چنانچہ بخارا کی کمیونسٹ پارٹی کی چوتھی کانگریس نے نوجوان بخاریوں کے ساتھ عارضی مفاہمت کے امکان کو تسلیم کیا۔ لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نوجوان بخاریوں کے بارے میں بخارا کے کمیونسٹوں کے شبہات مکمل طور پر کبھی دور نہیں ہوئے۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو فرونزے نے لینن کو تار بھیجا اور بخارا کے مسئلے پر ان کی رائے دریافت کی۔ فرونزے کے ذہن میں اقدام کے صرف دو راستے تھے۔ اندرونی انقلابی عمل کی ترقی کی توقع کرنا اور اس کا انتظار کرنا یا بیرونی امداد سے انقلاب منظم کرنا۔ ان کی رائے میں پہلا راستہ بے حد سست رفتار تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے راستے والی حالت کو فروغ دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے راستے کی حمایت کی۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے پولیٹ بیورو نے اس تار پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد اقدام کا مندرجہ ذیل راستہ تجویز کیا۔

"بخارا میں اور بخارا کی سرحدوں پر روسی لوگوں کے تحفظ کے لئے ضروری تدابیر اختیار کرنا بخارا کی سرزمین اور بخارا کی فوج پر حملہ کرنے کی کبھی پہل قدمی نہ کرنا۔ بخارا کی برطانوی جاسوسوں انقلاب دشمن روسیوں سے مل کر انقلاب دشمن سرگرمیوں کے خلاف مسلمان عوام میں بڑے پیمانے پر پروپیگنڈہ کرنا۔ ایسے پروپیگنڈے کے دوران ایک ایسی مقامی فوج منظم کرنا جس میں بخارا کے کمیونسٹ بھی شامل ہوں۔ اور ان حفاظتی اقدامات کو صرف اس وقت حملے میں تبدیل کرنا جب بخارا میں عوامی انقلابی مرکز موجود ہو اور امداد طلب کرے۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سوویت حکومت اور پارٹی کے ذمے دار حلقے خیوا یا بخارا میں انقلاب برآمد کرنے کے ہمیشہ خلاف تھے۔ لیکن نوجوان بخاری اور نوجوان خیوائی اس کے حامی تھے۔ اس لئے سوویت اخباروں نے ان کے بارے میں لکھا "وسطی ایشیا کے دسمبریے جو تاریخ سے سبق سیکھنا نہیں چاہتے" ان کی رائے میں عوام کو انقلابی بنانے کے لئے عرصہ درکار تھا۔ اس لئے خیوا اور بخارا کے مظلوم عوام کو باہر سے ترکستان کی پرولتاری سرخ فوج کے سنگینوں کی مدد سے نجات دلانا چاہیئے۔ سوویت اخبار نے یہ بات نظر انداز کرنے پر "ایشیائی دسمبریوں" کی گوشمالی کی کہ "استحصال کئے جانے والے عوام اپنے نجات دہندوں کو غلط فہمی میں بیرونی فاتح نہ سمجھ بیٹھیں"

قارئین کو یاد ہوگا کہ ترکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی چوتھی کانگریس نے خیوا اور بخارا کے عوام پر باہر سے انقلاب مسلط کرنے کی مخالفت کی تھی۔ موجودہ حالت کے متعلق تجویز میں کہا گیا: "خود خیوا اور بخارا کی آبادی میں اس قدرتی لمحے کے لئے، انقلابی اتھل پتھل شروع ہونے کے لئے ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔ لیکن ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دینا چاہیئے کہ وہ ترکستان سوویت ریپبلک کے خلاف برطانوی فوجی قوت کے اقدام کے لئے اڈے بن جائیں"

بخارا کی کمیونسٹ پارٹی نے ۲۸ راگست ۱۹۲۰ء کو چارجوئی پر قبضہ کر کے انقلاب کی ابتدا کی۔ اس کی اپیل پر فرونزے کی سرکردگی میں سوویت فوج عوام کی نجات میں امداد دینے کو آگئی۔ گھمسان کی لڑائی کے بعد مطلق العنانی کے گڑھ بخارا پر سوویت فوج نے ۲ ستمبر ۱۹۲۰ء کو قبضہ کر لیا۔ ۵ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو بخارا میں پہلی قرولتائی (عوامی نمائندوں کی کانگریس) کا اجلاس

ہوا۔اس نے بخارا کو سوویت عوامی ریپبلک اعلان کر دیا۔۳ نومبر ۱۹۲۰ ار کو روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک اور بخارا ریپبلک کے درمیان سیاسی اور فوجی معاہدہ ہوا۔ روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک اور بخارا کی سوویت عوامی ریپبلک کے درمیان ایک معاشی معاہدے پر دستخط کیئے گئے۔اس کے تحت دونوں ریپبلکوں نے اپنی معاشی پالیسیوں اور منصوبوں کو مربوط کرنے کی ذمے داری لی۔ روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک نے بخارا کی ریپبلک کو ۵ ارب روبل قرضہ دیا جس کی ادائیگی ضروری نہ تھی۔ روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کے تعاون کی بدولت بخارا میں معیشت اور ثقافت کی تیز ترقی ممکن ہوئی۔

اشتراکی حکومتوں کا آغاز

انقلاب برپا کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام انقلاب کو انقلاب دشمنوں کے کھلم کھلا اور خفیہ حملوں سے محفوظ و مامون رکھنا ہوتا ہے اور انقلاب کی حفاظت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ عوام کے مسائل کو حل کیا جائے تاکہ ان کو انقلاب کی اہمیت کا احساس ہو اور جیسے جیسے یہ احساس ہوگا ویسے ہی وہ اس انقلاب، اس سماجی تبدیلی کی مدافعت کے لئے سینہ سپر ہونگے چنانچہ وسطی ایشیا اور سوویت روس کی کمیونسٹ پارٹیوں نے انقلاب کو محفوظ و مامون رکھنے کے لئے عوام کے مسائل کو تیزی سے حل کرنے کی طرف قدم اٹھانا شروع کیا۔ چنانچہ اس انتہائی کٹھن دور میں ان خطوں کے عوام کی زندگی میں زبردست معاشی اور ثقافتی تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں اور اسی زمانے میں اشتراکی معاشی ڈھانچے کی بنیاد رکھی گئی اور اسی عہد میں لوگوں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں دوررس تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ چنانچہ جہاں تک ترکستان کا تعلق ہے وہاں ۱۹۱۸ء کے وسط تک تمام صنعتوں پر مزدور کا کنٹرول قائم ہوگیا۔ بنکوں ذرائع نقل و حمل اور بیرونی تجارت کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ اناج کے حصول اور خرید و فروخت پر ریاست کی اجارہ داری قائم کر دی گئی، دیہات میں زرعی اصلاحات کو عملاً نفاذ کے لئے غریب کاشت کاروں، مزارعوں اور دستکاروں کی نگراں کمیٹیاں قائم کر دی گئیں ان صنعتوں اور ریلوں کو قومی ملکیت بنانے سے پرولیتاریہ کی آمریت کی معاشی بنیاد پڑ گئی۔ مزدوروں کے کنٹرول کی تحریک خود بخود ۱۹۱۷ء کے آخر

میں شروع ہوئی اور سوویت اقتدار نے اسے سرمایہ داروں کی تخریبی سرگرمیوں کے خلاف طبقاتی جدوجہد کی ایک شکل کی طرح استعمال کیا جو پیداوار کو گھٹانے اور صنعتوں میں بدنظمی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سوویت اقتدار نے مزدوروں کے کنٹرول کو نہ صرف طبقاتی جدوجہد کی ایک شکل کے لئے بلکہ صنعتوں کے نظم و نسق کے کام میں مزدوروں کو تربیت دینے کے لئے بھی بڑی اہمیت دی۔ یہ منصوبہ بند اشتراکی پیداوار کے قیام میں ایک اہم منزل ثابت ہوا۔

•

مارچ ۱۹۱۸ء میں بنک کے ملازمین کی تیسری غیر معمولی کانگریس کا اجلاس تاشقند میں ہوا۔ کانگریس نے بنکوں کو قومیانے کے مسئلے پر غور کیا اور اپنے علم اور تجربے سے سوویت حکومت کو مدد دینے پر تیاری ظاہر کی۔ ۱۹۱۸ء کے مئی کے آخر تک بنک قومی ملکیت بنا لئے گئے اور قرضے کا پورا نظام سوویت حکومت کے ہاتھ میں آگیا۔ بنکوں کو قومی ملکیت بنا کر سوویت حکومت نے بورژوازی کو معاشی غلبے کے اہم ترین حربے سے محروم کر دیا۔

ذرائع نقل و حمل ریلوں کو قومی ملکیت بنانے سے بھی اشتراکی معیشت کی تنظیم میں بڑی مدد ملی۔ یکم مارچ ۱۹۱۸ء کو سمی ریچ یے کی ریلوے قومیائی گئی اور پھر ۱۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو فرغانہ ریلوے اور اپریل ۱۹۱۸ء میں بخارا ریلوے۔

مارچ۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں نہ صرف انفرادی کارخانے بلکہ اہم صنعتوں کی پوری کی پوری شاخیں قومی ملکیت بنالی گئیں۔ ۵ مارچ ۱۹۱۸ء کو عوامی کمیساروں کی کونسل کے ایک فرمان کے ذریعہ کپاس تمام صنعتوں اور اس کی ذیلی شاخوں مثلاً صابن، بنولے کے تیل وغیرہ کے کارخانوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ کپاس کی نجی خرید و فروخت پر پابندی لگا دی گئی اور کپاس کے بڑے ذخیروں پر قبضہ کر لیا گیا۔ اسی مہینے میں کوئلے اور تیل کی صنعتیں بھی قومی ملکیت بنالی گئیں مارچ کے آخر اور اپریل کے شروع میں ارال میں مچھلی کی صنعت، چھاپے خانوں، آٹے، چاول اور شکر کی ملوں کو قومیا لیا گیا۔

جون ۱۹۱۸ء میں پورے علاقے میں قومی ملکیت بنائی ہوئی صنعتی وحدتوں کی تعداد ۲۰۵ تھی، جولائی میں ۲۴۵ اور ستمبر میں ۲۸۳۔ سال کے آخری نصف میں بہت سی درمیانی اور

چھوٹی صنعتوں کو بھی قومی ملکیت بنالیا گیا۔ لیکن یہ غلطی تھی، ضرورت سے زیادہ نظریاتی جوش و خروش کا نتیجہ۔ ابتدا میں قومی ملکیت بنانے کے جوہر کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ قومیائے ہوئے ادارے کا نظم ونسق کارخانے کے مزدوروں کی کمیٹی کے ذریعہ چلایا جاتا تھا جو اشتراکی انقلابیوں کے خیالات کے زیر اثر کارخانے کو ایک معین افراد کے مجموعے کی ملکیت خیال کرتی تھی۔ اس سے پیداوار میں بدنظمی پیدا ہوئی۔ لیکن عوامی کمیساروں کی کونسل نے مارچ ۱۹۱۸ء میں اس غلطی کو ایک فرمان کے ذریعہ دور کر دیا۔ پورے علاقے کی معیشت میں نظم پیدا کرنے کے لئے عوامی معیشت کی علاقائی کونسل قائم کی گئی۔ پھر اپریل ۱۹۱۸ء میں پیداوار کی علاقائی کونسل کی تشکیل ہوئی۔ اس کا کام پیداوار کو منظم کرنا، علاقے کی معاشی زندگی کو ضبط میں لانے کے لئے معیار اور منصوبے مرتب کرنا تھا۔ اس کے بعد یہ ادارہ عوامی معیشت کی اعلیٰ کونسل کی شکل میں از سر نو منظم کیا گیا لیکن اس کے فرائض وہی رہے جو پہلے تھے۔ ہر صوبے میں عوامی معیشت کی کونسل قائم کی گئی تاکہ وہ صنعتی اداروں کی رہنمائی کرے۔ جب اگست ستمبر ۱۹۱۹ء میں عوامی معیشت کی کونسلوں کی پہلی کانگریس ہوئی تو اس وقت ایسی ۱۸ کونسلیں موجود تھیں۔ ۱۹۱۹ء کے آخر تک ان کی تعداد ۴۰ تک پہنچ گئی۔ لیکن بعد میں جب بعض کو ایک دوسرے میں ضم کیا گیا اور بعض کو توڑ ڈالا تو یہ تعداد کم ہو گئی۔ عوامی معیشت کی کونسلوں کی دوسری کانگریس جولائی ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ اس نے معاشی تعمیر نو اور عوامی معاشی کونسلوں کی سرگرمیوں کے نتائج پر غور و خوض کیا۔ ۱۹۲۰ء کے آخر تک ان کی تعداد گھٹ کر ۴۰ سے ۱۷ رہ گئی۔ ۱۹۲۱ء میں صنعتی قسم کے ۸۶۹ ادارے تھے جن میں ۳۲۵۳۳ مزدور کام کرتے تھے۔ لیکن خانہ جنگی میں معاشی گڑبڑ کی وجہ سے تقریباً ۴۰۵ ادارے بے کار پڑے رہے۔

۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں ٹریڈ یونین کانگریس کا اجلاس ہوا اور وہاں اور اس نے کام میں نظم و ضبط کے سوال پر بحث کی۔ اس مسئلے پر کانگریس نے کئی سفارشات کیں۔ ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے لازمی کام کا معیار مقرر کیا اور اس کے کی خلاف ورزی کرنے پر سزا دینے کا معاملہ کارخانے کے مزدور ساتھیوں کے سپرد کر دیا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں ایک اور فیصلہ کیا گیا جس کے مطابق کارخانوں کو بہتر طور پر چلانے کی ذمہ داری معین کی گئی۔ خانہ جنگی کے ابتدائی مہینوں

میں غلطی سے جو دست کاری قومی ملکیت بنالی گئی تھی اسے اگست ۱۹۱۹ء میں بالکل منسوخ کر دیا گیا۔ دست کاروں سے کہا گیا کہ وہ کوآپریٹو میں متحد ہوں اور حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ انھیں خام مال اور آلات اوزار فراہم کرے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی لازمی قرار دیا گیا کہ وہ اپنی پیداوار صرف ریاستی تجارتی تنظیموں کو فروخت کریں۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں پانچویں علاقائی پارٹی کانفرنس ہوئی۔ اس نے تفصیل سے معیشت کی از سرِ نو بحالی کے سوال پر بحث کی کانفرنس نے ایک منصوبہ پیش کیا جس میں موجود صنعتی اداروں کو مستحکم کرکے اور دستکاری کو فروغ دے کر پیداوار حاصل کرنے کی تجویز کی گئی۔ فرونزے نے مختلف تعمیری کاموں میں فوج کے ایک حصے کی رہنمائی کی۔ لوگوں نے رضاکارانہ طور پر ریلوے لائنیں صاف کیں، پل اور سڑکوں کی مرمت کی اور ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کو بحال کیا۔ ۵۰ برس تک کی عمر والے تمام لوگوں کے لئے محنت لازمی قرار دی گئی۔ ان تمام تدابیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ خانہ جنگی سے معیشت کو جو سخت نقصان پہنچا تھا اس کی ایک حد تک تلافی ہو گئی۔

خانہ جنگی کے زمانے میں زراعت میں بھی چند اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ روس کے مرکزی علاقوں میں دیہات کی اشتراکی تبدیلی ۱۹۱۸ء کے وسط میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ترکستان میں زراعت میں اشتراکی انقلاب آہستہ آہستہ ہوا اور اس کی تکمیل بہت بعد میں ہوئی۔ لیکن پھر بھی اکتوبر انقلاب کے بعد پہلے مہینوں میں ہی بعض اہم اقدام کئے گئے۔ سودیتوں کی دوسری کل روسی کانگریس میں لینن کا زمین کے تومیانے کے متعلق جو فرمان منظور کیا گیا تھا اسے عملی جامہ پہناتے ہوئے زمین کے انتظام کی ترکستان کمیساریت نے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے زمین کا لین دین بند کر دیا گیا۔ زمین کو لگان پر اٹھانے کی اجازت صرف غیر معمولی حالات میں دی گئی، اور بھی زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لئے مقامی کمیٹی کی اجازت سے اور مقامی سودیت کی تصدیق کے بعد۔ زمین کمیٹیوں کی تنظیم کے متعلق عارضی حکومت کا فرمان تبدیل کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں عوامی کمیساروں کی کونسل نے سکونت کے انتظامیہ کو ہدایت دی کہ وہ باہر سے آنے والوں کو زمین تقسیم نہ کرے۔ بعد میں کئی بڑی املاک کو قومی ملکیت بنا لیا گیا۔ عوامی کمیساروں کی کونسل نے ۱۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت

تمام نہروں اور رو دباروں کو کمیساریت زمین کے سپرد کر دیا گیا۔ ترکستان میں سودیت اقتدار کی زمین پر مرتب شدہ پالیسی کے متعلق ان بنیادی اصولوں کی تصدیق مرکزی انتظامیہ کمیٹی اور عوامی کمیساروں کی کونسل نے ایک خاص قانون میں کی جو ۱۷ نومبر ۱۹۲۰ء کو منظور کیا گیا۔ اس کی پہلی دفعات میں بیان گیا گیا کہ تمام زمین اور پانی جو ترکستان ریپبلک کے علاقے میں واقع ہیں عوام کی ریاستی ملکیت ہیں۔

لیکن زرعی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے وقت بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ زمینداری اور جاگیرداری کو ختم کرنے کا عمل بہت آہستہ آہستہ ہوا اور اس نے صرف ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان تکمیل پائی۔ اس دیر کا سبب ترکستان کے مخصوص حالات تھے۔ معاشی معاشرتی تعلقات کی پسماندگی، روس کے مرکزی علاقوں کے مقابلے میں یہاں کے کسانوں کے شعور اور تنظیم میں نسبتاً آہستہ ترقی، سر قبیلی قبائلی حالات میں کسانوں پر جاگیرداروں اور ملاؤں کا اثر اور بسماچیوں کے خلاف طویل جدوجہد۔

لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود اس دور میں زراعت کی اشتراکی تنظیم نو کی جانب ابتدائی اقدام کئے گئے۔ ۱۹-۱۹۱۸ء میں ترکستان میں ۴۰۰ زرعی کمیون اور کوآپریٹو قائم ہوئے۔ ان کا مجموعی رقبہ ۳۵ ہزار دلیاتین (ایک دلیاتینا ۲٫۷ ایکڑ) تھا اور ان پر ۴۰ ہزار کسان کام کرتے تھے یہ قدیم کمیون صرف گزارے کی سطح پر کام کرتے تھے اور ان کی معاشی اور ٹیکنیکی بنیاد مضبوط نہیں تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے مشکل زمانے میں دیہات میں کھیت مزدوروں اور غریبوں کی غذائی ضروریات پوری ہو جائیں۔ یہ کمیون بالکل رضاکارانہ بنیاد پر تھے۔ انفرادی کسان کی معیشت کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ جب مرکز سے غلہ پہلے کی طرح درآمد ہونے لگا تو ان کمیونوں کی ضرورت ختم ہو گئی اور وہ توڑ دئے گئے۔ لیکن انھوں نے ایک خدمت انجام دی۔ زمینداروں اور دولت مند کسانوں کے اس پروپیگنڈے کا پردہ چاک کیا کہ اجتماعی کاشت ممکن نہیں۔ کمیونوں کے علاوہ ترکستان میں ۱۷ ریاستی فارم بھی قائم کئے گئے جن کا کل رقبہ ۲۸۵۰۰ دلیاتین تھا۔ ابتدا میں ان فارموں کو بھی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مویشیوں کی

سخت کمی تھی اس لئے زمین کسانوں کو بٹائی پر دے دی گئی۔ انھیں فصل کا ۸۰ سے ۸۷ فیصدی تک حصہ ملتا تھا۔

سوویت اقتدار نے سیمی رتیچ یے میں زرعی اصلاحات پر خاص طور سے توجہ دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں روسی آباد کاروں کو زمین دینے اور بہترین زمین سے خانہ بدوشوں کی بے دخلیوں کی بدولت مقامی قرغیزوں کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔ اور جب اسے قرغیزوں کے خلاف ۱۹۱۶ء کی مسلح بغاوت کی پاداش میں بطور سزا استعمال کیا گیا تو روسی نوآباد کاروں کو زمین کے اور بھی زیادہ بڑے بڑے قطعے دئے گئے۔ ترکستان میں سوویت اقتدار کے پہلے دو برسوں میں مختلف وجوہ کی بنا پر سیمی رتیچ یے میں زرعی اصلاحات کے مسئلے کو حل نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ سوویت اور پارٹی کے اداروں پر دولت مند کسانوں کا تھوڑا بہت اثر بھی تھا۔ اس کے سبب بھی زرعی اصلاحات نافذ نہیں کی جا سکیں۔

ترکستان کمیشن نے سیمی رتیچ یے میں زرعی اصلاحات کا مسئلہ حل کرنے میں توانائی اور استقلال بخشا۔ سب سے پہلے اس نے پارٹی اور سوویت اداروں کو بیگانہ طبقاتی عناصر سے پاک کیا۔ چین میں مقیم قرغیز مہاجروں کی واپسی میں آسانیاں فراہم کرنے کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ ۴ مارچ ۱۹۲۰ء کو مقامی محنت کش کسانوں کی ضبط شدہ زمینوں کو واپس کرنے کے متعلق فرمان جاری کیا گیا۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے زمین کا عارضی بندوبست کیا۔ چین سے واپس آنے والے قرغیز مہاجروں کے بسانے پر ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ روبل کی رقم خرچ کی گئی۔ سوویتوں کی نویں علاقائی کانگریس نے بھی یہ ہدایت کی کہ ۱۹۱۶ء – ۱۸ میں مقامی کسانوں اور خانہ بدوشوں سے روسی نوآباد کاروں نے جو زمینیں چھینی ہیں وہ سب واپس کر دی جائیں۔ اس نے باہر کے لوگوں کے ترکستان میں بسنے اور مقامی لوگوں کی زمین پر قبضہ کرنے پر پابندی لگا دی۔ اس لئے زرعی اصلاحات کے سلسلے میں اقدام پہلے ان علاقوں میں کئے گئے جہاں روسی مالدار کسانوں کے آباد ہونے سے مسئلہ نے قومی شکل اختیار کر لی تھی یہ بات بالکل قدرتی تھی کیونکہ مقامی زمیندار اپنے طبقاتی مفاد میں حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر قومی نفرت

پھیلا رہے تھے

خانہ جنگی کے زمانے میں سوویت حکومت نے زرعی معیشت کو قبل از جنگ کی سطح پر بحال کرنے کے لئے کافی کام کیا۔ ۱۷ مئی ۱۹۲۰ء کو لینن نے ایک فرمان پر دستخط کئے جس کے مطابق مرکزی حکومت نے ترکستان میں آبپاشی کا نظام تعمیر کرنے کے لئے ۵ کروڑ روبل منظور کئے۔ ۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو انھوں نے روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کی عوامی کمیساروں کی کونسل کے ایک اور فیصلے پر دستخط کئے جو ترکستان اور آذربائجان میں کپاس کی کاشت پھر سے شروع کرنے کے متعلق تھا اس عوامی کمیساروں کی کونسل نے اپریل ۱۹۱۸ء میں ترکستان میں کپاس کی کاشت کی بہتری اور سوتی صنعت کے لئے ۵۰ کروڑ ۲ لاکھ روبل کی منظوری دی۔ اس کے فوراً بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ترکستان میں کپڑے کی دو ملیں منتقل کی جائیں۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۱۸ء کے مقابلے میں کپاس کی کاشت کئے جانے والے رقبے میں ۳ لاکھ دیسیاتین کا اضافہ ہوگیا۔ سوویت اقتدار نے زمین کے علاوہ کسانوں کو آلات اور مویشی فراہم کرنے میں مدد دی۔ جو کسان کپاس پیدا کرنے تھے انھیں آسان شرطوں پر پیشگی قرضہ دیا گیا اور اچھے بیج اور کھاد بھی فراہم کی گئی۔ ان تمام مالی ترغیبات کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ۱۹۲۰ء میں پچھلے سال کے مقابلے میں کپاس کئے جانے والا رقبہ ۱۲ ہزار دیسیاتین مزید بڑھ گیا لیکن ان کوششوں کے باوجود ۱۹۲۰ء میں کپاس کی کاشت کیا جانے والا رقبہ ۱۹۱۵ء کے مقابلے میں صرف ۳۵ فیصدی تھا۔

خانہ جنگی کے زمانے میں غذائی مسئلے نے شدت اختیار کرلی۔ ترکستان مدت سے غذا کے معاملے میں خسارے کا علاقہ تھا۔ اناج کی فراہمی میں وہ ہمیشہ مرکزی روس پر تکیہ کیا کرتا تھا جہاں سے سالانہ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ پوڈ سے لے کر ایک کروڑ ۵۰ لاکھ پوڈ تک اناج برآمد ہوتا تھا۔ اکتوبر انقلاب سے پہلے کے تین برسوں میں فصل خراب ہوئی تھی۔ اس نے مسئلے کو اور زیادہ سنگین بنا دیا۔ ۱۹-۱۹۱۸ء میں ترکستان کی عوامی کمیساروں کی کونسل نے ۲ کروڑ روبل اناج خریدنے کے لئے منظور کئے۔ کھلی منڈی میں بھاؤ روزانہ بڑھتے رہتے تھے۔ اس لئے حکومت کو مقررہ قیمت پر اناج بیچنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ حکومت

کو کسانوں پر جنس کا ٹیکس عائد کرنا پڑا۔ فصل کا ۴ فیصدی۔ منصوبہ ۲ کروڑ پوڈ جمع کرنے کا تھا لیکن صرف ۴۵ لاکھ پوڈ اناج حاصل کیا جاسکا۔ ان حالات میں انتظامیہ کمیٹی نے ایک فرمان کے ذریعے اناج کو ریاست کی تحویل میں لے لیا۔ شہروں میں غذا کا راشن مقرر کر دیا گیا۔ ہر شخص کو معاشرتی بار آوری کے مطابق روزانہ ایک چوتھائی پونڈ سے لے کر ایک پونڈ روٹی ملنے لگی۔ مجموعی طور پر سوویت انتظامیہ نے غذائی پالیسی کو مسخ کئے بغیر کامیابی سے عملی جامہ پہنایا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض معاملات میں حکام نے انفرادی طور پر دیہات میں غلہ حاصل کرتے وقت قومی امتیاز برتا اور سختیاں کیں۔ ایسی غلطیوں اور زیادتیوں کی پارٹی اور سوویتوں کی کانگریسوں نے ہمیشہ سختی سے مذمت کی ۱۱ جولائی ۱۹۱۸ء کو ترکستان کی انتظامیہ کمیٹی نے اناج اور دوسری تیار شدہ اشیا کی قومی امتیاز سے بری مساوی تقسیم کے متعلق متفقہ طور سے تجویز منظور کی۔

سوویت اقتدار نے دیہات کے غریبوں کو منظم کرنے پر بڑی توجہ دی۔ غریبوں کی کمیٹیاں قائم کرنے کا کام ۱۹۱۸ء کی بہار سے شروع ہوا جنھوں نے آئندہ زرعی اصلاحات کے نفاذ میں بہت مدد دی۔ سوویتوں کی چھٹی علاقائی کانگریس نے فیصلہ کیا کہ ان کمیٹیوں کو غربت کے خلاف جدوجہد میں شامل کرایا جائے۔ ان میں سے بعض نے واقعی شاندار کام انجام دیا۔ لیکن یہ قومیتوں کے بورژوا قوم پرستوں نے دیہات میں ان کی تنظیم کو روکنے کی بے حد کوشش کی۔ ری سکولوف کی رہنمائی میں انھوں نے غیر روسی علاقوں میں زرعی اصلاحات کو ٹالنا چاہا۔ ان کا مقصد طبقاتی شعور کو دبانا اور قوم پرستوں کو ابھارنا تھا۔ ترکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی پانچویں کانگریس اور سوویتوں کی نویں کانگریس نے ۱۹۲۰ء میں فیصلہ کیا کہ وسیع پیمانے پر دیہات کے غریبوں کی یونین کوش چی منظم کی جائے۔

ثقافتی میدان میں بھی ترکستان میں خانہ جنگی کے برسوں کے دوران عظیم کام انجام دیا گیا۔ ۱۹۱۸ء سے سوویت اسکول بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے لگے۔ پہلے تعلیم و تدریس ملاؤں کی جاگیر تھی اس لئے نئے اسکولوں کو ان کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ مقامی مدرسوں اور علمی اصلاحات نہ ہونے سے مشکلات اور بڑھ گئیں۔ لیکن ان

سب کے باوجود سوویت اقتدار کے پہلے برسوں میں تعلیم کے میدان میں کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں ترکستان میں ۲۰۲۲ پرائمری اسکول تھے جن میں ۱۶۵۱۲۲ بچے پڑھتے تھے۔ ان میں سے ۹۷۰۰۰ مقامی قومیتوں کے بچے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں تعلیم کا بجٹ ۳۳ لاکھ ۵۰ ہزار روبل تھا جو ۱۹۲۰ء میں بڑھ کر ۶۵ لاکھ ہوگیا۔ مدرسوں کی تربیت کے لئے مختصر عرصے کے نصاب شروع کئے گئے۔ ۱۹۲۰ء تک ۱۰۴۹ لوگوں نے ایسے گیارہ نصابوں سے فراغت حاصل کی۔ اسی سال از سر نو تعلیم کے نصاب بھی شروع کئے گئے جنھیں ۱۰۶۲ مدرسوں نے مکمل کیا۔ تمام شہروں میں شام کے اسکول قائم کرنے کی مہم چلائی گئی۔ اس کا مقصد بالغوں میں ناخواندگی کو ختم کرنا۔ ترکستان میں ۱۹۲۰ء میں حرفتی اور ٹیکنیکل اسکولوں کی تعداد ۳۱ تھی اور ان میں ساڑھے پانچ ہزار افراد نے تعلیم حاصل کی۔

۲۱ اپریل ۱۹۱۸ء میں تاشقند میں ترکستان کی عوامی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ انقلاب سے پہلے ترکستان میں اعلیٰ تعلیم کا ایک بھی ادارہ نہیں تھا۔ یونیورسٹی میں پانچ شعبے تھے ۱۹-۱۹۱۸ء میں ۱۲سو طالب علموں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۲۰-۱۹۱۹ء میں یہ تعداد ۱۴سو ۷۰ تک پہنچ گئی۔ ۷ ستمبر ۱۹۲۰ء کو ایک فرمان کے مطابق جس پر لینن کے دستخط تھے ترکستان کی عوامی یونیورسٹی کو ترکستان ریاستی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔ وسطی ایشیا کے اس پسماندہ علاقے میں علم کی روشنی پھیلانے کے لئے ماسکو اور پیٹروگراد نے اپنے بہترین پروفیسر بھیجے۔ ۱۹۲۰ء میں اس یونیورسٹی میں ۲۶۴۱ طالب علموں نے تعلیم حاصل کی۔

خانہ جنگی کے زمانے ہی میں ترکستان میں سوویت دانش ور پروان چڑھے۔ حمزہ اور ذوقی جیسے روشن خیال جمہوریت پسندوں کی بولشویکوں کی حمایت اور بورژوا قوم پرستوں کے خلاف ان کی جدوجہد کو وسطی ایشیا میں سوویت دانشوروں کے ارتقا کی ایک نئی منزل کہنا چاہیئے۔ سوویت اقتدار کی جدوجہد ہی کے دوران فرغانہ میں ازبیک تھیٹر کھلا۔ اس کے بانی حمزہ تھے۔ اسی سال تاشقند میں موسیقی کا کالج قائم ہوا جس نے ازبیک اور تاجک موسیقی کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں سوویت قومی پریس اور کتابوں کی طباعت کی ابتدا ہوئی۔ یہ ابتدائی ۲۰-۱۹۱۸ء تک کے سال ہی تھے جن میں قزاخ، تاجک

اورازبک زبانوں میں گیارہ اخبار شائع ہوتے شروع ہوئے۔ ساتھ ساتھ زبانوں کی ترقی کی طرف خاص توجہ شروع ہوئی چنانچہ اسی زمانے میں ازبک رسم الخط کو بدلنے کی ابتدائی کوششیں شروع کی گیئں اور ازبک زبان میں جن علامتوں کی ضرورت نہیں تھی انہیں متروک کردیا گیا اور زبان کی آوازوں کے مطابق نئی علامتیں شامل کی گیئں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خانہ جنگی محض تباہی و بربادی کا زمانہ ہی نہ تھا بلکہ یہ عہد افزون دور بھی تھا جس میں نئی زندگی انگڑائیاں لے رہی تھیں، عوام کے دلوں میں امیدوں کی شمعیں روشن ہورہی تھی دلفریب مستقبل کے سہانے سپنے ان کو انتھک جدوجہد کے لئے اکسا رہے تھے

بخارا اور خیوا کا انقلاب

ان خطوں میں ترکستان کے مقابلے میں جیسا کہ بیان کرچکا ہوں انقلاب قدرے دیر سے کامیاب ہوا اور اس میں مصائب بھی زیادہ برداشت کرنے پڑے یہاں انقلاب دو سال بعد کامیاب ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں بخارا اور خیوا میں جو عوامی انقلاب ہوا اس نے کسانوں کی سوویتوں کی شکل میں محنت کش لوگوں کا اقتدار قائم کیا۔ انقلاب کی روح رواں قوتیں غریب کسان اور دستکار تھے اور انہیں سرخ فوج کی سرگرم امداد حاصل تھی۔ بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ بخارا اور خیوا میں انقلاب کی نوعیت بورژوا جمہوری تھی اور ان ریپبلکوں میں معاشرتی ڈھانچہ بھی بورژوا جمہوری تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بخارا اور خیوا میں انقلاب نے سب سے پہلے بورژوا جمہوری انقلاب کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے علاقوں میں جہاں جاگیردارانہ نظام غالب ہو وہاں اشتراکی انقلاب کا اولین فریضہ ازمنہ وسطی کے جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنا ہے۔ اس لئے ان علاقوں میں بھی انقلاب کی نوعیت کو بورژوا جمہوری ہونا تھا۔

جن مخصوص تاریخی حالات میں بخارا اور خیوا میں انقلاب ہوا انھوں نے بھی اس کا کردار معین کیا۔ روس میں عظیم اکتوبر انقلاب کی کامرانی اور سوویت اقتدار کے قیام کا بخارا اور خیوا کے انقلاب کی نوعیت معین کرنے میں بڑا ہاتھ تھا۔ وہاں بورژوازی نے کسانوں

کی سوویتوں کو اپنی طبقاتی حکمرانی کے لئے استعمال کرنے اور سرمایہ دارانہ نظام قائم کر کے انقلاب کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی لیکن ان ریپبلکوں کے عوام نے جن پر اکتوبر انقلاب کا زبردست اثر تھا۔ بورژوازی کی تمنا پوری نہیں ہونے دی۔ ابتدا ہی سے انھوں نے انقلاب کو پروان چڑھانے اور کسانوں کی سوویتوں کو عوامی سوویت نظام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کی۔

بخارا اور خیوا میں انقلاب عوامی سوویت ریپبلکوں کے قیام کے بعد ختم نہیں ہوا۔ یہاں معاشرے کی انقلابی تنظیم تو اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ یہ اشتراکی ریپبلکس نہ بن گیئں۔ بخارا، آذربائیجان اور آرمینیا میں سوویت ریپبلکوں کے قیام اور استحکام کا خیر مقدم کرتے ہوئے لینن نے سوویتوں کی آٹھویں کل روسی کانگریس میں دسمبر ۱۹۲۰ء میں کہا تھا۔

"یہ ریپبلکیں اس حقیقت کا ثبوت ہیں اور تصدیق کرتی ہیں کہ سوویت حکومت کے خیالات اور اصول نہ صرف صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں میں، جہاں پرولیتاریہ ان کی معاشرتی بنیاد ہے، سمجھے جاتے ہیں اور وہ وہاں فوراً عمل میں لائے جا سکتے ہیں، بلکہ ان ملکوں میں بھی جہاں کسان ان کی معاشرتی بنیاد ہے۔ کسانوں کی سوویتوں کا تصور فتحیاب ہو گیا کسانوں کے اقتدار کو ضمانت مل گئی ہے۔ اب وہ زمین اور ذرائع پیداوار کے مالک ہیں۔ ہماری پالیسی کے عملی نتائج نے کسانوں کی سوویت ریپبلکوں اور روسی اشتراکی ریپبلک کے درمیان دوستانہ تعلقات کو مستحکم بنا دیا ہے۔"

آرمینیا اور آذربائیجان میں کسانوں نے سوویتوں کی وساطت سے مزدوروں کے ساتھ اپنا طبقاتی تعلق قائم کیا اور اپنی ریپبلکوں کو فوراً اشتراکی ریپبلکوں میں تبدیل کر دیا۔ اسی عمل کے پورے ہونے میں خیوا اور بخارا کو تین چار سال لگے۔

بخارا اور خیوا میں انقلاب نے بڑے جاگیرداروں اور ملاؤں کا اقتدار الٹ دیا۔ اقتدار کسانوں کی سوویتوں کے ہاتھ میں آگیا۔ بخارا میں ۷۵۰۰ تاناب زمین ضبط کی گئی جو امیر اور اس کے رشتے داروں کی ملکیت تھی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک اقتدار عوام کے

ہاتھ میں تھا جسے وہ سوویتوں کے ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ عوام کے تمام حلقوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا صرف امیر اور خان کے رشتے دار اس حق سے محروم کر دیئے گئے تھے۔

ریاست کا اعلیٰ ترین ادارہ عوام کے نمائندوں کی کل بخارا کانگریس اور کل خوارزم کانگریس تھا۔ کانگریس ریپبلک کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کو منتخب کرتی تھی جو کانگریس کے اجلاسوں کے درمیان بلند ترین ادارے کے تمام کارہائے منصبی انجام دیتی تھی۔ عوامی ناظروں کی کونسل کا انتخاب بھی کانگریس کے ذریعے لایا ہوتا تھا۔ اور کونسل ریاستی انتظامیہ کا اعلیٰ ترین ادارہ تھی۔

مقامی جگہوں پر انتظامیہ کے ادارے مختلف سطح کی سوویتیں تھیں یعنی صوبائی، علاقائی اور اضلاعی۔ اور ان ہی کے مطابق انتظامی کمیٹیاں بھی تھیں۔ اقتدار کا سب سے ابتدائی ادارہ گاؤں یا قصبہ کے محلے میں عام جلسہ تھا۔

گاؤں کے عام جلسے مکھیا اور اکساکال منتخب کرتے تھے۔ انتخابات میں ریپبلکوں کے تمام شہری بلا لحاظ مذہب، جنس، نسل اور قومیت حصہ لیتے تھے۔ ایسے ریاستی نظام کی ضمانت ریپبلکوں کا آئین دیتا تھا۔ ان ریپبلکوں کے ریاستی اور معاشرتی ڈھانچے کا طرۂ امتیاز وسیع جمہوریت اور عوامی کردار تھا۔ اس لحاظ سے انھیں عام بورژوا جمہوریت کے مقابلے میں بلند و ارفع کہا جا سکتا ہے۔ وقتی طور پر بخارا عوامی سوویت ریپبلک اور خوارزم عوامی سوویت ریپبلک میں نجی ملکیت معیشت کی بنیاد رہی۔ شہریوں کو غیر محدود منقولہ اور غیر منقولہ جائداد رکھنے کا حق تھا بشرطیکہ یہ انھوں نے خود حاصل کی ہو یا ورثے میں ملی ہو۔ اس خصوصیت کی وجہ سے یہ ریپبلکیں اشتراکی ریپبلکوں سے ممتاز تھیں۔

اشتراکی ریپبلکوں کی طرف

ان ریپبلکوں میں آبادی کی اکثریت غریب کسانوں اور دستکاروں پر مشتمل تھی اس لئے حکومت کا اولین فریضہ ان کے حالات زندگی کو بہتر کرنا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے محصولات، تجارت اور دستکاری وغیرہ میں کئی اہم تبدیلیاں کی گئیں۔

بخارا میں کسانوں، مویشی بانوں اور دستکاروں پر ٹیکس کافی کم کر دیئے گئے۔ ۱۹۱۳ء میں کسانوں کو مختلف سالانہ ٹیکس اوسطاً ۵ء۱۲ روبل دینا پڑتے تھے۔ ۲۴-۱۹۲۳ء میں انھیں گھٹا کر ۸ روبل کر دیا گیا، یعنی ۳۷ فیصدی کم۔ خیوا میں بھی کسانوں پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کر دیا گیا۔

بخارا عوامی سوویت ریپبلک اور خوارزم عوامی سوویت ریپبلک میں تجارت اور صنعت کو قومی ملکیت بنا لیا گیا۔ بخارا میں صنعتی ادارے ۳۲ تھے جن میں ۲۵ کپاس صاف کرتے تھے۔ ان ہی کی بنیاد پر اشتراکی صنعت تعمیر کی جا سکی۔ خوارزم میں صنعتی اداروں کی تعداد ۳۱ تھی جن میں سے ۵ بیرونی سرمایہ داروں کی ملکیت تھے۔ بخارا اور خوارزم کی ریپبلکوں کے روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کے ساتھ مختلف معاہدوں اور تجارتی سمجھوتوں کے تحت کئی تجارتی ادارے اور دوسری جائدادیں جو زار کی حکومت اور روسی سرمایہ داروں کی ملکیت تھیں ان ریپبلکوں کے حوالے کر دی گئیں۔

بخارا ریپبلک اور خوارزم ریپبلک کی حکومتوں نے اپنے عوام کی ثقافتی اور تعلیمی ضرورت پر بڑی توجہ دی۔ صرف ۲۲-۱۹۲۱ء میں ۳۷ ابتدائی اور مڈل اسکول، ۳ لڑکیوں کے خاص اسکول، معلموں کی تعلیم کے ۲ انسٹی ٹیوٹ، بچوں کے لئے ۱۲ بورڈنگ اسکول کھولے گئے۔ ان میں بخارا میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ۳۰۵۰ تھی۔ ان کے علاوہ ایک حرفتی اسکول اور موسیقی کے ۴ اسکول بھی قائم کئے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ان تعلیمی اداروں میں ۴۰۵۶ افراد پڑھ رہے تھے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ انقلاب سے پہلے بخارا میں جدید تعلیم کا ایک بھی ادارہ نہیں تھا۔ خوارزم میں بھی تعلیم کے میدان میں کافی کامیابیاں ہوئیں۔ وہاں ۱۹۲۳ء میں ۲۹ اسکول اور دوسرے تعلیمی ادارے تھے جن میں ۱۳۶۲ لوگ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

اگر روسی مزدور طبقہ اور اس کی ریاست امداد نہ دیتے تو بخارا اور خوارزم کی ریپبلکوں میں اشتراکی صنعت کے قیام اور اپنے مزدور طبقے کی تشکیل کے لئے کئی دہائیاں درکار ہوتیں۔ ۱۹۲۳ء میں بخارا میں ۳۲ کارخانوں میں سے صرف ۷ چالو تھے۔ خیوا میں تو ایک

بھی کارخانہ کام کرنے کے قابل نہ تھا۔ ان ریپبلکوں میں شہر اور قصبے عام دستکاری کے مرکز تھے اور وہاں تجارتی سرمایہ حاوی تھا۔ بڑی تیس تجارتی فرموں کا سرمایہ قومی ملکیت بنائے ہوئے کل اداروں کے سرمایہ سے زیادہ تھا۔

ان مشکلات کے باوجود ریپبلکوں میں اشتراکیت کی جانب عبور کے لئے حالات تیزی سے پختہ ہوئے۔ اس کی جزوی وجہ اس وقت کی سیاسی حالت بھی تھی۔ ان ریپبلکوں میں نوجوان بخاری اور نوجوان خیوائی کمیونسٹ پارٹی کی صفوں میں اتنی بڑی تعداد میں شامل ہو گئے تھے کہ ۱۹۲۲ء بخارا میں پارٹی ممبروں کی تعداد ۱۶ ہزار تک پہنچ گئی۔ قوم پرست زمیندار اور تاجر ریاست کے اعلیٰ اداروں میں گھس آئے۔ جیسا کہ استالین نے روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی مرکزی کمیٹی کی چوتھی کانفرنس میں کہا کہ بخارا کی ناظروں کی کونسل میں ایک دہقان بھی نہیں اور تمام عہدوں پر معاشرے کے استحصال کرنے والے عناصر چھے ہوئے ہیں۔ یہی حالت خوارزم کی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس کا حکومت کی پالیسیوں کے عمل درآمد پر اثر پڑا۔ استالین نے کانفرنس کو بتایا کہ بخارا کے ریاستی بنک نے ۷۵ فیصدی قرضہ نجی تاجروں کو دیا اور صرف ۲ فیصدی کسانوں کے کوآپریٹوڈں کو۔ اس کے علاوہ بخارا اور خیوا کے قوم پرست ازبیکوں اور ترکمانوں کے درمیان قومی منافرت پھیلاتے تھے۔ بخارا ریپبلک میں اقتدار کے اداروں پر جو بورژوا ازبیک قوم پرست حاوی تھے وہ ترکمانوں اور تاجکوں کے خلاف قومی امتیاز برتتے تھے۔ خیوا میں جہاں ازبیکوں اور ترکمانوں کے بالائی حصوں میں تعلقات بہت مخاصمانہ تھے رجعت پرست ترکمانی قبائلی سردار اپنے مفاد کے لئے حالات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ خوارزم ریپبلک کی حکومت جو زیادہ تر نوجوان خیوائیوں پر مشتمل تھی ایسی ہی رجعت پرست پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ اس سے عام لوگوں میں غصہ پیدا ہوا۔ انھوں نے ۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو حکومت برطرف کر دی اور کئی ناظروں کو گرفتار کر لیا۔ ایک انقلابی کمیٹی قائم کی گئی جس کا کام دوسری کانگریس منعقد کرنے کی تیاری کرنا تھا۔

بخارا ریپبلک میں بھی حکومت کے بورژوا قوم پرست ارکان نے عوام کے خلاف

سازشیں کیں۔ ان میں بہت سوں کا تعلق بسماچیوں سے تھا۔ ۱۹۲۱ کے آخر میں خود بخارا ریپبلک کے صدر عثمان خواجہ نے ایک نیا بسماچی گروہ منظم کرنا شروع کر دیا۔ بسماچیوں کی رہنمائی کرنے کے لئے اتحاد ترک کے رہنما انور پاشاہ کو مدعو کیا گیا۔ ان کی رہنمائی میں وسطی ایشیا کے تمام بسماچی گروہ متحد ہو گئے۔ ان واقعات نے بخارا ریپبلک اور خوارزم ریپبلک کی ترقی میں بڑی مشکلات پیدا کیں۔ اور بورژوا قوم پرستوں کی عوام دشمن پالیسی سے لوگوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ چنانچہ محنت کش عوام کی سیاسی سرگرمی میں اضافہ ہونے لگا۔ بسماچیوں کے خلاف جدوجہد میں غریب کسان اور دستکار سرخ فوج کے شانہ بشانہ لڑے۔ بسماچیوں نے عام زندگی کو اتنا اتھل پتھل کر ڈالا تھا کہ ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں ۱۹۲۳ء میں بخارا کے کاشت کاروں کی تعداد ۲۸،۷ فیصدی کم ہو گئی اور خانہ بدوشی ۱۵،۷ فیصدی بڑھ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بسماچیوں کے خلاف غریب کسانوں نے جوش و خروش سے سرخ فوج کا ساتھ دیا اور بورژوا قوم پرست بسماچیوں سے جا ملے۔ مثلاً وزیر جنگ عارفوف۔

سوویت اشتراکی ریپبلکوں کی یونین کی حکومت اور روسی کمیونسٹ پارٹی (بالشویک) کی مرکزی کمیٹی نے بخارا اور خیوا کے محنت کشوں کو ان کے مشکل دنوں میں بڑی مدد کی بسماچیوں سے ان کی لڑائی میں امداد دینے کے لئے کئی کہنہ مشق پارٹی رہنما اور فوجی کمانڈر بھیجے گئے۔ غذائی اشیا اور صنعتی سامان کی شکل میں ان کی مالی کفالت بھی کی گئی اور جو نیکیدزے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی جانب سے بخارا آئے اور آتے ہی پارٹی اور ریاست کے کام کو بہتر کرنے میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے پارٹی اور حکومت کو بیگانہ طبقاتی عناصر اور قوم پرستوں سے صاف کرنے میں بڑی قابلانہ رہنمائی کی۔

بخارا ریپبلک اور خوارزم ریپبلک کے لئے، سوویت یونین کی مالی امداد اور ٹیکنیکی رہنمائی کے بغیر، اپنی معاشی حالت کو بہتر کرنا مشکل تھا۔ ۱۹۲۳ء میں روسی فیڈریشن سے ۷،۱ لاکھ روبل کی مالیت کا سامان بخارا کو بھیجا گیا۔ روسی فیڈریشن نے بخارا ریپبلک کے ساتھ تجارتی سمجھوتہ کیا جو بخارا کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ بخارا کی کپاس کی قیمت خرید ۱۵،۵ روبل فی پوڈ مقرر کی گئی حالانکہ لاگت ۱۰ روبل تھی۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں تقریباً ۲۷۶۵۱۵ روبل

کی قیمت کا استعمالی سامان اور زرعی آلات خوارزم ریپبلک کو دیئے گئے۔ اسی عرصے میں اسے ۲۵ ہزار پوڈ شکر، ایک ہزار پوڈ کھالیں، جوتوں کے ۲۵ ہزار جوڑے اور ۴ ہزار پوڈ چائے فراہم کی گئی۔ روسی فیڈریشن نے خیوا ریپبلک کو ۵ لاکھ ۷۰ ہزار روبل کا قرضہ بھی دیا تاکہ وہ کپاس صاف کرنے کی ملوں اور بنولے کا تیل پیلنے والے کارخانوں کو بحال کر سکے۔

بخارا میں قوم پرست عناصر نے ہر ممکن کوشش کی کہ بخارا سوویت روس سے متحد نہ ہو۔ اس طرح انھوں نے بخارا عوامی سوویت ریپبلک کی پہلی کانگریس کی ہدایت کو ٹھکرایا۔ اس سے لوگوں میں غصہ پیدا ہوا۔ عوام کی بڑھتی ہوئی مخالفت کے پیش نظر بخارا ریپبلک کی انتظامیہ کمیٹی ناظروں کی کونسل سے چند وزیروں کو علیحدہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ان میں فطرت، نذر اللہ خواجہ، امینوف وغیرہ شامل تھے جن سے لوگوں کو نفرت تھی۔ جب کل بخارا کی چوتھی کانگریس کا انتخاب ہوا تو عوام نے بڑے سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا۔ غریب کسانوں اور دستکاروں میں سے کئی ارکان منتخب کئے گئے۔ ان میں تمام قومیتوں کے نمائندے تھے۔ مقامی قوم پرستوں کے خلاف جدوجہد میں روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی مرکزی کمیٹی نے بخارا کے کمیونسٹوں کی سرگرمی سے مدد کی۔ کانگریس کی ساخت سے طبقاتی قوتوں کے توازن کا پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ محافظ خانے میں دستاویزیں دستیاب ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی کانگریس کے ۲۵۴ مندوبین میں سے ۳۹۰ نے شرکت کی۔ ان میں کسان، ۲۷ مزدور، ۹۳ سرکاری ملازم، ۱۷ دستکار، ۷ دانشور اور دیگر ۹ تھے۔ جن نمائندوں کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا ان کی تعداد ۱۳۱ تھی۔ نمائندوں کی قومی ساخت کے لحاظ سے نئی کانگریس حقیقی کثیر قومی ادارہ تھی۔ اس میں ۲۲۳ ازبیک، ۱۸ تاجک، ۱۹ قرغیز، ۲۲ ترکمان اور ۱۱ یہودی تھے۔

۱۹۲۲ء میں بخارا اور خیوا کی کمیونسٹ پارٹیوں کی تطہیر کے نتائج بارآور نکلے۔ تطہیر کے بعد بخارا کی پارٹی کے ۱۶ ہزار ممبروں میں سے صرف ایک ہزار باقی رہ گئے۔ اس طرح پارٹی ممبروں کا معیار بڑھا اور ان کے طبقاتی شعور میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں بخارا کی

کمیونسٹ پارٹی کے ۱۵۶۰ ممبر تھے۔ ان میں ۳۵ فیصدی غریب کسان، ۱۳ فیصدی مزدور اور ۵ء۸ فیصدی دستکار تھے۔ تطہیر کے بعد خیوا کی پارٹی میں کل ۷۰۴ ممبر باقی رہے۔ ان میں ۵ ام کسان، ۷۰ مزدور، ۱۵۰ سرکاری ملازم، ۶۴ دستکار اور دیگر ام تھے۔

بخارا ریپبلک اور خوارزم ریپبلک میں جب سیاسی اور معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں ہوئیں تو ان کا لازمی نتیجہ آئینی اور قانونی تبدیلیوں کی شکل میں ظاہر ہونا تھا۔ اس طرح وہ اشتراکی ریپبلکوں میں تبدیلی کی منزل کی جانب بڑھنے لگیں۔ ۱۹۲۲ء کے آخر میں جب بسماچیوں کے آخری گروہ کو شکست دے دی گئی تو بخارا میں ان کا اثر تقریباً ختم ہو گیا۔ اسی عرصے میں جنید خان اور دوسرے ترکمان قبائلی سرداروں کے بسماچی گروہوں کو تباہ کر دیا گیا۔ ۱۹۲۳ء سے ان ریپبلکوں میں پرامن تعمیر نو شروع ہوئی۔ لوگوں کو مختلف تنظیموں میں منظم کرنے کا کام بہت کامیاب رہا۔ ٹریڈ یونین، کسان کمیٹی، نوجوان لیگ وغیرہ۔ ۱۹۲۳ء تک بخارا میں ٹریڈ یونینوں کی رکنیت ۵ء۱۶ ہزار ہو گئی۔ وہاں کسان کمیٹیاں بھی کامیابی سے منظم کی گئیں۔ خوارزم میں ان کی رکنیت ۱۹۲۳ء میں ۱۰ ہزار تھی۔ عام لوگ اشتراکی ارتقا کی جانب روز افزوں بڑھتے رہے۔ پڑوسی ترکستان خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک میں اشتراکی تعمیر نو کے مثبت تجربے نے خیوا اور بخارا کے لوگوں کو قائل کر دیا کہ انکی ریپبلکوں کو بھی ایسا ہی راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۹۲۳ء کے بعد بخارا اور خیوا میں لوگوں میں اپنی ریپبلکوں کو اشتراکی ریپبلکس بنانے کی خواہش واضح طور سے نظر آنے لگی۔ اس کے لئے پہلی شرط استحصال کرنے والے طبقات کے نمائندوں سے نجات پا کر اقتدار کے اداروں کو پوری طرح جمہوری بنانا اور سوویت نظم و نسق کو مستحکم کرنا تھی۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ریپبلکوں میں یہ کام کامیابی سے انجام دیا جا چکا تھا۔

معاشی بحالی میں بھی بخارا اور خوارزم کی ریپبلکیں کافی کامیابیاں حاصل کر چکی تھیں۔ نئی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو تدابیر اختیار کی گئی تھیں ان کے مثبت نتائج۔ زمین کے جس رقبے پر کپاس اور اناج کی کاشت کی جاتی تھی اس میں کافی اضافہ ہو

گیا۔ ۱۹۲۴ء میں بخارا میں کل زیر کاشت رقبہ تقریباً قبل از جنگ کی سطح تک پہنچ گیا، یہ ۵۴ لاکھ ۸۶ ہزار تاناب کے برابر تھا (۱۹۱۳ء میں ۵۹ لاکھ ۳ ہزار تاناب) کپاس کاشت کرنے والے رقبے میں سال بسال اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں ایک لاکھ ۳۶ ہزار پر اور ۱۹۲۴ء میں ایک لاکھ ۶۰ ہزار پر۔ کپاس کی کاشت میں ترقی کی وجہ سے کپاس صاف کرنے والے کارخانوں کی تیزی سے بحالی کی ضرورت ہوئی جو خانہ جنگی میں تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں کپاس صاف کرنے کے ۶ کارخانے چالو کئے گئے۔ حکومت نے مویشی بانی، خاص کر قراقل بھیڑوں کی نسلی افزائش کے لئے کئی تدابیر اختیار کیں۔ قراقل بھیڑیں خریدنے کے لئے خاص کوآپریٹو قائم کئے گئے۔ ان کوآپریٹوؤں کو ۲۰ لاکھ طلائی روبل کی امداد دی گئی۔

خوارزم میں بھی قبل از جنگ کی سطح تک معیشت کو بحال کرنے کے سلسلے میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ وہاں ۱۹۲۲ء میں ۸ ہزار دیسیاتین رقبے پر کپاس کی کاشت ہوئی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں وہ بڑھ کر ۳۰ ہزار دیسیاتین ہوگیا۔ ۱۹۲۴ء کے شروع میں ۶ کپاس صاف کرنے والے کارخانے بحال کئے گئے اور انھیں وسیع کیا گیا۔

بخارا اور خوارزم میں سوویت اقتدار کی توسیع اور اشتراکی تبدیلی کے پیچیدہ عمل، ان کی معاشی ترقی اور ترکستان ریپبلک کی بھی ترقی کا براہ راست تعلق وسطی ایشیا میں سوویت ریپبلکوں کے معاشی اتحاد سے تھا۔ یہ سوال روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی مرکزی کمیٹی نے فروری ۱۹۲۲ء میں اٹھایا تھا۔ مرکزی کمیٹی نے بتایا تھا کہ ایسے اتحاد سے خوارزم اور بخارا کی معیشت کو بحال کرنے اور اسے ترقی دینے میں انتہائی مدد ملے گی۔ بورژوا قوم پرست اس کے خلاف تھے۔ لیکن ان کی مخالفت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وسطی ایشیا کی ریپبلکوں کی تاشقند معاشی کانفرنس نے متحدہ معاشی پالیسی اور مشترکہ معاشی منصوبے کی بنیاد پر ان تینوں

ریپبلکوں کی معاشی سرگرمیوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کا فیصلہ کیا۔ تمام معاشی امور کے عام بنیادی اصول معین کرنے کا کام وسطی ایشیائی معاشی کونسل کے سپرد کر دیا گیا۔ اس

نے معاشی کانفرنس کی تیار کی ہوئی منظور شدہ ہدایات کو عملی جامہ پہنایا۔ کانفرنس نے زرعی اصلاحات، اندرونی اور بیرونی تجارت، مالیات، نقل و حمل، باہمی تعاون، ڈاک اور تار، آبپاشی کے مسائل پر بحث کی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ بخارا اور خوارزم میں ایک ہی سکہ چلایا جائے اور یہ روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کا سکہ ہو۔ ڈاک اور تار، دریائی نقل و حمل کا نظم و نسق وسطی ایشیا کی سطح پر متحد کیا گیا۔ وسطی ایشیائی ریپبلکوں کا معاشی اتحاد بخارا اور خوارزم کے لئے بڑا اہم ثابت ہوا کیونکہ اس نے اشتراکیت کی جانب ان کے عبور میں مدد دی۔

بخارا اور خوارزم میں صرف ان کی اندرونی معاشرتی سیاسی بنیاد اشتراکی تبدیلی کے لئے کافی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں سوویت یونین میں اشتراکی صنعت اور اس کا مزدور طبقہ ضروری بیرونی بنیاد بنے۔ بخارا ریپبلک اور خوارزم ریپبلک کی تبدیلی تو سوویت یونین کے ساتھ قریبی معاشی، ثقافتی اور سیاسی اشتراک، ان ریپبلکوں کے عوام کا سوویت یونین کے مزدوروں اور کسانوں سے اتحاد کے بغیر نہیں کی جا سکتی تھی۔

۱۴ اگست ۱۹۲۳ء کو بخارا ریپبلک کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کا اجلاس اس ریپبلک کی اشتراکی تبدیلی میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس نے آئین کی دفعات کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ ان ترمیموں کے تحت امیر کے سابق تمام اعلیٰ حکام، بڑے سود خوروں اور تاجروں کو ووٹ کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اس طرح استحصال کرنے والے طبقات سیاسی اقتدار میں حصہ لینے سے محروم ہو گئے۔ مزدوروں اور سرخ فوج کے سپاہیوں کے حقوق رائے دہی بڑھا دیئے گئے۔ منظم مزدوروں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ہر ۵ سو مزدوروں پر ایک نمائندہ منتخب کریں اور ۲۵۰ سرخ فوجیوں پر ایک نمائندہ۔ تمام وزارتوں میں بورڈ مقرر کر دیئے گئے جن کی موجودگی سے کسی بھی وزیر کے لئے من مانی کرنا نا ممکن ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۲۳ء میں کل خوارزم کانگریس کا چوتھا اجلاس ہوا۔ اس نے نیا آئین منظور کیا اور خوارزم عوامی سوویت ریپبلک کو سوویت اشتراکی ریپبلک میں تبدیل کرنے

کا اعلان کر دیا آئین کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حکومت ایسے حالات پیدا کرے جب انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ناممکن ہو جائے۔ تمام زمین عوام کی ملکیت قرار دی گئی اور اُسے بلا قیمت محنت کش کسانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ آئین نے تمام استحصال کرنے والے طبقات کو ووٹ دینے سے محروم کر دیا۔ ستمبر ۱۹۲۴ء میں کل بخارا کانگریس کے پانچویں اجلاس نے سوویت اشتراکی ریپبلک تشکیل کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے سوویت یونین کے ساتھ اٹوٹ برادرانہ اتحاد کی ضرورت پر زور دیا جس کے بغیر اشتراکیت تک عبور ناممکن تھا۔ اس طرح بخارا اور خوارزم ریپبلکیں سوویت ریاستوں سے سوویت اشتراکی ریاستیں بن گئیں۔

قوموں کی بنیاد
پر
نئی حد بندی

۱۹۲۴ء تک وسطی ایشیا میں انقلاب مکمل ہو چکا تھا اور سوشلسٹ بنیادوں پر صنعت تشکیل پانے لگی تھی اب کمیونسٹ پارٹی سب سے اہم مسئلے کی طرف توجہ دے سکتی تھی اور وہ مسئلہ تھا قومیتوں کی بنیاد پر خطوں کی حد بندی کیونکہ اب تک زار کے زمانے کی انتظامی حد بندیوں کو ہی جوں توں رکھا گیا تھا کیونکہ اکتوبر انقلاب کے فوراً بعد قومی بنیاد پر سرحد بندی کرنا ناممکن تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وسطی ایشیا کے عوام کا قوموں میں تشکیل پانے کا عمل سست تھا، قوموں کے درمیان باہمی تعلقات میں بڑی پیچیدگیاں تھیں جو ماضی کے جاگیردارانہ اور نوآبادیاتی نظام سے ورثے میں ملی تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر اسباب بھی تھے۔

پہلے اکتوبر انقلاب کی حاصلات کی مدافعت کرنا اور انہیں مستحکم بنانا، سوویت اقتدار کو مضبوط کرنا، اندرونی انقلاب دشمنی اور بیرونی فوجی مداخلت کو شکست دینا انتہائی ضروری تھا۔ پھر خیوا اور بخارا میں انقلاب ۱۹۲۰ء تک نہیں ہوا تھا اور خیوا اور بخارا کے بغیر قومی بنیاد پر از سر نو سرحد بندی بے معنی بات تھی۔ قومی بنیاد پر سرحد بندی کو کامیابی سے سرانجام دینے کے لئے ضرورت تھی کہ محنت کش عوام بڑے پیمانے پر ریاستی سرگرمیوں میں حصہ لیں ورنہ بورژوا قوم پرستوں کے ہاتھ میں یہ پھوٹ کا حربہ بن جاتا۔ قومی سرحد بندی کے واسطے یہ بھی لازمی تھا کہ معاشی اور ثقافتی میدانوں میں کافی ترقی کر لی گئی ہو اور اشتراکی قوموں کی تشکیل چند منزلوں سے گزر چکی ہو۔ لیکن تمام مشکلات کے باوجود کمیونسٹ اپنے اس اہم فریضہ کو بھولے

نہ تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ قوموں کی خود ارادیت کی پالیسی کا نفاذ سوشلسٹ تعمیر کے لئے ازحد ضروری ہے۔ چنانچہ وسطی ایشیا میں قومی ریاستی سرحد بندی کا سوال پہلے لینن جولائی ۱۹۲۰ء میں اٹھا چکے تھے۔ یہ اس مسودے پر رائے کی شکل میں تھا جسے ترکستان کے کمیشن نے ترکستان ریپبلک کے متعلق پیش کیا تھا۔ لینن نے نام نہاد ترکوں کی ریپبلک کے قیام کے متعلق ری سکولوف کا قوم پرست مسودہ مسترد کر دیا۔ مستقبل قریب میں قومی بنیاد پر سرحد بندی کے امکان کے پیش نظر انھوں نے تجویز کی کہ ترکستان کا ایک نسلیاتی نقشہ تیار کیا جائے جس میں ازبیک، قرغیز اور ترکمان کی تقسیم دکھائی جائے اور ان حالات کا تنقیدی طور پر تفصیلی جائزہ لیا جائے جو ان تینوں حصوں کو آپس میں ضم کرنے یا جدا کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ لینن اگرچہ ترکستان کے عوام کی سوویت قومی ریاست کے مزید ارتقا کی اہمیت کے رجحان کو اچھی طرح سمجھتے جو ریپبلک کی مزید کئی ریپبلکوں میں تقسیم کے ذریعے سے کیا جائے گا۔ لیکن اس کام میں جلدی کرنے کے خلاف تھے۔ مجوزہ سرحد بندی کو عمل میں لانے سے پہلے ضروری تیاریوں کی ضرورت تھی۔

ترکستان کے کمیشن نے علاقے کی نسلیاتی اور معاشی حالت کے مطابق ترکستان کی از سر نو انتظامی گروپ بندی کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن وہ ترکستان ریپبلک کے علاقے کو فوراً کئی قومی ریپبلکوں میں تقسیم کرنے کے خلاف تھا۔ ۵ جون ۱۹۲۰ء کو اس نے کل روسی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کی مجلس صدارت اور روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی مرکزی کمیٹی کو بذریعہ تار مطلع کیا کہ ایسی تقسیم سے ترکستان میں ابتری پھیل جائے گی اور قوم پرست عناصر کو مدد ملے گی۔ اس وقت سیاسی حالت کا تقاضا تھا کہ ترکستان کو کچھ عرصے کے لئے متحد ریپبلک برقرار رکھا جائے۔ مرکز نے قومی بنیاد پر سرحد بندی ملتوی کرنے سے اتفاق کیا لیکن ساتھ ہی ترکستان کے کمیشن کو یہ ہدایت بھی کی کہ اس مسئلے سے متعلق تیاری کا کام جاری رکھا جائے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے لینن نے یہ ہدایات جولائی ۱۹۲۰ء میں دی تھیں۔ ان ہی ہدایات کے مطابق وسطی ایشیا میں قومی بنیاد پر سرحد بندی کی بڑی احتیاط سے تیاریاں کی گئیں۔ اسے عملی جامہ پہنانے کا معاملہ

مناسب وقت کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

۱۹۲۱ء میں روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی دسویں کانگریس میں ہوئی۔ اس نے پارٹی سے اپیل کی کہ وہ غیر روسی محنت کش عوام کو جو پہلے زار شاہی کے ہاتھوں مظلوم تھے ان کی سوویت ریاست کی نشو نما پانے اور اسے مستحکم کرنے میں ہر طرح کی مدد دے جس کی شکلیں ان کے قومی اور دوسرے حالات زندگی کے مطابق ہوں۔ پارٹی کی بارہویں کانگریس نے ۱۹۲۳ء میں پھر قومی ریپبلکوں کے استحکام اور مزید ترقی کی قطعی ضرورت کا اعلان کیا۔

ترکستان، بخارا اور خوارزم کی سوویت حکومتوں نے قومی بنیاد پر علاقے تقسیم کر کے قومی خود اختیار صوبے قائم کر کے، مقامی قومیتوں کی زبانوں، ادب اور پریس کو ترقی دے کر قومی بنیاد پر سرحد بندی کے لئے زمین ہموار کی۔ وسطی ایشیا کی ان تین ریپبلکوں نے اس سمت میں جو تدابیر اختیار کیں ان کے سبب عوام میں اپنی علیحدہ قومی ریاست کی خواہش بڑھی۔ قومی امور پر عوامی کیساریت کے تحت جو ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئی تھی ازبیکوں، تاجکوں، ترکمانوں، قرغیزوں، تاتاروں، آرمینیوں، یوکرینیوں اور مقامی یہودیوں کے شعبے تھے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۲۱ء کو ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی میں ایک علیحدہ قزاخ قومی شعبہ کھولا گیا جس کا کام قزاخ علاقوں کی دیکھ بھال تھا۔ ترکستان میں قومی امور کی کیساریت توڑ دینے کے بعد یہ قومی شعبے مرکزی انتظامیہ کمیٹی کو منتقل کر دیئے گئے ان کا بھی وہی درجہ رہا جو قزاخ قومی شعبے کو حاصل تھا۔ ان شعبوں نے اپنے اپنے لوگوں کے حالات زندگی، ثقافت اور زبان بہتر کرنے کے سلسلے میں کافی کام کیا۔ انھوں نے مرکزی انتظامیہ کمیٹی کو متعلقہ قومیتوں کی ضروریات سے واقف کیا۔ ترکستان کے لوگوں کے حق خود اختیاری کی تیاری کے لئے کل روسی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے اگست ۱۹۲۰ء میں ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کو یہ تجویز کی کہ وہ قومی ساخت کے مطابق ترکستان کے نظم ونسق کے ضلع از سر نو تقسیم کرے۔ اگست ۱۹۲۱ء میں ماورائے کیسپین صوبے کا نام ترکمان صوبہ رکھا گیا کیونکہ وہاں آبادی کی اکثریت ترکمانوں پر مشتمل تھی۔ اپریل ۱۹۲۲ء میں سیمی ریچ یے سیر دریا اور فرغانہ اضلاع

میں قرغیزوں کی اکثریت والے علاقوں کو ملا کر قرغیز صوبہ قائم کیا گیا۔ بخارا اور خوارزم ریپبلکوں کی مرکزی انتظامیہ کمیٹیوں میں ترکمان اور قرغیز قومی شعبے کھولے گئے۔ بخارا ریپبلک میں ترکمانوں کا علیحدہ صوبہ بنایا گیا جس کا مرکز چار جوئی تھا۔ ۱۹۲۲ء میں مشرقی بخارا کا نظم و نسق چلانے کے لئے ایک خاص کمیشن مقرر کیا گیا جہاں تاجک آبادی کی اکثریت تھی۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں خوارزم ریپبلک میں ایک ترکمان اور ایک قرغیز قاراقلپک صوبہ قائم کیا گیا۔ نو اور گنیچ صوبے اور خیوا علاقے سے وہ خطے علیحدہ کر دیے گئے جہاں ازبیک اکثریت میں تھے۔

جب ۱۹۲۰ء میں قرغیز (قزاخ) خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک قائم ہوئی تب وسطی ایشیا میں قومیتوں کی بنیاد پر سرحد بندی کا سوال سامنے آیا۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں قزاخ لوگوں کی خواہش کے مطابق ترکستان ریپبلک کے ماورائے کیسپین صوبے کا شمالی حصہ قرغیز ریپبلک کو منتقل کر دیا گیا۔ روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے یکم ستمبر ۱۹۲۰ء کو جو فرمان جاری کیا۔ قرغیز ریپبلک کی خود اختیاری کے متعلق اس کی دفعہ ۲ میں یہ کہا گیا کہ ترکستان ریپبلک کا قرغیز (قزاخ) علاقہ قرغیز ریپبلک میں شامل کیا جائے کیونکہ ان صوبوں کے لوگوں کی مرضی یہی ہے۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں ترکستان ریپبلک کے غریب قزاخوں کی پہلی علاقائی کانگریس نے مطالبہ کیا کہ سیر دریا اور ترکستان کے سیمی ریچ یے میں قزاخ علاقوں کو قرغیز ریپبلک میں ملا دیا جائے۔ جب مارچ ۱۹۲۲ء میں روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کے قومی امور پر کیساریت میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی اور اپریل ۱۹۲۲ء میں گیارہویں پارٹی کانگریس کے لئے ترکستان اور قرغیز ریپبلک کے مندوبین کی کانفرنس ہوئی تو پتہ چلا کہ ترکستان کے قزاخ علاقوں کو قرغیز ریپبلک میں شامل کرنے کے مسئلے کا براہ راست تعلق وسطی ایشیا میں قومی بنیاد پر سرحد بندی سے ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قومی بنیاد پر سرحد بندی کا مطالبہ خود وسطی ایشیا کے عوام نے اٹھایا۔ مقامی پارٹی اور معاشرتی تنظیموں نے اس کی پہل کی اور مرکز نے ۱۹۲۴ء میں قومی بنیاد پر سرحد بندی کر کے عوامی خواہش کو پورا کیا۔

فروری ۱۹۲۴ء میں قومی بنیاد پر سرحد بندی کا سوال بخارا کے سوویت اور پارٹی کارکنوں کی کانفرنس کا خاص موضوع بحث تھا۔ کانفرنس اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ سوال کافی پختہ ہو گیا ہے اس کے بعد بخارا کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس ۲۵ فروری ۱۹۲۴ء کو ہوا اور اس نے بھی اسی مسئلے پر غور و خوض کیا۔ اجلاس نے کانفرنس کے خیال سے اتفاق کیا۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں خوارزم کے پارٹی اور سوویت کارکنوں کی کانفرنس نے بھی قومی بنیاد پر سرحد بندی کی حمایت کی۔ پھر ۱۰ مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکستان کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی، ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی اور تاشقند کے پارٹی کی مرکزی اور سوویت کارکنوں کی مشترکہ کانفرنس نے اسی خیال کو دہرایا۔ اور جب ۲۴-۲۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکستان کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اس نے بھی قومی بنیاد پر سرحد بندی کرنے کی تائید کی۔

اس سلسلے میں مشکلات بھی پیش آئیں۔ مثلاً خوارزم ریپبلک میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی مجلس عاملہ نے معقول وجوہات پیش کئے بغیر اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا۔ لیکن بعد میں عام پارٹی ممبروں کی رائے سے مجلس عاملہ کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اس نے یہ ضرورت مان لی کہ خوارزم ریپبلک میں بھی سرحد بندی قومی بنیاد پر کی جائے۔

۵ راپریل ۱۹۲۴ء کو روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی مرکزی کمیٹی کے پولیٹ بیورو نے وسطی ایشیا کی پارٹی تنظیموں کی وہ تجاویز قبول کر لیں جن کا تعلق وہاں قومی بنیاد پر قومی ریپبلکوں کی سرحد بندی سے تھا۔ اس نے مرکزی کمیٹی کے وسطی ایشیائی بیورو کو ہدایت دی کہ وہ اس کے لئے ضروری تیاریاں کرے۔ ۲۸ راپریل ۱۹۲۴ء کو مرکزی ایشیائی بیورو نے علاقائی کمیشن مقرر کیا اور اس کے تحت ازبکوں، ترکمانوں، قزاقوں قرغیزوں اور تاجکوں کے ذیلی کمیشن معین کئے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ ریپبلکوں اور صوبوں کے علاقوں کا تعین کر کے قومی بنیاد پر سرحد بندی کو عملی جامہ پہنائیں گے۔

"ترکستان کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں کانگریس نے بھی جس کا انعقاد مئی ۱۹۲۴ء میں ہوا اس مسئلے پر بحث کی۔ اس کانگریس میں شرکت کے لئے روسی کمیونسٹ پارٹی

(بولشویک) کی مرکزی کمیٹی نے رودزوتاک کو بھیجا تاکہ وہ مقامی کمیونسٹوں کے خیالات سے واقف ہو سکے۔ ترکستان کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری نے قومی بنیاد پر سرحدبندی کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ وسطی ایشیا کے بارے میں سوویت قومی پالیسی پر عمل درآمد کی راہ پر یہ ترقی پسند قدم ہے۔ کئی نمائندوں نے اس پر زور دیا کہ قومی بنیاد پر سرحد بندی سے وسطی ایشیا کے لوگوں کے لئے معاشی اور ثقافتی ترقی کی شاہراہیں کھل جائیں گی۔ ایک تاجک نمائندے سیغین بائیف نے بتایا کہ اگر اس پر عمل کیا گیا تو قومی تنازعات اشتراکی تعمیر میں رکاوٹیں ڈالتے رہیں گے۔ رودزوتاک نے ہوائی قلعے بنانے پر خبردار کیا اور پارٹی کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ اس تحریک کو صحت مند کمیونسٹ راہ پر چلائیں۔

قومی ریاستی سرحدبندی پر عمل درآمد

۱۰ مئی ۱۹۲۴ء کو قومی ذیلی کمیشنوں کی سفارشات پر قومی سرحدبندی کے کمیشن نے غور وخوض کیا۔ اس نے حمایت کی کہ ازبکستان اور ترکمانیہ مکمل قومی ریپبلکوں کی حیثیت سے اور تاجکستان اور قرغیزیہ خود اختیار صوبوں کی طرح قائم کئے جائیں۔ اس نے قزاخ قومی کمیشن کی یہ سفارش مسترد کر دی کہ ترکستان کے قزاخ علاقوں کو قزاخ خود اختیار اشتراکی سوویت ریپبلک میں شامل کیا جائے اور ایک وسطی ایشیائی فیڈریشن قائم کیا جائے۔ قومی بنیاد پر سرحدبندی کے کمیشن نے اپنی سفارشات روسی کمیونسٹ پارٹی (بولشویک) کی مرکزی کمیٹی کے وسطی ایشیائی بیورو کو ملاحظے کے لئے سپرد کر دیں۔ ۲ اور ۱۲ جون ۱۹۲۴ء کو مرکزی کمیٹی کے پولیٹ بیورو نے ان سفارشات پر بحث کی۔ ۱۲ جون کو اس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں وسطی ایشیا میں ریپبلکوں کی قومی بنیادوں پر سرحدبندی کرنے کے سلسلے مندرجہ ذیل باتوں کا مشورہ دیا گیا۔

۱۔ آزاد ازبکستان اور ترکمانیہ کی ریپبلکیں قائم کی جائیں۔ خوارزم ریپبلک سے ترکمان علاقے جدا کر کے اسے اپنی موجودہ حالت ہی میں رکھا جائے۔

۲۔ ترکستان سے قرغیز (یعنی قزاخ) علاقے علیحدہ کر کے انھیں قرغیز (قزاخ) خود اختیار

سوویت اشتراکی ریپبلک میں شامل کیا جائے۔

۳- خود اختیار قارا قرغیز (یعنی قرغیز) صوبہ قائم کرکے اسے روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک میں ملادیا جائے۔

۴- ازبک ریپبلک میں تاجکوں کا علیحدہ خود اختیار صوبہ قائم کیا جائے۔

سوویت یونین کی سوویتوں کی ہونے والی کانگریس میں سوویت یونین اور آزاد ازبکستان اور آزاد ترکمانیہ کے درمیان ان کے اتحاد میں شامل ہونے کا عہدنامہ طے کیا جائے

بعد میں خوارزم کو بھی قومی بنیادوں پر سرحد بندی کے سوال میں شامل کر لیا گیا۔ ۲۷ جولائی ۱۹۲۴ء کو خوارزم کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے انتظامیہ بیورو نے اپنے اجلاس میں خوارزم کی سرحد بندی کے خلاف اپنا گذشتہ رویہ بدل دیا۔

علاقائی کمیشن نے اپنا کام ستمبر ۱۹۲۴ء کے شروع میں ختم کر دیا۔ اس میں تمام قومیتوں کو مساوی نمائندگی تھی۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا جس میں سرحد بندی کی تجاویز کو قبول کیا گیا اور ازبیکوں، ترکمانوں، قزاخوں، تاجکوں اور قرغیز کو ترکستان ریپبلک سے علیحدہ ہونے کا حق دیا گیا تاکہ وہ اپنی قومی ریاستی تشکیلیں قائم کر سکیں۔ ۲۰ اور ۲۹ ستمبر ۱۹۲۴ء کو کل بخارا کانگریس اور کل خوارزم کانگریس نے بھی اپنی ریپبلکوں میں رہنے والی مختلف قومیتوں کو ایسے ہی حقوق دئیے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو کل روسی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے ترکستان کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کی ۱۶ ستمبر کی منظور کردہ تجویز کی تصدیق کی اور ترکستان خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک کو روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک سے جدا کر دیا۔ کل روسی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ازبک ریپبلک میں تاجک خود اختیار صوبے کی سطح بلند کرکے اسے خود اختیار ریپبلک بنا دیا جائے ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو کل روسی مرکزی انتظامیہ کمیٹی نے ایک خاص قانون منظور کیا جس کے مطابق وسطی ایشیا میں سوویت ریپبلکوں کی قومی بنیادوں پر سرحد بندی کو تسلیم کیا گیا اور اتحاد میں ازبک ریپبلک اور ترکمان ریپبلک کی شمولیت کو رسمی طور پر منایا گیا۔

اس طرح وسطی ایشیا میں قومی بنیاد پر سرحد بندی کا کام انجام پایا۔ تاریخ میں پہلی بار وسطی

ایشیا کے لوگوں نے اپنی قومی ریاستی تشکیلیں حاصل کیں۔ مجموعی طور پر سوویت اقتدار نے یہ بہت آسانی سے مکمل کر لیا اگرچہ اسے کئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی بورژوا قوم پرستوں نے ظاہر ہے ان مشکلات سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ انھوں نے جارحانہ قوم پرستی کے شعلے بھڑکانے کی کوشش کی۔ ازبیک بورژوازی نے یہ آواز بلند کی کہ خوارزم ریپبلک میں قومی سرحد بندی نہ کی جائے۔ اسی طرح قزاخ بورژوا قوم پرستوں نے یہ مہم چلانا چاہی کہ شہر تاشقند ازبیک ریپبلک میں شامل نہ ہو۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ پورا تاشقند اور مرزاچل کے ضلعے قزاخ خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک میں شامل کر دیئے جائیں۔ اس کے جواب میں ازبیک بورژوا قوم پرستوں نے مانگ کی کہ سیر دریا کے صوبے میں جن شہروں میں ازبیک آبادی کی اکثریت ہے وہ خود اختیار شہر تسلیم کئے جائیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ چمکینٹ اور ترکستان شہروں میں ازبیکوں کی اکثریت تھی لیکن وہ ایسے دیہی علاقوں سے گھرے ہوئے تھے جہاں آبادی کی اکثریت قزاخوں پر مشتمل تھی۔

۱۹۲۴ء میں وسطی ایشیا میں حالات ہی ایسے تھے کہ ایسے قومی تنازعات کا پیدا ہونا قدرتی تھا۔ رجعت پسند قوم پرست عناصر کو اگرچہ سیاسی لحاظ سے دبا دیا گیا تھا اور ان پر معاشی پابندیاں بھی لگا دی گئی تھیں لیکن وہ اس وقت تک بالکل ختم نہیں ہوئے تھے۔ سابق استحصال کرنے والے طبقات کو مناسب موقع کا انتظار تھا۔ ابھی تک زرعی اصلاحات مکمل نہیں ہوئی تھیں، زراعت کو اجتماعی نہیں بنایا گیا تھا، اشتراکی صنعت قائم نہیں ہوئی تھی۔ ایسے حالات میں بورژوا قوم پرست عناصر پارٹی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یہاں پارٹی اور سوویت حکومت کی داد دینی پڑے گی کہ قوم پرست عناصر کو اتنا موقع نہیں دیا گیا کہ وہ مختلف قومیتوں کے درمیان نفرت کے بیج بوتے اور دنگے فساد کراتے۔ ترکستان کی کمیونسٹ پارٹی نے لوگوں میں پھوٹ ڈالنے والی بورژوا قوم پرستوں کی کوششوں کا جوابی مقابلہ ایک عوامی مہم چلا کر کیا۔ اس کے ذریعے قومی بنیاد پر سرحد بندی کے منصوبے کے اصول لوگوں کو سمجھائے گئے۔ پارٹی نے آگاہ کیا۔

• وسطی ایشیا کے محنت کش عوام کو یاد رکھنا چاہیئے کہ علیحدہ آزاد سوویت ریپبلکوں کا

کا قیام ہمارا آخری فریضہ اور مقصد نہیں ہے اس سے کسی مخصوص قوم کے محنت کشوں کی قومی علیحدگی اور خلوت نشینی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نئی ریپبلکوں کے مستقبل میں کام کی بنیاد قومی تضاد نہیں بلکہ پرولیتاری بین الاقوامیت ہے جو شخص بھی اس کے ماسوا سوچتا ہے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مزدوروں اور کسانوں کے اقتدار کا دشمن ہے۔

قومی سرحدوں کا تعین آسان کام نہ تھا۔ قومی سرحد بندی کے کمیشن کو کئی متنازعہ فیہ علاقوں کی قومی ساخت کا مطالعہ کرنے اور متعلقہ لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کے لئے مہمیں منظم کرنا پڑیں۔ سوویت قومی ریپبلکوں اور خود اختیار صوبوں کا علاقہ اور سرحدیں معین کرنے کے سلسلے میں بلاشبہ قومی عنصر اہم ترین تھا۔ قومی ریاستی تشکیلیں قائم کرتے وقت ان علاقوں پر خاص توجہ دی گئی جہاں قومی گروہ اکٹھا رہتے تھے۔ لیکن قومی عنصر کے علاوہ ان کے طریقہ زندگی اور معاشی اتصال کو بھی ملحوظ رکھا گیا جو قومی ریپبلک یا خود اختیار صوبے کی شکل پانے والے تھے۔ اپنی تصنیف قومی سوال پر تنقیدی رائے (۱۹۱۳ء) میں لینن نے علاقے کی تقسیم کو حتی الامکان آبادی کو قومی ساخت کے مطابق ہونے پر زور دیا، تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اگرچہ یہ ایک اہم ترین معاشی عنصروں سے ایک ہے لیکن اسے واحد اور اہم ترین نہیں کہا جا سکتا۔

جب وسطی ایشیا میں قومی سرحد بندی کی گئی تو لینن کے اسی اصول کو مدنظر رکھا گیا۔ وہاں متصل قومی علاقوں کی بنیاد پر قومی ریپبلکوں اور خود اختیار صوبوں کی تشکیل ضرور کی گئی لیکن فرداً فرداً ایسے خطے جہاں اگرچہ ایک قومی گروپ کی اکثریت تھی لیکن معاشی اور جغرافیائی لحاظ سے ان کا دوسرے قومی گروہ کے علاقے سے تعلق زیادہ گہرا تھا مثلاً قزاغ علاقے کے سیر دریا صوبے میں ازبیک شہر اصولاً اسی علاقے میں شامل رکھے گئے۔ اسی طرح کئی تاجک علاقوں کو ازبیک ریپبلک میں شامل رکھا گیا کیونکہ ان کے معاشی اور ثقافتی رابطے قریبی تھے۔

قومی بنیاد پر سرحد بندی کے بعد وسطی ایشیا میں کثیر قومی ریاستوں کی جگہ قومی لحاظ سے کئی ہم نواع ریاستیں ابھر آئیں۔ اس سے وہ پیچیدہ قومی مسئلہ حل ہو گیا جو ان کے اشتراکی ارتقا کو کافی روک رہا تھا۔ پرانی سیاسی اور انتظامی سرحد بندی زار شاہی کی حکمرانی کے

زمانے کی فوجی، حکمت عملی کی اور سیاسی نورولیت کی پیداوار تھی۔ اس سے قومی مسئلہ اور زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ پرانی سرحدیں وسطی ایشیا میں لوگوں کی نسلیاتی تقسیم کو نظر انداز کرتی تھیں اور انھیں ترکستان، بخارا اور خیوا کے دقیانوسی حکمراں ایک قومی گروہ کو دوسرے قومی گروہ کے خلاف استعمال کر کے اپنے اقتدار کو محفوظ رکھتے تھے۔ قومی بنیاد پر سرحد بندی نے حالات کو بدل دیا اور قومی تضادات کی وہ بنیاد ہی ختم کر دی جس پر ہمیشہ بورژوا قوم پرستوں نے تکیہ کیا ہے۔

۱۹۲۴ء کی سرحد بندی سے پہلے ۶۶٫۵ فیصدی ازبیک ترکستان خود اختیار ریپبلک میں رہتے تھے لیکن وہ اس کی کل آبادی کا ۴۱٫۴ فیصدی حصہ تھے۔ سرحد بندی کے بعد تمام وسطی ایشیا نے ۸۲٫۶ فیصدی ازبیکستان کی سوویت اشتراکی ریپبلک میں شامل کر لئے گئے جہاں آبادی کے تناسب سے ان کی مطلق اکثریت تھی۔ ۷۶٫۱ فیصدی۔ اسی طرح پہلے ترکمانوں کی وسطی ایشیا کی بھی ریپبلک میں غالب اکثریت نہیں تھی۔ لیکن جب ترکمان سوویت اشتراکی ریپبلک بنی تو تمام ترکمانوں کا ۹۴٫۲ فیصدی حصہ وہاں آباد تھا اور وہ کل آبادی کے ۷۱٫۹ فیصدی تھے۔ یا تاجکوں کو لیجیے۔ ترکستان خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک میں آبادی تناسب سے ان کی تعداد ۷٫۷ فیصدی تھی اور بخارا ریپبلک میں ۳۱ فیصدی۔ سرحد بندی کے بعد جب ازبیک ریپبلک کے اندر تاجک خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک قائم ہوئی تو تاجک اسکی آبادی کا ۷۱٫۲ فیصدی تھے اور جب ۱۹۲۹ء میں اسے بلند کر کے اتحادی ریپبلک کا درجہ دیا گیا تو وسطی ایشیا کے ۷۵٫۲ فیصدی تاجک وہاں بسے ہوئے تھے۔ قرغیز جو ترکستان ریپبلک کا محض ۱۰٫۸ فیصدی حصہ تھے نئے قائم شدہ قارا قرغیز خود اختیار صوبے (روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کے اندر) میں ۶۶ فیصدی ہو گئے۔ وسطی ایشیا کے ۸۶٫۷ فیصدی قرغیز اپنے خود اختیار علاقے میں رہتے تھے جسے ۱۹۲۶ء میں خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک بنا دیا گیا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں اس کو اتحادی ریپبلک کا درجہ دے دیا گیا۔ یہی حال قاراقلپکوں کا ہے۔ تمام وسطی ایشیا کے ۹۷٫۳ فیصدی قاراقلپک خود اختیار قاراقلپک صوبے میں آباد تھے جو قرغیز (قزاخ) خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک میں تھا۔ اس ریپبلک میں

ان کی آبادی ۱ء ۳۸ فیصدی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں اسے روسی سوویت وفاقی اشتراکی ریپبلک کے اندر خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک کا درجہ دے دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں یہ ازبیک ریپبلک میں خود اختیار ریپبلک بن گئی۔ اس وقت قرغیز (قزاخ) خود اختیار سوویت اشتراکی ریپبلک میں تمام قزاخ لوگوں کا ۴ء ۹۳ فیصدی حصہ آباد تھا جو اس کی کل آبادی کا ۴ء ۵۷ فیصدی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں قزاخ خود اختیار ریپبلک کو اتحادی ریپبلک بنا دیا گیا۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قومی بنیاد پر سرحد بندی کے بعد ہی وسطی ایشیا میں نسلیاتی نقشہ منصفانہ بنیاد پر تیار کیا گیا۔ جب پرانی نسلیاتی بے قاعدگی کو دور کر دیا گیا تو پھر ۱۹۲۴ء میں وسطی ایشیا میں قومی مسئلے کا بہتر حل مل گیا۔ عوام کو انتظامیہ سے قریب لا کر اس نے وسطی ایشیا کی قومیتوں کی معاشی اور ثقافتی پسماندگی کو تیزی سے ختم کرنے کی مضبوط بنیاد ڈالی۔ اس سے نظم و نسق زیادہ جمہوری ہو گیا جس کی وجہ سے معاشی نشو و نما اور ثقافتی ترقی کی رفتار تیز کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اس نے بورژوا مقامی قوم پرستی اور عظیم طاقتی جارحانہ قوم پرستی پر کاری ضرب لگائی۔ مختلف قومی گروہوں کے درمیان امن کی ضمانت دے کر اس نے سوویت یونین کے عوام کے درمیان دوستی اور اخوت کو فروغ دیا۔ قومی تنازعات کی بنیاد ڈھا کر اس نے وسطی ایشیا کے عوام کو اشتراکیت کی تعمیر کے تاریخی فریضہ پورا کرنے پر ابھارا۔ مختصر یہ کہ جہاں تک وسطی ایشیا کے عوام کی مستقبل میں ترقی اور خوش حالی کا تعلق ہے تو قومی بنیاد پر سرحد بندی کے نتائج مثبت اور فائدہ مند نکلے۔

ثقافتی انقلاب
اور
زبانوں کا ارتقاء

انقلابات اور سماجی تبدیلیوں کا عمل بہت ہی گنجلک اور پیچیدہ عمل ہوتا ہے اس کے اپنے داؤ پیچ اور طریق کار ہوتے ہیں چنانچہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ انقلاب کو مستحکم کرنے، تبدیلیوں کو بارآور بنانے کے لئے خطوں کے عوام کو یقین دلایا جائے کہ ان کی خواہش، تمنائیں اور آرزوئیں پوری ہوں گی یہ یقین ہی ان کو سرگرم عمل کرتا ہے۔ اب اکتوبر انقلاب کے بعد ایک طرف ذرائع پیداوار پر عوام کا تصرف عمل میں آیا، زمینداریاں ختم کر دی گئیں زمین کسانوں میں بانٹ دی گئی، کارخانے جو تھوڑے بہت تھے ان پر بھی محنت کشوں کا کنٹرول عمل میں آیا، حکومت کے اداروں پر بھی سوویتوں کے ذریعے عوام کا کنٹرول ہو گیا اس پر مستزاد یہ کہ نئی حد بندیوں کے ذریعے قومیتوں کی تشکیل اور ان کا بھائی چارہ پختہ ہوا اس سے ان کی صدیوں کے خواب شرمندہ تعبیر ہوئے، ان سب اقدام سے وسطی ایشیا کے غریبوں، مجبوروں اور مظلوموں میں یقین پیدا ہوا، ان میں اعتماد آیا لیکن اعتماد اور یقین کے لئے ابھی کئی ایک اقدام ضروری تھے کیونکہ جیسے جیسے عوام میں اعتماد پیدا ہوتا ہے ویسے ہی وہ زیادہ تندہی سے اپنے خطوں کی تعمیر میں سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ اس لئے خالی خولی نعرے کہ پیداوار بڑھاؤ کبھی بارآور نہیں ہوتے، یہ پیداوار بڑھانے کا عمل ایک بہت ہی گنجلک عمل ہوتا ہے، جب الوطنی کبھی اس وطن کے لئے پیدا نہیں ہوئی جو وطن کھانے کو نہ دے پہننے کے لئے کپڑا مہیا نہ کرے اور سونے کے لئے چھت کا بندوبست نہ کرے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اپنے

وطن میں تہذیبی معیار بھی بلند ہونا چاہیئے عوام کو معلوم ہو کہ ان کی زندگیوں میں خوشیاں دبے پاؤں آرہی ہیں چنانچہ اصل صورت حال تو یہ دیکھنے کی ہوتی ہے چنانچہ اب تک میں نے سیاسی تبدیلیوں کے تذکرے کئے ہیں، تاریخ بھی بیان کر دی ہے، انقلاب نے عملاً جو تبدیلیاں لائی تھیں ۔ ان کا بھی تذکرہ کر دیا ہے اب میں اگلے صفحات میں مادری اور روحانی دونوں تبدیلیوں کا قدرے تفصیل کے ساتھ تذکرہ کروں گا۔ کیونکہ سوویت یونین میں مادی اور روحانی تبدیلیاں ایک ساتھ رونما ہو رہی ہیں اور پہلے دن یہ چیز پیش نظر رکھی گئی کہ اگر زراعت میں تبدیلیاں لائی جائیں۔ صنعت کاری کو تیز کیا جائے، نئے پنجسالہ منصوبے ترتیب پائیں تو ان کے ساتھ ہی ثقافتی ترقیوں کے لئے بھی باقاعدہ منصوبہ بندی ہو تاکہ عوام کو زیادہ سے زیادہ سرگرم اور متحرک کیا جا سکے کیونکہ جیسے جیسے عوام کی مادی ترقیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں تو اس کے ساتھ ہی روحانی تشخص کے لئے بھی ان کے اندر جذبات بیدار ہوتے ہیں اور وہ اپنے مخصوص تشخص کی تلاش کے لئے بے تاب ہونے لگتے ہیں، چنانچہ قومیتوں کی بنیاد پر جمہوریتوں کی تشکیل دراصل اسی تشخص کی تلاش کی تشفی ہے اور اسی طرح مخصوص قومیتوں کی زبان کی نشوونما اسی تشخص کی تلاش ہی کا ایک حصہ ہے چنانچہ ہمیں ان جمہوریتوں کی ترقیوں کی داستان بیان کرتے ہوئے ان جمہوریتوں میں زبانوں کی ترقی اور نشوونما کی تاریخ کو بھی پوری طرح جاننا چاہیئے۔

سوویت یونین میں جس طرح قوموں کو اپنے نشوونما کے لئے جمہوریتیں تشکیل دی گئیں ان کی نئے سرے سے حد بندیاں کی گئیں، چھوٹی سے چھوٹی قوم کو بھی حق خود اختیاری دیا گیا اسی طرح سے اس حق خود اختیاری کو صحیح معنوں میں نافذ کرنے کے لئے زبانوں کو بھی پلنپنے اور نشوونما کے لئے اہتمام شروع کیا گیا۔ سوویت یونین میں ہر تہذیبی وحدت کا احترام کیا جاتا ہے خواہ اس تہذیبی وحدت کی آبادی صرف ایک ہزار افراد پر ہی کیوں نہ مشتمل ہو چنانچہ یہ تمام قومیتیں اور تہذیبی وحدتیں بالکل ایک سا درجہ رکھتی ہیں، ان تمام قوموں اور تہذیبی وحدتوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ یہی حال ان کی زبانوں کا ہے۔ سوویت یونین کے پورے علاقے میں مجموعی طور پر کوئی ۱۲۰ زبانیں ہیں یہ ۱۲۰ زبانیں تقریباً چار لسانی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

۱۔ ہندی یورپی زبانیں۔ یہ زبانیں سوویت یونین میں سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہیں تقریباً ۸۹ فیصد آبادی انہی زبانوں کو استعمال کرتی ہے۔

۲۔ التائی زبانیں جو ۱۱ فیصد آبادی استعمال کرتی ہے۔

۳۔ قفقاز کی زبانیں فیصد آباد استعمال کرتی ہے

۴۔ یورال کی زبانیں یہ بھی ۲ فیصد آبادی میں بولی جاتی ہیں۔

دس سے زیادہ ایسی زبانیں بھی ہیں جو شمال اور شمال ۔۔۔؟ میں استعمال ہوتی ہیں اور وہ ان لسانی خاندانوں سے باہر ہیں۔

وسطی ایشیا کی ترکی لسانی قومیتوں کی زبانوں کا شمار بھی ہندی یورپی لسانی گروپ میں ہوتا ہے۔ ترکی لسانی گروپ میں ازبک، قزاخ، ترکمان، قرغیز، کاراکالپاکی اور اوئیگور شامل ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان تمام قومیتوں کی زبانوں میں بے پناہ فرق ہے صرف ان کا منبع کہنا چاہیئے ایک ہے جو ہزارہا برس پہلے کی ترکی سے ہوا ہوگا۔ لیکن اب ان میں کوئی بظاہر یکسانیت نہیں رہی چنانچہ انقلاب کی کامیابی کے بعد جب قومیتوں کی جمہوریتوں کی تشکیل ہورہی تھی اور اسی بنیاد پر حد بندیاں کی جارہی تھی تو اس وقت زبانوں کے نشوونما کی طرف بھی خاص طور پر توجہ کی گئی۔ چنانچہ قومی امور کی وزارت کی طرف سے قومی زبانوں کی قطعی مساوات کی تحریری زبان بنی تھی، اور بعض نوعمر تحریری زبانیں تھیں جن کی اساس ابھی تک کچی تھی ان کے لیئے نئے حروف تہجی مرتب کرنے کا کام تھا، چنانچہ قومی امور کی وزارت کے تحت نئے حروف تہجی کے لیے مرکزی کمیٹی تربیت دی گئی، اس وقت تک بہت سی زبانوں کا سائنسی بنیادوں پر مطالعہ نہیں کیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے حروف تہجی تیار کرتے وقت بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ بہرحال لاطینی بنیادوں پر حروف تہجی پر مبنی نئے حروف تہجی کا کام ماہرین لسانیات، مقامی دانشور طبقہ اور عوامی تنظیموں کی حدود سے اس صدی کی تیسری دہائی میں مکمل ہوا۔ لیکن تجربے نے یہ ثابت کیا کہ لاطینی حروف تہجی ان زبانوں کے صحیح اظہار میں پوری طرح قدرت نہیں رکھتے کیونکہ ان زبانوں پر پچھلی ایک صدی میں روسی زبان کا خاصا گہرا اثر پڑ چکا تھا چنانچہ ان مشکلات

پر غور کرنے کے لئے جنوری ۱۹۳۲ء میں شمالی قوموں کی زبانوں سے متعلق مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک کل روسی کانفرنس طلب کی گئی، اس کانفرنس میں ماہرین لسانیات، مقامی دانشوروں اور عوامی تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی اور خارجی بحث و تمحیص کے بعد ہم زبانوں کے حروف تہجی سے متعلق طے کیا گیا کہ ان حروف کو روسی زبان کی اشکال کے مطابق کیا جائے۔ اس کانفرنس میں نقطے دار حروف میں بھی بتدریج کم کا فیصلہ ہوا اور مختلف حروف کی املا کو بھی آسان بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

لطف یہ ہے کہ انقلاب کے بعد ۴۸ قومیتوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی تحریری زبان نصیب ہوئی، اس وقت سوویت یونین میں تین نظام رائج ہیں، آرمینی اور جارجیائی زبانوں کے حروف تہجی جو ان کی زبانوں کی ابتدائی اشکال پر مبنی چلے آتے ہیں، دوسرا نظام الیتونیا لتھونیا اور فنش زبانوں کا نظام ہے جس میں لاطینی حروف تہجی استعمال ہوتے ہیں اور روسی سلاوی نظام۔ اس لئے یہ الزام غلط ہے کہ روسی زبان کو عام قومیتوں پر مسلط کر دیا گیا ہے یہ ضرور ہے کہ ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے اور زیادہ سے زیادہ یکسانیت پیدا کرنے کے لئے تجربات کے ساتھ ان زبانوں کی تحریری شکلوں میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ترکی نے عربی رسم الخط کو ترک کر کے لاطینی کو اپنا لیا تھا۔ دراصل اس یکسانیت کے پیدا کرنے میں خود مقامی دانشوروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیونکہ اس سے روسی زبان کے ادب اور سائنسی معلومات کا ذخیرہ دوسری زبانوں میں منتقل کرنے میں بہت آسانیاں پیدا ہوئی تھیں اور خود ان کی اپنی زبانوں کی کتابوں کو وسیع مارکیٹ نصیب ہو سکتی تھی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سوویت یونین میں کوئی واحد ریاستی زبان نہیں ہے ۱۵ یونین جمہوریتوں میں ہر ایک جمہوریہ میں اس جمہوریہ کی اصل آبادی زبان ریاستی زبان تسلیم کی گئی ہے روسی زبان سوویت قوموں کے درمیان مراسلت اور گفتگو کی زبان کے فرائض انجام دیتی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک مادری زبانوں کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ نہیں لگایا گیا کہ مادری زبانوں کے رواج سے قومی ترقی کی رفتار کس قدر تیز ہو جاتی ہے اور ناخواندگی

کے خاتمہ کے لئے مادری زبان کو اپنانا لازمی اور لابدی ہے چنانچہ وسطی ایشیا کی ان جمہوریتوں میں یہ عمل دیکھنے میں آیا۔ مادری زبانوں کو قومی درجہ دینے کے ساتھ ہی پرائمری اسکولوں میں بچوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ قومی زبانیں بتدریج کاروباری، مراسلت اور سوویت اقتدار کے تمام مقامی اداروں میں دفتری کام میں، عوامی ثقافتی اور تعلیمی تنظیموں اور عدالتی کارروائی وغیرہ میں رائج کی گئیں۔

اساتذہ کی تربیت آبادی سے ناخواندگی کا استیصال ایسے اولین اور کٹھن مسائل تھے جنہیں حل کرنے کے لئے خاطر خواہ وقت اور جدوجہد ضروری تھی۔ عام خواندگی کی صورتحال بہتر ہونے ہی کی صورت میں ثانوی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کا سلسلہ مقامی زبانوں میں شروع کیا گیا۔ قومی اسکولوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مقامی زبانوں کے ذریعہ درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد یونین جمہوریتوں کے تعلیمی نظام میں روسی زبان ثانوی زبان بن گئی۔

دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے تمام جمہوریتوں میں ناخواندگی کا استیصال ہو چکا تھا اور عام لازمی تعلیم رائج ہو چکی تھی۔ قومی ادب تھیٹر اور فلمیں منظر عام پر آنے لگی تھیں۔ مختلف قوموں کی زبانوں میں اخبارات رسائل اور کتابیں بڑی تعداد میں شائع ہونے لگے۔ خواندگی کو ترقی دینے میں سینما، تھیٹر اور ٹیلی ویژن نے بہت زیادہ اہم کردار انجام دیا۔ گراں مایہ عوامی ثقافت اور موجودہ دور کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات تمام لوگوں کی دسترس میں آ گئیں۔

جب کبھی بھی مجھے وسطی ایشیائی جمہوریتوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو میں کتابوں کی روز افزوں تعداد سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ ان کتابوں میں قدیم شاعروں اور فلسفیوں کی تخلیقات کے نئے ایڈیشن قدیم زمانے کی۔ غیر تحریری رزمیہ داستانیں، موجودہ ادبی شہ پارے روسی اور عالمی کلاسیکی ادب اور سوویت اور جدید عالمی ادب کے تراجم شامل ہیں۔

اور یہ تمام روحانی سرمایہ اُن قوموں کی زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے جو صرف کچھ عرصہ پہلے تک اہم واقعات اور عالمی ادب سے بالکل بے بہرہ اور الگ تھلگ تھے۔ ان انقلابی

تبدیلیوں کو جو سوویت یونین کی قوموں کی زندگی حالات زندگی اور بھرپور قومی تشکیل میں رونما ہوئی ہیں، پیمائش کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ قومی زبانوں کے آزادانہ ارتقا نے تمام قومیتوں کے لوگوں کے لئے سوشلزم کی تعمیر میں سرگرمی واشتراک کو ممکن بنا دیا ہے۔

قومی جمہوریتوں کے تعلیمی نظام میں روسی زبان ثانوی زبان بن گئی۔ حالانکہ روسی زبان ان کی قومی زبان نہیں ہے لیکن غیر ملکی زبان کا جو مکمل مفہوم ہے اس حیثیت سے یہ غیر ملکی زبان بھی نہیں ہے۔ روسی زبان سوویت قوموں میں میل جول میں آسانیاں پیدا کرتی ہے۔

ہر جمہوریہ، خود مختار علاقے اور قومی رقبے میں روسی زبان کا مطالعہ رضاکارانہ طور پر کیا جاتا ہے۔ بہر حال بچے روسی زبان کا مطالعہ کرنے سے پہلے اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہوتے ہیں۔ فطری بات ہے کہ وہ روسی زبان پر مہارت اسکول میں حاصل نہیں کرتے قومی جمہوریتوں کی آبادی کے لئے قومی اور روسی زبانوں میں فلموں کی نمائش ریڈیو اور ٹیلیویژن پروگراموں سے روسی زبان پر مہارت حاصل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

جنگ کے بعد کی نسل اور خاص طور سے نوجوانوں کو روسی زبان کا اتنا ہی اچھا علم ہے جتنا انہیں اپنی مادری زبان کا ہے روسی زبان ان کے لئے میل جول اور تبادلۂ خیالات کی زبان ہے۔ اس ثانوی زبان پر عبور حاصل کرتے ہیں کسی قسم کی قومی پابندیاں نہ ہونے کی وجہ سے بہت سہولت فراہم ہوئی ہے ملک کے اندر قومیتوں کے درمیان کسی قسم کی دیواریں حائل نہیں ہیں۔ اعتماد اور باہمی اعتماد کے لئے جذبات موجود ہیں۔

نہ صرف روسیوں کے ساتھ بلکہ تمام قومیتوں کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں میل جول اور مساوات، سوویت سماج کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

مشترکہ تعلیم کے لئے اسکول جہاں روسی اور مقامی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے مشترکہ آبادی کے چھوٹے علاقوں میں موجود ہیں۔

ایک مرتبہ قرغیز جمہوریہ کی راجدھانی فرنزے کے قریب ایک ڈنگن گاؤں ایگزینڈر ڈرڈنکا کے ورژبا اجتماعی فارم کے ایک استاد نے مجھے بتایا کہ ۱۸ قومیتوں کے بچے اس اجتماعی فارم کے دس اجتماعی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ ان میں سے ستر طالب علم ڈنگن تھے۔ ڈنگن، ۷۷، ۸ ادیغین چین

سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے آج کل ۹۰۰،۲ ڈنگن سوویت یونین میں آباد ہیں۔ایک ڈنگن مدرس رحمان فی خیزانے جو مورخ اور ماہر لسانیات ہیں مجھے ان اسکولوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں جن میں مختلف قومیتوں کے طالب علم زیر تعلیم ہیں۔

پرائمری اور نامکمل ثانوی اسکول میں ڈنگن زبان میں تعلیم دی جاتی ہے ان سکولوں میں قرغیز طالب علم بھی ہیں جنہیں قرغیز زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ انتظام بچوں کو اپنی مادری زبان کے فہم و ادراک کو ترقی دینے کے لئے کافی ہے بعد کے درجوں میں روسی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اور ڈنگن زبان اور ادب علیحدہ مضامین کی حیثیت سے پڑھائے جاتے ہیں میں جس ثانوی اسکول میں پڑھاتا ہوں وہاں کے ۱۰۵۰ طالب علموں میں اکثریت ڈنگن طالب علموں کی ہے تقریباً چالیس فیصد طالب علم دوسری قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں تمام لڑکے اور لڑکیاں روسی زبان پر مہارت حاصل کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں رہتے ہیں کیونکہ اس سے انہیں ماسکو لینن گراڈ اور وسطی روس کے بڑے بڑے شہروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں چنانچہ ایک سیاح لکھتا ہے۔

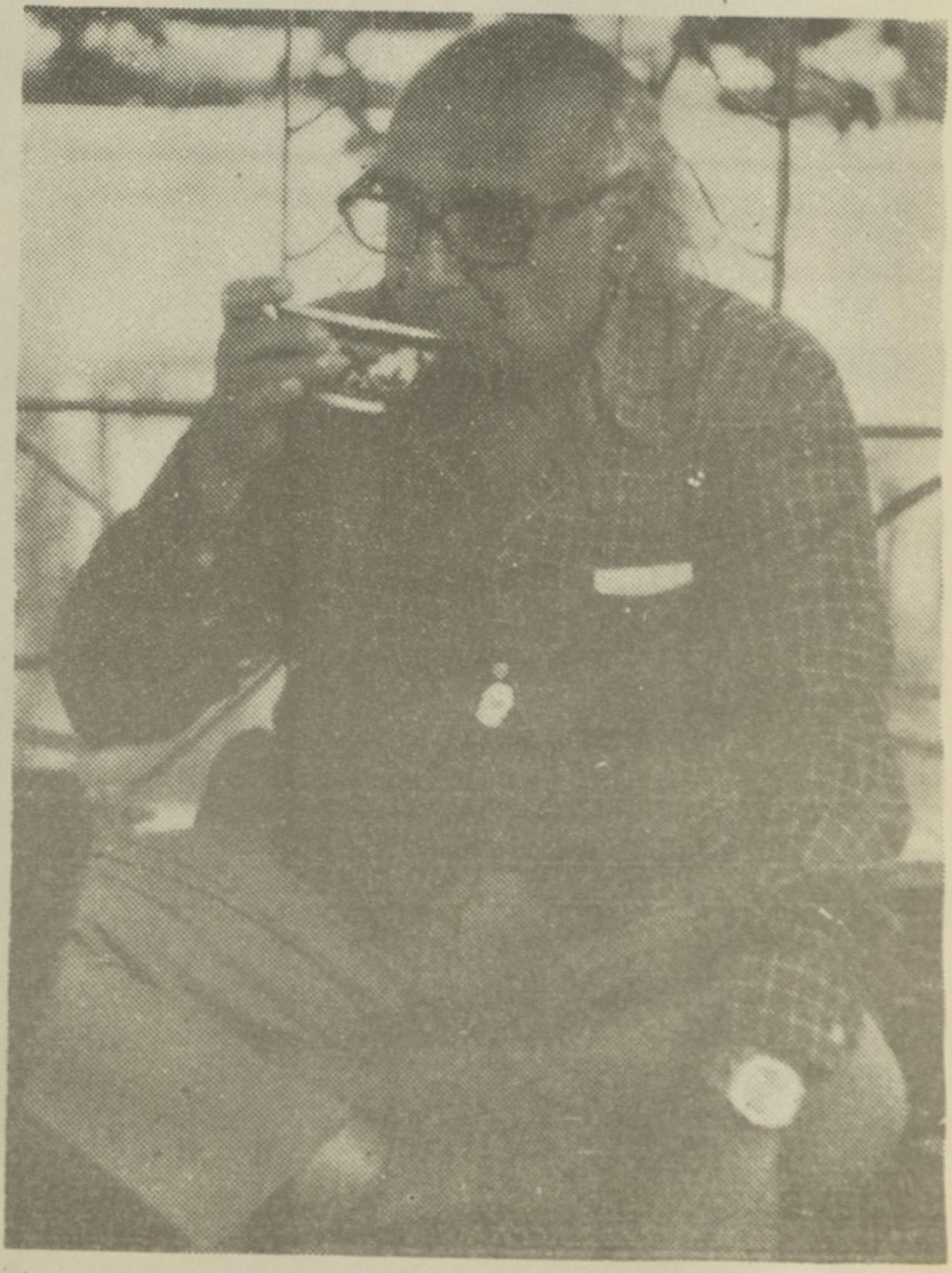
حال ہی میں مجھے جزیرہ سخالین میں سابق نفخی کیمپ (گی لیاکس) جانے کا اتفاق ہوا۔ آج کل یہ کیمپ رو چنوئے گاؤں ہے جو بحر اکاہل کے بالمقابل ایک جزیرے کی کھاڑی میں واقع ہے ماہی گیری کے اس گاؤں کی آبادی ۲۰۸ نفوس پر مشتمل ہے اس کی بڑی سڑک پر ایک پرائمری اسکول واقع ہے اس کے چاروں درجوں میں ساتا نائیس چار نفخی دو اُروچی اور تین روسی بچے زیر تعلیم ہیں یہ تمام بچے اپنی مادری زبان سے واقف ہیں لیکن انہیں روسی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد ماہی گیروں کے بچوں کو پڑوس کے ایک قصبہ پرونائیک کے ثانوی اقامتی اسکول میں بھیجا جاتا ہے یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ یا تو شہر ایگزینڈروسک کے ٹیچر ٹریننگ سکول چلے جاتے ہیں یا جا بار ووسک اور لینن گراڈ کے کالجوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں شمالی علاقے کے لوگوں کے لئے خصوصی شعبوں کا انتظام کیا گیا ہے

ایک نوجوان نفخی باشندے ولاڈی میر سانگی نے جو نفخی کا پہلا ادیب ہے اس نے اپنے علاقے کے قصوں اور داستانوں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی ہے اور نظموں اور افسانوں کے دو

مجموعے شائع کئے ہیں ۱۹۰۵ء میں اس نے لینن گراڈ ہرٹ زن ٹیچرز ٹریننگ کالج کے شعبہ جغرافیہ کی تکمیل کی تھی۔

اس نے بتایا "نغخی باشندوں کی اپنی کوئی تحریری زبان نہیں تھی۔ قدیم قصے کہانیاں داستانیں اور گیت نسلاً بعد نسل لوگوں کے حافظوں میں محفوظ چلی آتی رہی ہیں۔ نغخی کی تہجی کی پہلی کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ہے پہلے حروف تہجی مکمل ثابت نہیں ہوئے تاہم ۱۹۳۷ء میں ۴۴ حروف پر مشتمل دوسرے حروف تہجی رائج کئے گئے۔ لیکن بظاہر نغخی تحریری زبان میں ادب تخلیق کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ وقت گزر چکا تھا ۱۳ سال پہلے جب آمور نغخی بولی کی بنیاد پر جب تحریری زبان تیار کی گئی تو تمام روسی زبان بولتے تھے۔ وہ صدیوں سے دو زبانیں بولتے تھے تازہ ترین مردم شماری کے مطابق ۸۶۳ نغخی باشندوں کے نزدیک ان کی مادری زبان روسی تھی۔ نغخی باشندوں کی کل تعداد ۲۷۱۷ ہے۔ ان میں سے تقریباً دو ہزار نغخی براعظم میں دریائے آمو کے دہانے پر آباد ہیں۔ ہم نغخی باشندوں کے نزدیک روسی زبان قومیتوں کے درمیان محض میل جول ہی کا ذریعہ نہیں ہے۔ نغخی تحریری زبان عوام کے غیر تحریر شدہ آرٹ نظموں، اور گیتوں وغیرہ کو ضبط تحریر میں لانے کا ایک ذریعہ ہے۔ نغخی باشندے کاروباری خط و کتابت روسی زبان میں کرتے ہیں اور اخبارات اور کتابیں بھی روسی زبان میں پڑھتے ہیں لیکن وہ گھروں میں مادری زبان بولتے ہیں۔

سو یہ ہے تہذیبی انقلاب کی ابتدائی باتیں کیونکہ جہالت دور کرنے، تہذیبی معیار بلند کرنے کی پہلی شرط اپنی زبان پر عبور ہے چنانچہ آج چھوٹی سے چھوٹی جمہوریت کے بسنے والوں کو اپنی اور روسی زبان پر پورا پورا عبور حاصل ہے اور اس طرح وہ قومی اور بین الاقوامی تہذیب ایک جزو لاینفک بن گئے ہیں۔



مصنف سمرقند کے ایک چائے خانے میں۔





تاجک لڑکیاں ۔



کماکشیا کا بوڑھا ہیرو جس نے دوسری جنگ عظیم میں نازیوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا اپنی پوتی کے ساتھ۔

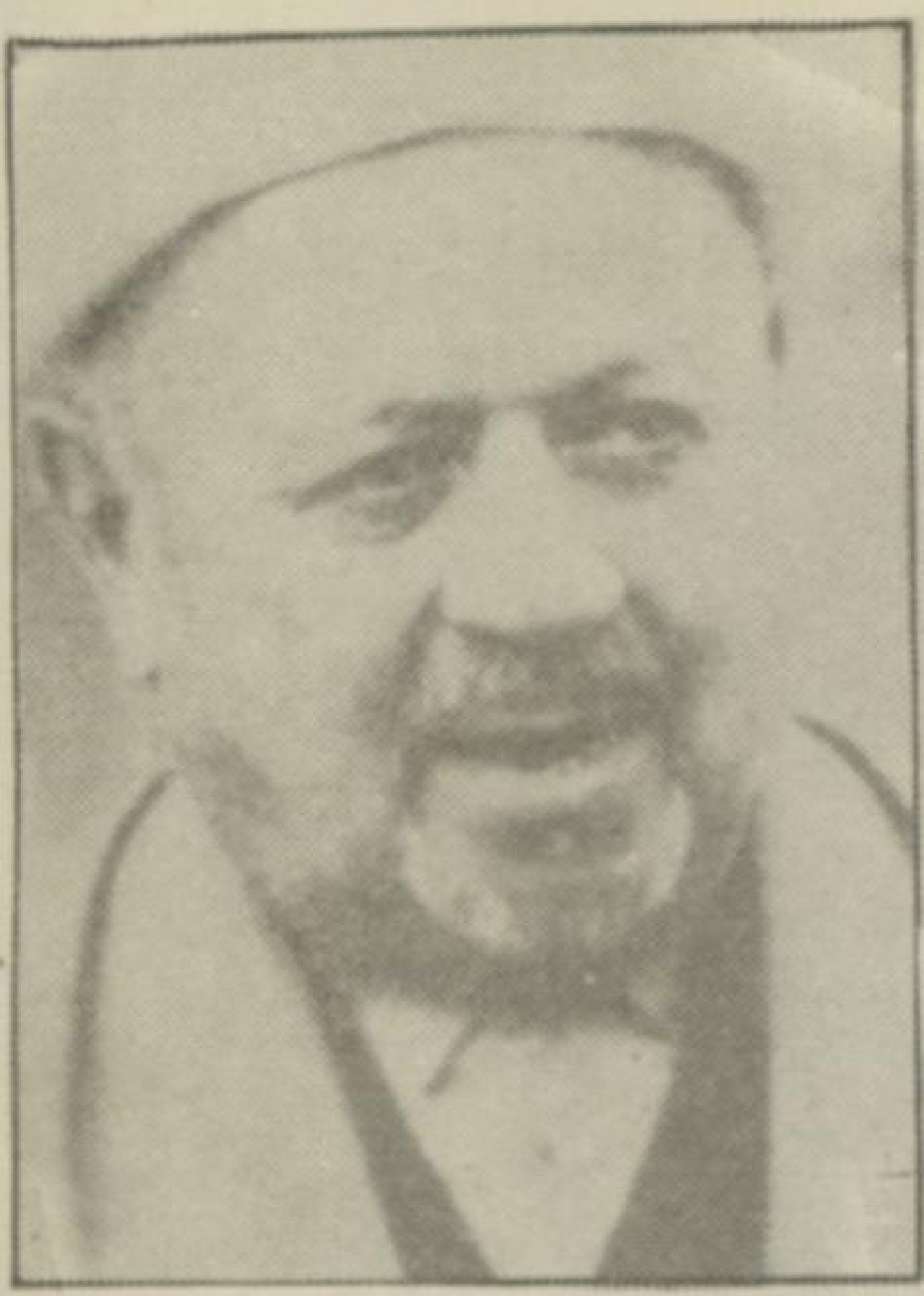


مصنف تاشقند یونیورسٹی میں تاجک پروفیسروں
کے ہمراہ

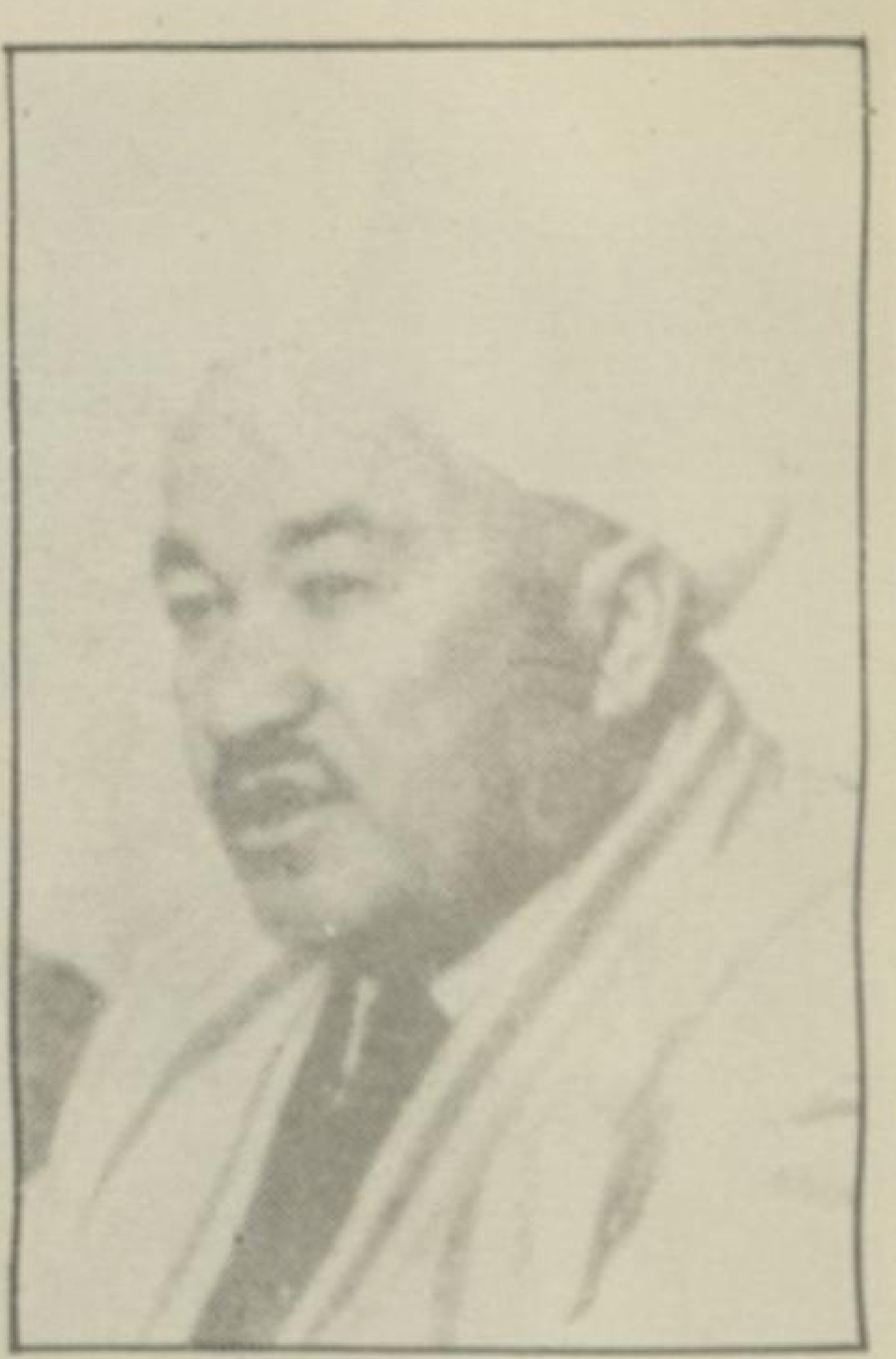




زبکستان کے کسانوں اور دستکاروں کی زندگی کی ایک جھلک



Mufti Ziyautdin-khan ibn Ishan Babakhan, President of the Muslim Council for Central Asia and Kazakhstan



Sheikh Abdulgani Abdullayev Vice-President of the Muslim Council for Central Asia and Kazakhstan



Sheikh-ul-Islam Haji Kazanfar Ibragimov, President of the Muslim Council for Transcaucasus



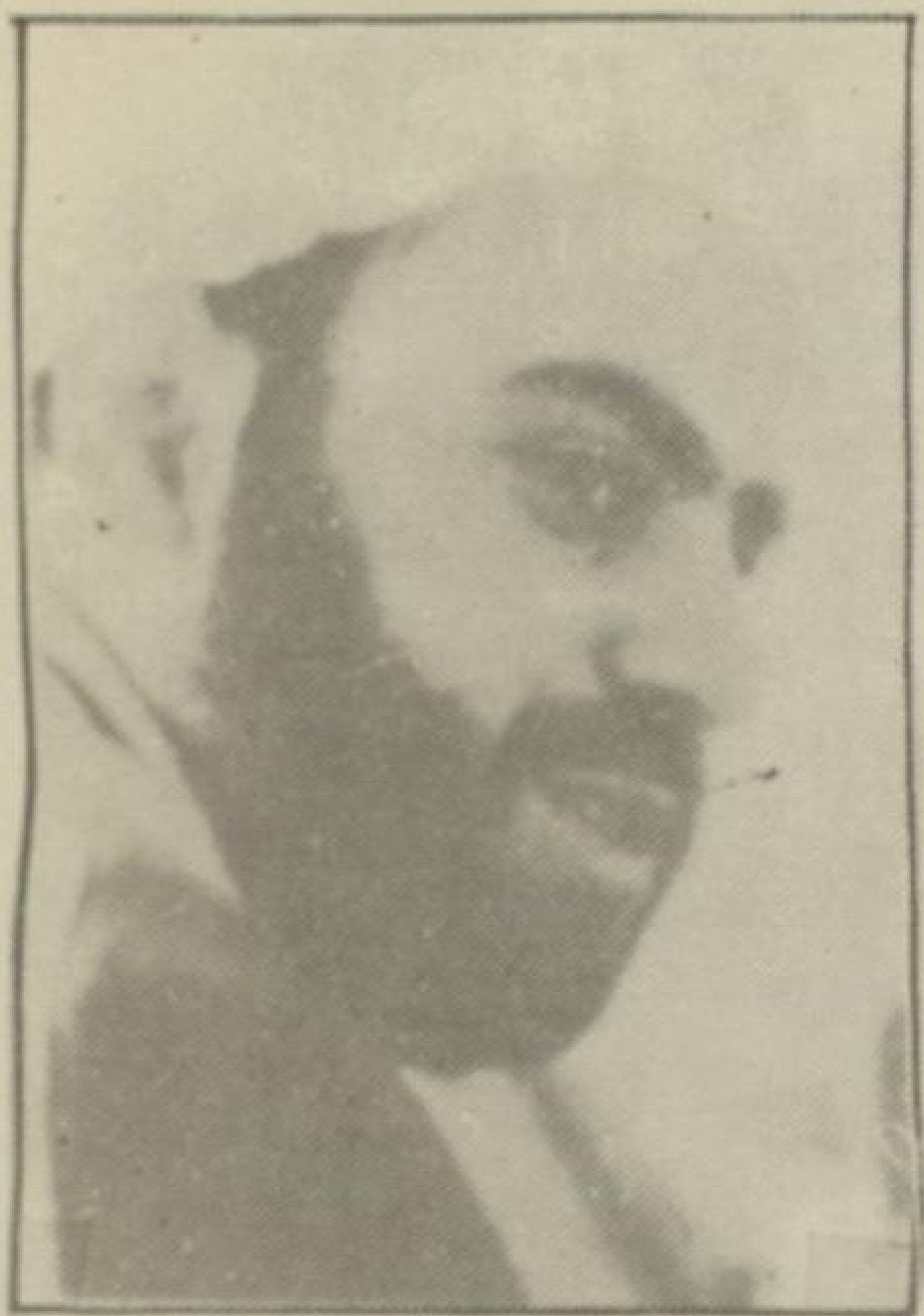
Qadi Mirzo Abdullo Kalonzoda, Head of the Muslims of Tajikistan



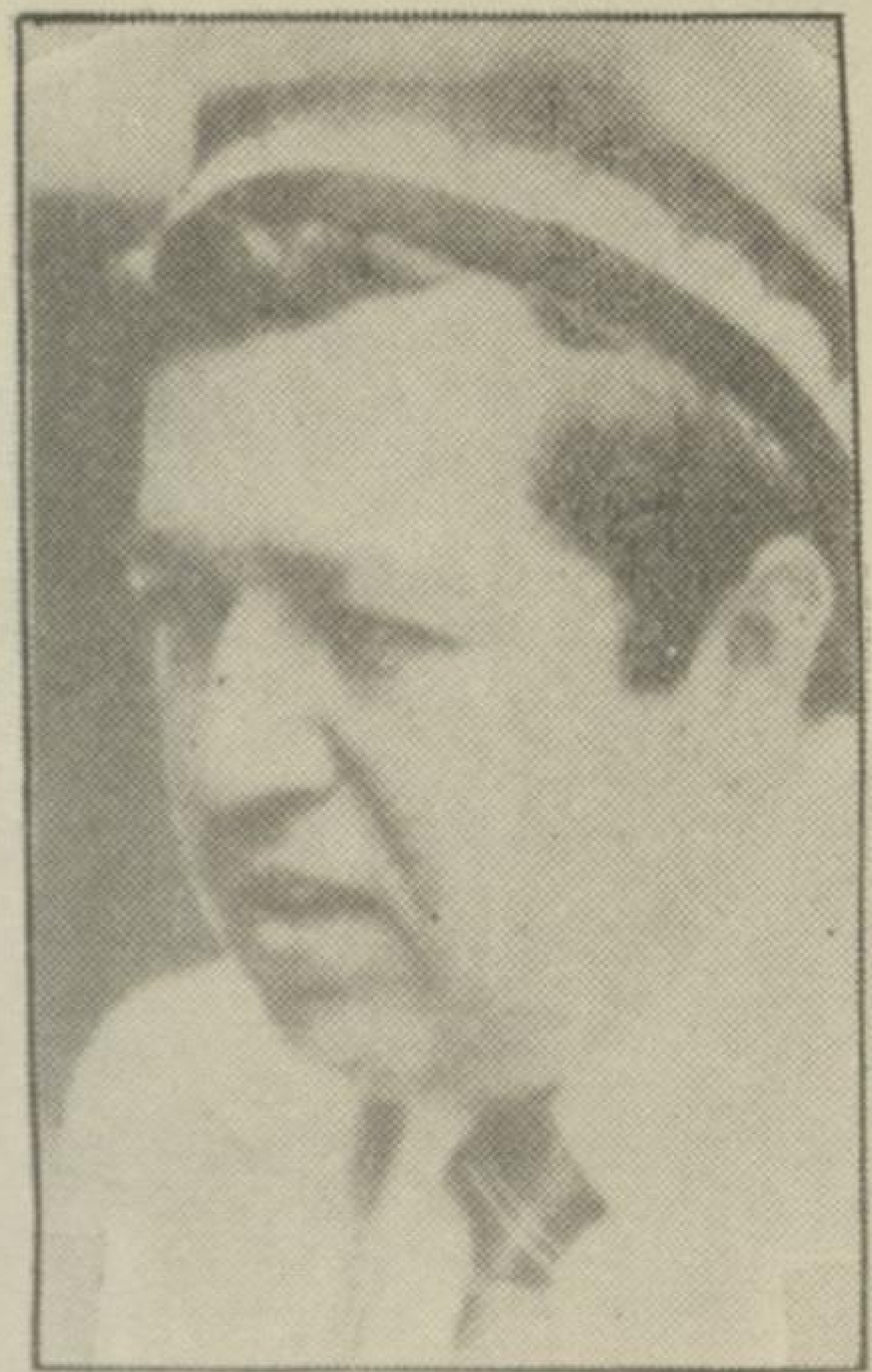
مفتی ضیاء الدین تاشقند میں کانفرنس ہال سے باہر آ رہے ہیں۔ غیر ملکی اور
سوویت یونین کی جمہوریتوں کے نمائندے ان کے ہمراہ۔



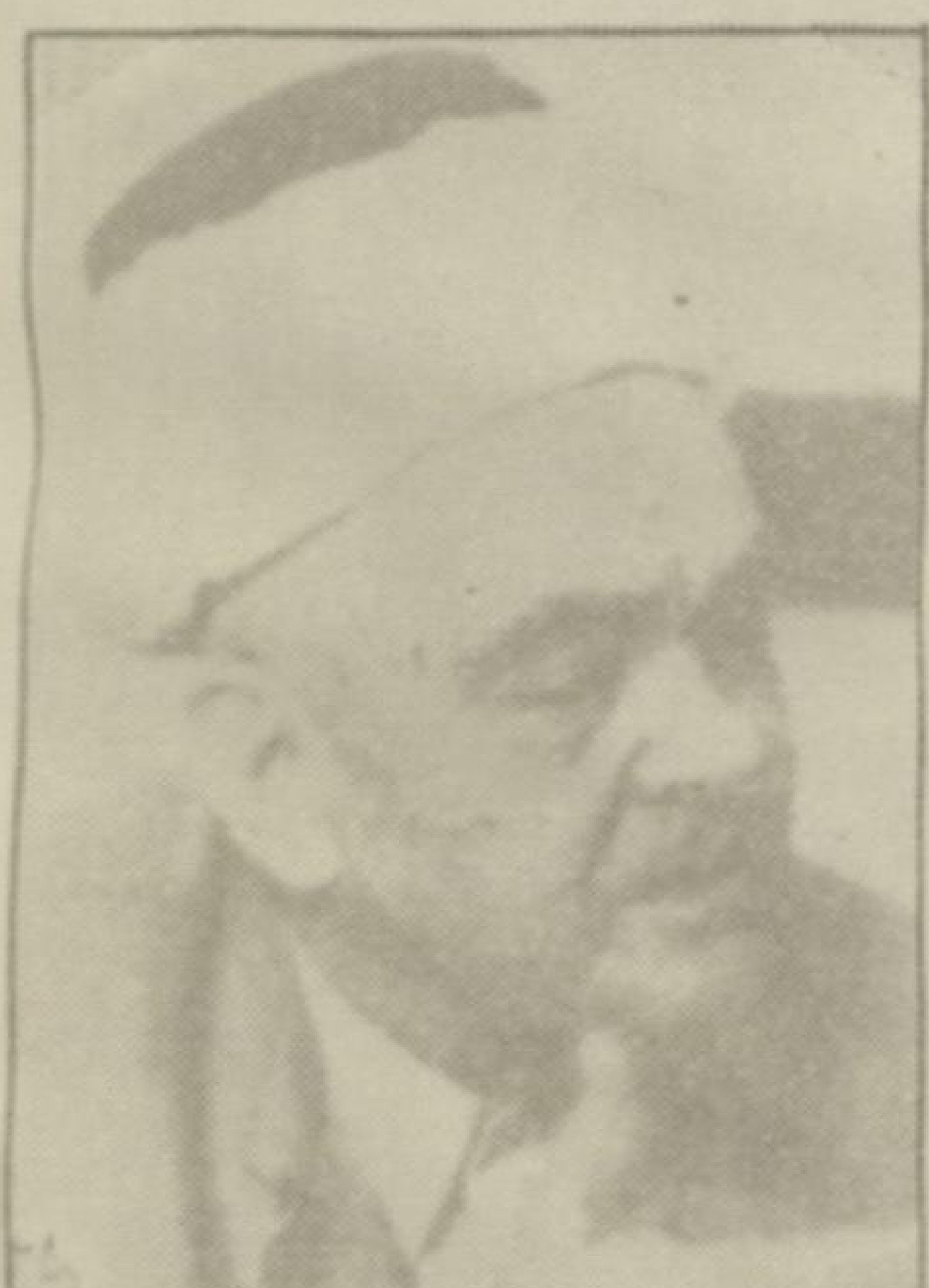
حکومت پاکستان کے مذہبی امور کے وزیر محمود ہارون تاشقند کی ایک مجلس میں ۔



Sheikh Allah-Shukur Pashayev, Vice-President of the Muslim Council for Transcaucasia



Shamsuddin Babakhanov, Rector of the Imam al-Bukhari Islamic Institute of Tashkent



Mufti Abdulbari Isayev, President of the Muslim Council for the European part of the USSR and Siberia



Mufti Mahmud Gekkiyev, President of the Muslim Council for North Caucasus

روزنامچہ

---

۱۷ اگست ۷۷ء

۱۷ اگست ۱۹۷۷ء

یہ جمہوریہ تاجکستان کا دارالحکومت دوشنبے ہے، شام کے آٹھ بجے ہیں، ہماری طرح یہاں کے دن بھی گرمیوں میں خاصے طویل ہو جاتے ہیں چنانچہ آٹھ بج رہے ہیں ابھی سورج غروب نہیں ہوا، بس غروب ہونے کو ہی ہے، سورج کی کرنوں میں اب تمازت ختم ہو رہی ہے سورج کی روشنی بھی آہستہ آہستہ مدھم پڑنی شروع ہو گئی ہے اس لمحے میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا ہوں، تھک کر چور ہو گیا ہوں، صبح آٹھ بجے کا نکلا ہوا ہوں اور اب شام کے آٹھ بجے ہیں پورے بارہ گھنٹے ہنگاموں میں گزارے ہیں آج دوشنبے سے پچھتر کلومیٹر دور ایک نئے شہر "نوریک" دیکھنے کے لئے گئے تھے یہاں اس جمہوریہ کا سب سے بڑا ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن تعمیر ہو رہا ہے یہ منصوبہ مختلف المقاصد ہے۔ اس منصوبے پر کام تو دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ۱۹۳۸ء میں شروع ہوا تھا لیکن جنگ کی وجہ سے اس پر کام رک گیا تھا اور جنگ کے خاتمے کے بعد بھی کافی عرصہ تک کام رکا رہا ہے لیکن اب پچھلے کئی سالوں سے اس پر بہت تیز رفتاری سے کام ہو رہا ہے چنانچہ اس منصوبے کو تیزی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سوویت یونین کی نوجوان کمیونسٹ لیگ سے رضاکاروں کے لئے اپیل کی گئی چنانچہ دیکھتے دیکھتے مختلف جمہوریتوں سے نوجوان کمیونسٹ اس منصوبے پر کام کرنے کے لئے پہنچ گئے اور اب عالم یہ ہے کہ تاجیک ہوں یا ازبک، یوکرینی ہوں یا جارجیا کی جمہوریت کے باشندے اب ہر جمہوریت کے نوجوان ماہرین اس منصوبے پر دن رات کام کر رہے

ہیں چنانچہ میری ملاقات اسی منصوبے پر کام کرنے والے تاجیک انجنیئر اشور علی فیض الہٰی سے ملاقات ہوئی یہ اب سپریم سوویت کا رکن بھی ہے۔

بجلی کے اس عظیم منصوبے نے اس علاقے کی کایا ہی پلٹ دی ہے، نئی زندگی دی ہے نیا ولولہ دیا ہے۔ مثلاً خود اس قصبے نوریک کو ہی لیجئے، یہ جنگ سے پہلے ایک معمولی سا گاؤں تھا جہاں کی آبادی بصد مشکل ایک ہزار تھی لیکن اب یہی گاؤں ایک اچھا خاصا خوبصورت سے شہر کی شکل اختیار کر گیا اب اس کی آبادی بتیس ہزار سے بھی زائد ہے اب یہاں کشادہ سڑکیں ہیں۔ باغات اور پارکیں ہیں تھیٹر ہیں سینما ہیں، کنڈر گارٹن ہیں۔ ہوٹل ہیں، ریسٹوراں ہیں۔ قہوہ خانے ہیں۔ اب یہاں سیاحوں کی بھرمار رہتی ہے۔

تعلقات عامہ کا شعبہ کسی ملک کا بھی ہو منصوبے دکھانا تو ان کا کام ہوتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں آکر اور ان منصوبوں کو دیکھ کر اس کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں سے زیادہ میں انسانی پہلوؤں سے متاثر ہوا ہوں کیونکہ میں نے قدم قدم پر یہ محسوس کیا ہے کہ مزدور طبقے میں ان منصوبوں کی وجہ سے بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی عددی تعداد اب پوری آبادی پر محیط ہوتی جا رہی ہے ایک طرف ان کی عددی تعداد بڑھتی جا رہی ہے تو دوسری طرف ان کا قومی اور بین الاقوامی شعور بھی بڑھ رہا ہے ایک وسیع قومی اور بین الاقوامی جذبہ ابھر رہا ہے۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا جب یہ مزدور اپنی اجرتوں میں سے ویت نام، انگولا، ایتھوپیا اور دوسرے نو آزاد اور تیسری دنیا کے ممالک کی ترقی و تعمیر کے لئے چندہ نہ دیتے ہوں، اسی نوریک میں ہر قومیت کے مزدور مرد اور عورتیں نظر آتی ہیں ان میں کوئی غریب نہیں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور حقارت کا کوئی جذبہ نہیں، اور یہ تاجک لوگ جو ساٹھ برس پہلے بالکل ہی پسماندہ تھے اور ان کی پسماندگی کو الفاظ میں بیان کرنا بہت ہی مشکل کام ہے وہ آج جدید ترین سہولتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور معیار زندگی کی اعلیٰ ترین حدوں کو چھونے لگے ہیں اور ان کے معیار زندگی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ اب دور دراز دیہات میں بھی جدید ترین فلیٹ تعمیر کئے جا رہے ہیں اور ہر خاندان کے پاس ریفریجریٹر اور ٹیلی ویژن ہوگا۔ اگلے پنجسالہ منصوبہ میں باقاعدہ اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

میں زندگی میں خاصا گھوم چکا ہوں، دیس دیس گھوما ہوں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے لیکن قدرت کی جو فیاضیاں میں نے ان خطوں میں دیکھی ہیں وہ کم ہی کسی اور خطے میں ہوئی ہوں گی لیکن قدرت کی اس فیاضی سے جس قدر سلیقے اور مہارت کے ساتھ استفادہ یہ لوگ کر رہے ہیں وہ واقعی قابل رشک ہے۔ پارکیں باغات، جھیلیں، سایہ دار درخت، درختوں کے سائے میں پگڈنڈیاں، بنچیں بچھی ہوئی، فوارے پھوٹ رہے ہیں اور ان کی پھوار ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی ہے ایسی فضا میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، بوڑھے بوڑھیاں گھومتے ہیں، سستاتے ہیں اور زندگی کی رعنائیوں اور دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں ان مناظر نے مجھے پاگل بنا دیا ہے جی چاہتا ہے کہ میں گھومتا رہوں، اب سبزہ یہاں پہلے بھی ہوتا ہوگا، پھولوں کے درخت بھی اُگے ہوں گے، انگور کی بیلیں بھی پھیلتی پھولتی ہوں گی لیکن اب ان کو جس انداز سے ترتیب دیا جاتا ہے اس سے ایک ذوق، ایک جذبے اور ترتیب حسن کی خواہش اور اس حسن اور قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے ساتھ ہی یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ سماجی تبدیلیوں اور ان سماجی تبدیلیوں سے غم روزگار سے جو چھٹکارا حاصل ہوتا ہے اس سے یہ حسن کتنا زیادہ نکھر آتا ہے اور جیسے جیسے انسان روٹی کپڑے مکان کے حصول کی جدوجہد میں کامیاب ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی توجہ آرٹ کی طرف زیادہ مبذول ہوتی ہے وہ حسن کو نکھارنے میں زیادہ مصروف ہو جاتا ہے کیونکہ اگر انسان کو روٹی روزگار کے غموں سے نجات ہو، اگر اسے کل کی فکر نہ ستاتی ہو اگر اس کی زندگی میں تحفظ اور استحکام ہو تو پھر قدرت کے مناظر بھی حسین لگتے ہیں اور ہر انسان کے اندر کا سویا ہوا فنکار، سویا ہوا شاعر خوابیدہ آرٹسٹ انگڑائیاں لینے لگتا ہے چنانچہ آج یہاں اس شہر کے گلی کوچوں کی در و دیوار پر میورل نظر آتے ہیں کوئی عمارت ایسی نظر نہیں آتی جہاں نقش و نگار نہ بنے ہو اور اس عمارت کے حسن کو دوبالا نہ کیا گیا ہو۔

وسطی ایشیا کی سوشلسٹ جمہوریتوں میں یہ میرا دوسرا دن ہے، میں ۱۵ اور ۱۶ اگست کی درمیانی شب کو عائشہ اور سرمد کو خدا حافظ کہہ کر ماسکو سے روانہ ہوا تھا

عائشہ مصر تھی کہ وہ ماسکو ہی میں رہے گی کیونکہ وہ سرمد کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اشفاق بیگ اور مارسکی نے بھی اصرار کیا کہ عائشہ کو ماسکو میں رہنے دیا جائے یہاں وہ اپنا چیک اپ بھی کرائے گی اور ماسکو میں گھوم پھر بھی لے گی کیونکہ وسطی ایشیا کی جمہوریتوں کا تھکا دینے والا سفر اور پھر وہاں کی گرمی ممکن ہے اس کی صحت کے لئے زیادہ بہتر نہ رہیں چنانچہ اس لئے میں اکیلا ہی اپنی گائیڈ جس کا نام سرگئی ہے کے ہمراہ دوشنبے کے لئے روانہ ہوا تھا، رات بارہ بجے کے قریب ہمارا ہوائی جہاز دوشنبے کے لئے روانہ ہوا اور صبح جب پو پھٹ رہی تھی اور سورج کی کرنوں کی تمازت نے ابھی چبھنا نہیں شروع کیا تھا تو ہم دوشنبے کے ہوائی اڈے پر تھے۔

یہ ۱۶ اگست کی صبح تھی، ہم سیدھے ہوٹل پہنچے، یہ ہوٹل تاجکستان کے نام سے موسوم ہے اور اس شہر کا سب سے بڑا ہوٹل ہے اور اکثر و بیشتر حکومت کے تمام مہمان اور سیاح یہیں ٹھہرتے ہیں جدید طرز کا یہ ہوٹل آٹھ منزلوں پر مشتمل ہے۔ کمرے کوئی زیادہ کشادہ نہیں لیکن آرام دہ ہیں، بالکل ہمارے انٹر کانٹی نینٹل کے کمروں کی مانند۔ اس ہوٹل میں ۵ سو کمرے ہیں۔ جن میں ایک ہزار افراد ٹھہر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ہوٹل پہنچ کر سامان رکھا اور ناشتے کے لئے چلے گئے سو وہاں سے فارغ ہوئے تو دوشنبے کے وقت کے مطابق ۸ بجے تھے چنانچہ یہ طے کیا کہ دو اڑھائی گھنٹے سو لیا جائے اور ساڑھے دس بجے تیار ہو کر گھومنے کا پروگرام بنائیں گے۔

میں APN جو سوویت یونین کا ایک قسم کا محکمہ اطلاعات و مطبوعات ہے کا مہمان ہوں چنانچہ ۱۱ بجے ہم دوشنبے میں APN کے دفتر پہنچے یہاں APN کا انچارج ایک تاجک ظہیر ہے اس سے ملاقات ہوئی اور اس نے بتایا کہ مشین سازی کی ایک بڑی فیکٹری دیکھنے کا پروگرام ہے چنانچہ ہم اس کارخانے کے لئے روانہ ہوئے اس کارخانے میں ٹیکسٹائل ملوں کے لئے مشینیں تیار ہوتی ہیں دوشنبے کے اس کارخانے کا شمار پورے سوویت یونین کے بڑے بڑے کارخانوں میں ہوتا ہے چنانچہ یہاں سے مشینری صرف سوویت یونین کی مختلف جمہوریتوں کو ہی نہیں بھیجی جاتی بلکہ دوسرے سوشلسٹ ممالک

اور تیسری دنیا کو بھی یہ کارخانہ مشینری برآمد کرتا ہے۔ کارخانے کے ڈائریکٹر نے مجھے بتایا کہ پاکستان بھی ان ممالک میں شامل ہے جہاں یہ مشینری برآمد کی جاتی ہے۔ یہ کارخانہ ۱۹۳۳ء میں قائم ہوا تھا دوسری جنگ عظیم کے بعد اس میں توسیع کی گئی چنانچہ اب اس کارخانے میں جدید ترین اور خودکار مشینیں تیار کی جاتی ہیں، لطف یہ ہے کہ بڑی بڑی مشینوں کے ساتھ ساتھ یہاں روزمرہ کے استعمال کی چھوٹی چھوٹی مصنوعات اور برتن بھی تیار کئے جاتے ہیں۔

اس کارخانے میں دو گھنٹے تک گھومتے رہے یہاں کے کیفیٹریا میں گئے مختلف مزدوروں سے ملے یہاں پر مزدوروں میں تقریباً نصف تو عورتیں ہیں۔ دوپہر کو ہوٹل آئے کھانا کھایا اور آرام کیا اور پھر شام کو شہر کی سیر کے لئے نکلے سب سے پہلے تو میں مشہور عالم بابا جان غفوروف کی قبر پر فاتحہ کے لئے گیا۔

بابا جان غفوروف کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، وہ بہت زبردست عالم اور محقق تھے اور سوویت یونین کی مشرقی علوم کی جو اکاڈمی ہے اس کے سربراہ تھے وسطی ایشیا کی تہذیب و تاریخ پر انہوں نے کئی ایک تحقیقی کتابیں لکھی ہیں اور وہ حکومت پاکستان کی دعوت پر پاکستان کا بھی کئی بار دورہ کر چکے تھے میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں ماسکو میں ہی ہوئی مجھے بنّے بھائی سجاد ظہیر مرحوم نے ان سے ملوایا تھا پھر وہ پاکستان بھی آئے تھے تو ان کے ساتھ کئی نشستیں رہی تھیں، ان کو دوشنبے کے قریب ہی ایک قبرستان میں دفنایا گیا ہے، ان کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور جب میں نے اپنے گائیڈ کو ان کے متعلق بتایا تو وہ میری معلومات سے بہت متاثر ہوا دراصل انہیں پچیس چھبیس سال کے نوجوان کو کیا معلوم کہ دوسرے ممالک کے بوڑھے کمیونسٹوں کو سوویٹ یونین کی تاریخ کتنی ازبر ہے اتنی ان کو خود بھی شاید معلوم نہ ہو۔

دوشنبے اس طرح کا تاریخی شہر نہیں ہے جیسا کہ سمرقند ہے یا بخارا، یہ دوشنبے بیسویں صدی میں ہی پھلا پھولا ہے اس سے پہلے اس کی حیثیت ایک گاؤں کی تھی لیکن اس گاؤں کی بھی ایک حیثیت ضرور رہی ہے اسی لئے تاریخ میں اس کا ذکر موجود ہے۔

چنانچہ سترھویں صدی کے سفرناموں میں اس گاؤں کا ذکر ملتا ہے بطور ایک ایسے گاؤں کے جہاں خرید و فروخت کے لئے ہر دوشنبہ یعنی پیر کو منڈی لگا کرتی تھی کیونکہ یہ گاؤں وادیِ کسارا اور بخارا و سمرقند جانے والے راستے کے درمیان پڑتا تھا چنانچہ کارواں یہاں پر قیام کرتے اور یہاں سے اشیا خریدتے اور فروخت کرتے اسی وجہ سے اس گاؤں کا نام ہی دوشنبے پڑ گیا چنانچہ بیسوی صدی کی پہلی دو دہائیوں میں بھی یہ ایک بہت ہی پسماندہ مختصر سا گاؤں تھا جس کی گلیاں نہ صرف کچی تھیں بلکہ یہ کیچڑ سے لت پت رہتیں لیکن ۱۹۲۹ء میں جب ترسیز سے دوشنبے تک ریل کی پٹڑی بچھائی گئی تو پھر اس کی ترقی و تعمیر کی رفتار تیز ہو گئی اس لحاظ سے یہ شہر خالصتاً ایسا شہر ہے جو انقلاب کے بعد تعمیر ہوا چنانچہ کل کا یہ گاؤں آج تاجکستان کی جمہوریہ کا دارالحکومت ہے اس کی آبادی ۴ لاکھ ہے تاجک کمیونسٹ پارٹی اور سپریم سوویت کے دفاتر بھی یہیں ہیں۔ کل جو شہر سوئی سے لے کر لیمپ تک ہر چھوٹی بڑی چیز باہر سے درآمد کرتا تھا آج بڑی سے بڑی مشینری برآمد کرتا ہے اس کی مصنوعات کم از کم ۴۰ بیرونی ممالک کو برآمد ہوتی ہیں۔

اس شہر کو اب تہذیبی حیثیت بھی حاصل ہے اور یہاں یونیورسٹیاں، دارالعلوم اور سائنس اکاڈمیاں کام کر رہی ہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں محقق، عالم اور سائنسدان مصروف ہیں۔ آج یہاں پر ان گنت تھیٹر، رقص گاہیں، سینما ہال ہیں۔ یہاں لاہوتی تھیٹر ہے اور جگہ جگہ پرانے اساتذہ لاہوتی اور عینی کے مجسمے ہیں۔ فلم اسٹوڈیو ہیں جہاں تاجک زبان میں فلمیں تیار ہوتی ہیں اور یہیں فردوسی لائبریری ہے جہاں مخطوطوں کے علاوہ بیس لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ سو یہ شہر تھا جو اب لاہور کا برادر شہر تصور ہوتا ہے چنانچہ اس سلسلے میں باقاعدہ دوشنبے میں ایک تقریب بھی منعقد ہوتی تھی جس میں اس وقت کے لاہور کے ڈپٹی کمشنر حفیظ اللہ اسحق نے شرکت کی تھی۔ چنانچہ اس شہر میں خوب گھوما، ایسے ہمارے لئے تو یہ بہت ہی چھوٹا اور خاموش شہر ہے کیونکہ ہم جو چالیس پچاس لاکھ کے شہروں کے رہنے والوں کے لئے ۴ لاکھ کا شہر اور اس کی رونق کیا معنی رکھ سکتی ہے لیکن اس کے باوجود انگور کی بیلوں سے ڈھانپتی ہوئی پگڈنڈیوں سے گزرنا وہاں کالج کے

لڑکے لڑکیوں کے ہجوم دیکھنا اور چاروں طرف درخت سبزہ، فوارے یہ نظارے خوب ہیں اور اس شہر میں رنگا رنگ کے لباس میں اور مختلف قومیتیں ہیں، چنانچہ آج جب مشین سازی کے کارخانے میں بھی گیا تھا تو اس کارخانے کے ڈائریکٹر سے میں نے دوران گفتگو جب یہ پوچھا کہ کارخانے میں تاجک مزدوروں کا کیا تناسب ہے تو وہ کہنے لگا کہ یہ تناسب ہم نہیں رکھتے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ صرف اس کارخانے میں پانچ سو ملازمتیں خالی ہیں اور ہمیں لوگ نہیں ملتے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ سوویت یونین دنیا بھر کی قومیتوں اور نسلوں کا چڑیا گھر ہے لیکن اس کے باوجود کوئی تضاد نہیں کوئی منافشت نہیں اور تمام لوگ ایک ساتھ رہ رہے ہیں، چونکہ روٹی روزگار کا مسئلہ حل ہو گیا ہے اس لئے اب کوئی یہ نعرہ نہیں لگاتا " پنجابی میری روٹی، میرا روزگار چھین کر لے گیا ہے اس کو اس شہر، اس صوبے سے نکالو" چنانچہ ڈائریکٹر نے بتایا کہ ان کے کارخانے میں سوویت یونین کی ۴۲ قومیتوں کے مزدور کام کر رہے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ ویت نام سے بھی ماہرین کام سیکھنے کے لئے خاصی تعداد میں آتے ہیں۔

بین الاقوامی بھائی چارے کے سلسلے میں ڈائریکٹر نے بتایا کہ ہر سال چھٹیوں میں کچھ تعداد میں مزدوروں کو بمعہ خاندانوں کے دوسرے سوشلسٹ ممالک میں بھیجا جاتا ہے جہاں وہ وہاں کے مزدور خاندانوں کے مہمان ہوتے ہوتے ہیں اسی طرح دوسرے سوشلسٹ ممالک کے مزدور بمعہ خاندانوں کے یہاں ہمارے خاندانوں کے مہمان ہوتے ہیں اس سے سوشلسٹ برادری کے تعلقات گہرے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے یہی نہیں بلکہ کارخانوں میں کام کے سلسلے میں سیمینار بھی منعقد ہوتے اور اپنے اپنے تجربات کے بارے میں تبادلہ خیال بھی ہوتا رہتا۔

یہاں جو ڈیم بنتے ہیں ان سے کئی ایک جمہوریتیں مستفید ہوتی ہیں مثلاً نوریک میں جو ڈیم بنایا گیا ہے اس سے ترکمانیہ اور ازبکستان کی جمہوریتیں استفادہ کر رہی ہیں یہاں ہر لمحہ احساس ہوتا ہے کہ چاروں طرف تعمیر ہو رہی ہیں، کچھ نہ کچھ بن رہا ہے۔ ہر لمحہ تبدیلی محسوس ہوتی ہے اس تعمیر و ترقی میں نئی اقدار، نئے جذبے اور نئے رشتے استوار ہو رہے

ہیں مثلاً ہمارے ہاں یہ عام تاثر ہے کہ روسیوں نے باقی تمام چھوٹی قومیتوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا ہوا ہے لیکن یہاں لوگوں سے مل کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ایسا کوئی جذبہ یہاں نہیں ہے بلکہ یہاں کا دانشور یہ تسلیم کرتا ہے کہ ان کی تعمیر و ترقی میں روسیوں کا بہت اہم حصہ ہے کیونکہ جب انقلاب ہوا تو ماہرین صرف روسیوں کے پاس تھے چنانچہ پارٹی کی اپیل پر دور دراز سے لوگ آئے اور یہاں کی تعمیر میں ہاتھ بٹاتے رہے نوجوان کمیونسٹوں نے زبردست کام کیا ہے اور کئی ایک تو یہاں ہی بس گئے یہاں آکر احساس ہوتا ہے کہ یہاں پر کمیونسٹ پارٹی، ٹریڈ یونین، نوجوان کمیونسٹ لیگ کی کیا اہمیت، ہر کارخانہ، ہر فارم پر ان تنظیموں کے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی کمیٹیاں پورے اداروں کو جمہوری طریقوں سے چلاتی ہیں۔

یہی نہیں بلکہ نوریک میں بجلی گھر، ڈیم اور دوسرے منصوبوں پر کام ہو رہا ہے تو یہاں پر باقاعدہ ان منصوبوں کی فنی تعلیم اور تربیت کے لئے باقاعدہ ایک انسٹیوٹ قائم کر دیا گیا ہے جس میں طلبا باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر یہاں سے فارغ ہو کر وہ ان منصوبوں پر کام شروع کر دیتے ہیں۔

سمرقند

۱۹ر اگست ! آج کون سا دن ہے یہ مجھے قطعاً یاد نہیں، تاریخوں کا بھی اندازہ نہ ہوتا اگر پروگرام معلوم نہ ہوتا۔ چونکہ پروگرام پر درج ہے کہ فلاں شہر جانا ہے اس لئے اس حساب سے بھی تاریخ یاد رہ جاتی ہے، چنانچہ اس وقت صبح کے پانچ بجے ہیں میں نہا دھو کر تیار بیٹھا ہوں۔

کل دوپہر کو بارہ بجے دوشنبے سے چلے تھے۔ اس لئے پہلے تاجک دوستی کی انجمن میں اس انجمن کے سربراہ کے نائب سے گپ کی، وہی جو رسمی باتیں ہوتی ہیں لیکن ان رسمی باتوں کی پشت پر ایک باقاعدہ نظریہ، ایک فلسفہ، ایک منصوبہ ہوتا ہے مثال کے طور پر یہ لوگ واقعی اپنی دوستی کی انجمنوں کے ذریعے اپنے عوام کو اس ملک سے روشناس

کراتے ہیں اور لوگوں کو بہت حد تک اس ملک کے عوام سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب مثلاً فیض کو اکثر و بیشتر لوگ جانتے ہیں اقبال سے روشناس ہیں۔ اس طرح ایک تو بین الاقوامی بھائی چارے کو فروغ ملتا ہے دوسری طرف غیر سوشلسٹ ممالک میں عوامی سیاست سے بھی اشنائی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں ۱۴ اگست کا دن بھی اس انجمن کی طرف سے منایا گیا۔

میں یہاں وسطی ایشیا کی جمہوریتوں میں اب صرف ایک سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے آیا سوشلسٹ معاشرے میں بالآخر مذہب زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں تو اس کا جواب فقط ایک ہے بحیثیت ایک تہذیبی عنصر کے ہاں رہ سکتا ہے لیکن عبادات وغیرہ کا کاروبار بالآخر ختم ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ اس میں زبردستی اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ تعلیم، کمیونسٹ پارٹی کا پروپیگنڈہ اور سماج میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کا اثر کچھ عرصے میں نمایاں ہونے لگتا ہے چنانچہ یہاں پر جب سماجی تبدیلیاں ہونے لگیں تو سب پہلے رسم الخط بدلا گیا، شروع میں فارسی اور تاجک زبانوں کو لاطینی رسم الخط میں لکھا جانے لگا لیکن بالآخر روسی رسم الخط ہی اپنا لیا گیا چنانچہ اب اس قوموں اور نسلوں اور تہذیبوں کے چڑیا گھر میں اور وسیع و عریض ملک میں ایک ہی زبان کا دور دورہ ہے ہر بچہ ہر بوڑھا اب روسی بولتا ہے اور سمجھتا ہے گھروں میں وہ اپنی زبان بولتے ہیں تعلیم بھی اس میں ہوتی ہے لیکن ساتھ روسی پڑھنا لکھنا لازمی ہوتا ہے۔ بالکل ہماری طرح اردو ہر تعلیم یافتہ کو آتی ہے۔ اس لئے یکجہتی پیدا ہوئی، پھر عورتوں کو آزادی ملی، برقعے اترے، ان کی غلامی ختم ہوئی۔ چنانچہ اب یہاں پر پسماندہ معاشرے کی مذہب پرستی کی چھاپ ڈھونڈنی بے کار ہے اور یہ عمل صرف اسلام کے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ بھی یہی واردات ہوئی ہے غرضیکہ یہاں پر خدا پر اعتقاد رکھنے والے لوگ مل جائیں گے۔

دوشنبے میں ایک بات بہت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی کہ یہاں پر نوجوانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور زندگی میں سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ سینماؤں تھیٹروں کے باہر تمام دن نوجوانوں کا ہجوم نظر آئے گا۔ باغوں اور پارکوں کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ

موجود ہوتے ہیں، سرِراہ کیفے ہیں اور کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور یہ نوجوان گپ کر رہے ہیں، غرضیکہ غم بے بسی اور مستقبل سے مایوسی کی پرچھائیاں دور دور بھی نظر نہیں آتیں۔

بارہ بجے ہوائی اڈہ پر پہنچے، ایئر فلوٹ کا فوکر چھوٹے فاصلوں پر پرواز کرتا ہے، غیر ملکی سیاحوں کے علاوہ خاصے لوگ تھے اور ہوائی اڈہ پر اتنی ہی بھیڑ رہتی ہے جتنی کہ ہمارے ہاں اسٹیشنوں پر ہوتی ہے۔ جہاز میں بے پناہ گرمی تھی۔ ساڑھے بارہ بجے ٹھیک پرواز شروع ہوئی اور ٹھیک ساڑھے بارہ بجے سمرقند پہنچ گئی۔ دوشنبے اور سمرقند کے وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے سمرقند میں گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے ہوتی ہیں۔ ہوائی جہاز میں سامان رکھنا اور اتارنا ایک مسئلہ ہوتا ہے اس لئے کہ ہاتھ میں ہی اٹھانا بہتر رہتا ہے گو سامان زیادہ نہیں لیکن پھر بھی جہاز سے لانج تک اٹھا کر چلنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے اور تھکن ہو جاتی ہے۔ جب ہم کار میں بیٹھ کر شہر کو روانہ ہوئے اور جیسے شہر کی حدود میں داخل ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ ملتان میں آگئے ہیں جہاں چاروں طرف نیلے نیلے گنبدوں والے مقابر اور مساجد ماضی کی عظمتوں کا پتہ دے رہے ہیں۔ ہوٹل میں پہنچے تو اس کا لفٹ خراب تھا اب سامان لے کر چار منزلیں چڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن جب چوتھی منزل پر پہنچے اور کمرے میں گئے تو وہاں کوئی اور مسافر تھے تو پتہ چلا کہ ہمارے کمرے ساتویں منزل پر ہیں بہرحال گائیڈ بے چارے نے ہانپتے کانپتے سامان کمروں میں پہنچایا۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر کچھ دیر کے لئے لیٹ گئے مجھے یہاں اس تاریخی شہر میں صرف ۲۴ گھنٹے گزارنے ہیں اس لئے میں ان چوبیس گھنٹوں کو پوری طرح سمرقند کو جاننے کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں۔

سمرقند و بخارا کے نام ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک حصہ ہیں اور ان شہروں کو جانے بغیر یہ بھی ہماری روح کا حصہ بنے ہوئے ہیں چنانچہ اسی لئے میں تو سمرقند جانے پر اصرار کیا تھا کیونکہ سمرقند تاریخی لحاظ سے غالباً وسطی ایشیا کے قدیم ترین شہروں میں ان میں سے ایک ہے اس شہر کا نام پہلے پہلے سکندر اعظم کی مشرقی مہموں کے تذکرے میں ملتا ہے لیکن ان تذکروں میں اس شہر کا حوالہ سمرقند کے نام سے نہیں بلکہ "مارا کندا" کے نام سے ملتا ہے چنانچہ یہ بھی ان تذکروں میں کہا گیا ہے کہ سکندر اعظم نے کئی بار اس شہر پر قبضہ کیا اور اسے بالآخر

پیوند خاک کر دیا لیکن اس کے برعکس عرب دیو مالاؤں میں سکندر اعظم کو اس شہر کا بانی ظاہر کیا گیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سمر قند کے بارے میں حتمی طور پر اور باوثوق کوئی تذکرے ملتے ہیں تو وہ چینی سیاحوں اور سفیروں کے حوالے سے ملتے ہیں۔

چھٹی صدی میں اس شہر اور اس کے نواح کے تمام علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا لیکن ساتویں صدی میں مقامی حاکموں نے بالا دستی حاصل کر لی اور پوری وادی زرفشاں نے زبردست ترقی کی چنانچہ تذکروں میں کہا گیا ہے کہ ساتویں صدی میں سمر قند ایک اہم تجارتی شہر تھا چنانچہ مملکت چین کے سفیر وی ٹی TSE نے D جو یہاں ۶۰۵ سے ۶۱۷ تک کے درمیانی سالوں میں مقیم رہا اس شہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مملکت سمر قند کے لوگ بڑے مشاق تاجر ہیں، جیسے ہی ان کے بچے پانچ سال کی عمر کو پہنچتے ہیں ان کو لکھنا پڑھنا سکھایا جانے لگتا ہے۔ جب وہ پڑھ لیتا ہے تو پھر اسے کامرس سیکھنے پر لگا دیا جاتا ہے آبادی کی اکثریت کے نزدیک منافعوں کی وصولی اچھا پیشہ تصور ہوتا ہے۔"

اٹھویں صدی میں یہاں عرب فاتحین پہنچے ۷۱۲ میں قطیبہ بن مسلم نے اس شہر پر قبضہ کر لیا لیکن یہاں کے باشندوں نے ایک سال بعد زبردست بغاوت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب فاتحین نے بڑی سختی کے ساتھ اس بغاوت کو نہ صرف دبا دیا بلکہ مقامی باشندوں کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور عرب یہاں بسنے لگے، لیکن اس کے باوجود وادی زرفشاں اور کاشکار دریا کے کناروں پر واقع دیہات میں وقتاً فوقتاً کسانوں کی بغاوتیں ہوتیں رہیں جو عرب حملہ آوروں اور مقامی جاگیرداروں کے خلاف ہوتی تھیں۔

۱۲۱۹ میں منگولوں کی یلغار شروع ہوئی اور انہوں نے دیکھتے دیکھتے اس چھلتے پھولتے شہر کو تہس نہس کر دیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ شہر کبھی سر نہیں اٹھائے گا لیکن تیرہویں صدی کے آخری سالوں میں جب مارکو پولو یہاں پہنچا تو اس نے اس شہر کے متعلق لکھا "سمر قند بہت بڑا اور دلفریب شہر ہے۔ منگولوں کے آخری زمانوں میں اس شہر میں خوب صورت عمارتیں تعمیر ہونی شروع ہوئیں جن میں شاہ زندہ کے محلات بھی

شامل تھے، تیمور کے زمانے میں سمرقند اس کا صدر مقام بنا اور یہیں سے اس نے اپنی تمام مہموں کا آغاز کیا اور مہموں سے حاصل شدہ زر و جواہرات اور دولت وہ یہیں لے کر آتا اس دولت کی فراوانی نے سمرقند کو تاریخی عمارتوں کا شہر بنا دیا اس کی فصیل تعمیر ہوئی، قلعہ تعمیر ہوا۔ اس کے بازار کشادہ کیے جانے لگے اور پہلی بار ان عمارتوں میں مٹی کی بجائے سوختہ اینٹوں کا استعمال ہوا چنانچہ اس کے اکثر علاقوں کے نام اس وقت کی دنیائے اسلام کے اہم شہروں کے ناموں پر رکھے گئے تاکہ سمرقند کی اہمیت کا احساس ہو کہ یہ دارالحکومت ان تمام شہروں کا سردار ہے چنانچہ تیمور کا قول تھا "جس کو ہماری عظمت دیکھنی ہو اسے ہماری تعمیر شدہ عمارتوں اور سمرقند کو دیکھنا چاہیئے" اس کا یہ مقولہ اس کے اپنے محل پر کندہ تھا یہ محل سمرقند سے باہر تھا آج کل یہ علاقہ شہر سبز کے نام سے موسوم ہے۔

مارکس نے تیمور کے بارے میں لکھا تھا "اس نے نئی سلطنت کو ایک باقاعدہ ریاست کے اصول و ضوابط سے مزین کیا اور اس نے تاتاریوں کی تباہی و بربادی کے مقابلے میں تعمیر و ترقی کے دور کا آغاز کیا" یہ درست ہے کہ اس کی تعمیر و ترقی کے لئے اس نے بے پناہ مظالم کئے چنانچہ میں نے یہیں اسی شہر سمرقند میں گورکی نے تیمور کے بارے میں جو لکھا تھا وہ بھی پڑھا وہ لکھتا ہے "تیمور لنگ نے اپنی رہے کی ٹانگ سے شہروں اور ریاستوں کو اس طرح تباہ و برباد کیا جیسے ہاتھی چیونٹیوں کو پاؤں تلے روندر رہا ہو اور پھر اس نے ان تباہ شدہ انسانوں کی ہڈیوں سے مینار تعمیر کئے اس نے اپنی زندگی کو موت سے محفوظ کرنے کے لئے موت کو عام کر دیا

بہرحال یہ حقیقت کہ اس قتل عام اور دہشت ناک مظالم کے باوجود اس نے بے پناہ خوب صورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔

پندرہویں صدی کے ابتدائی سال تھے۔ تیمور چین پر لشکر کشی کی تیاریاں کر رہا تھا کہ ۸۰۷ ہجری میں موت نے اسے آ لیا اور وہ اس مہم کے دوران اوترار کے شہر میں چل بسا۔ اس کی موت کے بعد یہ علاقہ تیمور کے بڑے لڑکے الغ بیگ کے ہاتھ آیا۔ اور دوسرے بیٹے شاہ رخ نے اپنی سلطنت کا دارالحکومت ہرات کو بنایا۔

الغ بیگ نہ صرف ایک اچھا حاکم ثابت ہوا بلکہ وہ دنیائے علم ودانش میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتا تھا چنانچہ اس نے اپنے اردگرد کئی ایک عالموں کو اکٹھا کیا وہ ستاروں کے علم کا ماہر تھا چنانچہ اس نے ایک بہت بڑی رصدگاہ تعمیر کی جہاں وہ ستاروں پہ تحقیق کیا کرتا تھا یہ عمارت آج بھی سیاحوں کے لئے ایک بہت بڑی کشش ہے۔ بابر نے بھی یہاں حکومت کی اور اس شہر کے حسن کا ذکر اپنی تزک میں کیا ہے۔

سترھویں صدی میں یہ شہر ازبک ریاست کا حصہ بن گیا سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے نصف تک چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا وجود میں آنے سے ایک دوسرے کے خلاف لشکر کشی روزمرہ کا معمول بن گئیں اس دور میں خانہ بدوش قبائل نے تباہی مچادی۔

یہ شہر اپنی پوری تاریخ، تاریخی عمارتوں، مساجد اور مقبروں، باغوں اور پارکوں کے ساتھ جمہوریہ ازبکستان کا ایک اہم ترین شہر ہے لیکن اس شہر کے بارے میں جہاں عربوں تاتاریوں اور منگولوں کی یلغاریں ہوئیں وہاں ہمیں روسی مہم جوئی کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کے متعلق مواد حاصل کر لیا اس مواد نے مجھے اس شہر کی روح سمجھنے میں بہت آسانی پیدا کر دی۔ اٹھارہویں صدی کے چل چلاؤ کے زمانے میں یہ شہر مختلف نسلوں اور قوموں کا امتزاج تھا یہاں ازبک تھے، تاجک تھے، ایرانی تھے عربوں کی خاصی تعداد تھی اور تو اور ہندوستانی نسل کے لوگ بھی موجود تھے یہودی بھی خاصے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے سمرقند کے بارے میں روسی سفارت کار خانی کوف نے اپنے تاثر قلم بند کئے ہیں وہ لکھتا ہے "سمرقند کا شہر ایک مضبوط فصیل سے گھرا ہوا ہے جس میں جگہ جگہ مینار اور برجیاں بنی ہوئی ہیں۔ شہر کے اندر داخل ہونے کے لئے چھ بڑے بڑے دروازے ہیں۔ رات کو شہر کے اندر داخل یا باہر جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہوتی۔ شہر باغات سے بھرا پڑا ہے، شہر کے اندر نہروں اور درختوں کا جال بچھا ہوا ہے بازار کشادہ ہیں اور گلیاں بازاروں میں جانکلتی ہیں۔ سب سے اہم بازار بی بی خانم کی مسجد سے ملحقہ علاقے میں ہے۔ مغربی حصے میں قلعہ۔

واقعہ ہے اس کے دروازے ہیں۔ اس کے اندر فوجیوں کی بیرکیں اور ساتھ ہی قریب امیر کا محل ہے، اس شہر کی آبادی ۲۵ اور ۳۰ ہزار کے درمیان ہے"

اس شہر کو مئی ۱۸۶۸ء میں زار کی فوجوں نے فتح کیا اور اس طرح سے یہ علاقہ بھی روسی ترکستان کا ایک حصہ بن گیا اس کے بعد یہاں وہ تمام عمل دہرایا گیا جو برطانوی سامراج نے برصغیر میں شروع کیا تھا لیکن ایک بنیادی فرق تھا کہ روسی علاقے وسطی ایشیا سے ملتے تھے چنانچہ جب روسیوں نے یہاں ریلوں کا جال بچھایا تو اس سے روس کے ترقی یافتہ علاقوں کے ساتھ ان بچھڑے ہوئے وسطی ایشیائیوں کا تعلق قائم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی روسی انقلابی لٹریچر اور اخبار بھی یہاں پہنچنے شروع ہوئے اور ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہوا اور آج اسی طویل لڑائی ایک انتھک جدوجہد کے نتائج نئے اشتراکی سمرقند کی صورت میں میرے سامنے تھے۔

یہ ہے سمرقند جس کو میں اب گھوم پھر کر دیکھ رہا ہوں اور یہاں پر پرانے پسماندہ غریب سمرقند کی جگہ نیا، خوبصورت اور دلفریب سمرقند اپنی تمام تاریخی عظمتوں کے ساتھ میرے سامنے تھا، اب یہ صرف زرعی اشیاء کی فروخت کا ہی مرکز نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت اہم صنعتی شہر کا روپ اختیار کر گیا ہے چنانچہ اس وقت صرف اس شہر میں کوئی ۷۰ بڑے کارخانے ہیں۔ جنگ سے پہلے یہاں پر زیادہ تر کپڑا بنانے کی کارخانے تھے لیکن اب انجنیئرنگ، فولاد سازی، مشین سازی کے کارخانے ہیں اور ۱۹۱۳ء میں یہاں کی صنعتی پیداوار نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اب اس کی صنعتی پیداوار میں سو فیصد اضافہ ہو چکا ہے اب یہاں پر موٹروں، ٹریکٹروں کے پرزہ جات اتنے بڑے پیمانے پر تیار ہوتے ہیں کہ وہ سوویت یونین کی اکثر جمہوریتوں کو برآمد کئے جاتے ہیں۔ میں نے ایک نیا کارخانہ جو حال ہی میں مکمل ہوا ہے وہ دیکھا اس کارخانے میں پوری پوری عمارتوں اور فلیٹوں کے بلاک تیار ہوتے ہیں ان بلاکوں کو جوڑ کر بیسیوں منزلہ عمارتیں ہفتوں میں کھڑی کی جا سکتی ہیں اسی طرح یہاں پر ایئر کنڈیشنز تیار کرنے کا کارخانہ بھی کام کر رہا ہے جہاں ایئر کنڈیشنز بڑے پیمانے پر تیار ہو رہے ہیں۔

میں نے یہاں کا سب سے بڑا تھیٹر دیکھا اس تھیٹر کی تیاری کے منصوبے پر جب کام شروع ہوا تو خیال تھا کہ یہ تین سال اور دو ماہ میں تیار ہوگا لیکن سمرقند کے نوجوان کمیونسٹوں نے یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات سے رضا کارانہ کام کی اپیل کی چنانچہ یہ تھیٹر کا منصوبہ اڑھائی سال میں مکمل ہوگیا اس تھیٹر کی عمارت ازبک فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے جس کے در و دیوار ازبک فن نقاشی اور میورل سے آئے ہوئے ہیں اور عمارت بذات خود حسن کا ایک نمونہ ہے۔

اس طرح سے پرانی تاریخی عمارتوں کو ہی ان کو پرانا حسن واپس ہی نہیں لوٹایا جا رہا بلکہ قدم قدم پر حسن کے نئے شاہکار وجود میں آ رہے ہیں اور چاروں طرف مادی آشائشوں اور ان آسائشوں سے حاصل ہونے والی مسرتوں کو میں رقصاں دیکھتا ہوں تو ایک نئے اور تابناک مشرق کو جب ابھرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اپنے ملک اور اپنے ملک کے لوگوں کے مستقبل کی بھی امید بندھنے لگتی ہے آخر ہم بھی تو اسی مشرق کا حصہ ہیں۔

مجھے یہاں سمرقند کے دوست شام کو چوک زمردیں چلنے کے لئے کہہ رہے ہیں یہ چوک شہر کے وسط میں ہے اس وقت شام ہونے کو ہے آفتاب غروب ہو رہا ہے سمرقند کی سڑکوں پر طویل سائے پھیل رہے ہیں اور پورا شہر ان سایوں کی لپیٹ میں رہا ہے اور ہم اس سے شہر کے قلب میں واقع ریگستان چوک زمردیں کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے جب چوک زمردیں میں پہنچے تو پورا چوک اور اس کے گرد و نواح سرخ اور زرد روشنیوں سے جگمگا اٹھتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے ہزاروں آفتاب نمودار ہو گئے ہوں۔

"میں ریگستان ہوں ، سمرقند کا دل
مجھے مادر تاریخ سے حکم ملا ہے ...."

ازبیک ، روسی ، انگریزی ، فرانسیسی اور عربی میں طنبورے کی شاندار موسیقی کے ساتھ یہ الفاظ ادا کئے جاتے ہیں اور سمرقند کے ریگستان چوک میں جو عہد وسطیٰ کے مسلم طرز تعمیر کا شاہکار ہے ، روشنی اور آواز کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ مظاہرے میں حصہ لینے والے کردار پندرہویں ، سترھویں صدیوں کی وہ تاریخی یادگاریں ہیں جن پر ریگستان کا سلسلۂ عمارت مشتمل ہے۔ الغ بیگ مدرسہ شیر دار مدرسہ اور تلا قاری مسجد - روشنی اور آواز کے اس مظاہرے

کے دوران ازبک آباؤ اجداد کی زندگی، بیرونی حملوں اور پرامن تخلیق کے ایام کے متعلق بتایا جاتا ہے۔

ریگستان چوک کا سلسلہ عمارات سوویت یونین میں قدیم طرز تعمیر کی پہلی یادگار ہے جسے روشنی اور آواز کے ذریعے زندگی بخشی گئی ہے۔ اس پروجیکٹ کو ایک ڈیزائن ساز بیورو نے دو سال میں تیار کیا تھا۔ روشنی اور آواز کے مظاہرے کی ہدایت کاری کے فرائض تھیٹر آرٹ کے ماسکو انسٹی ٹیوٹ کے ایک گریجویٹ اولیگ اوزاکوف نے انجام دیئے ہیں اشعار بھی انہی کے لکھے ہوئے ہیں اور روشنیوں کی ترتیب بھی انہی کی مرہون منت ہے۔ موسیقی نوجوان نغمہ نگار میر صادق تاجیئف کی ہے۔ سمرقند کی تمام آبادی نے روشنی اور آواز کے مظاہرے کے سلسلے میں ریگستان چوک کو سجانے میں رضاکارانہ طور پر حصہ لیا ہے۔

"قدیم سمرقند کا دل" نامی اس پروگرام کو شروع کرنے سے قبل اولیگ اوزاکوف اور میر صادق تاجیئف نے مصر کا دورہ کر کے غزہ میں مصری اہرام کے پاس روشنی اور آواز کے مشہور مظاہرے کا جائزہ لیا تھا۔

سمرقند کے اس پروگرام کے سلسلے میں انجنیئرنگ سہولیات سوویت یونین کے بہت سے اداروں نے فراہم کی ہیں اور چیکوسلاواکیہ کے ماہرین نے بھی اس کام میں ہاتھ بٹایا ہے آوازوں کا ٹیپ ماسکو فلم اسٹوڈیو میں تیار کیا گیا تھا۔

سمرقند کی وضع کے روشنی اور آواز کے مظاہروں کا بخارا اور خیوا میں قدیم طرز تعمیر کی یادگاروں پر بھی انتظام کیا جائے گا۔

اس رنگ و نور، دلفریب اور دلنواز موسیقی کے ان مناظر نے بالکل مسحور کر دیا، یہاں اس چوک میں ہزارہا نوجوان لڑکے لڑکیاں باہوں میں باہیں ڈالے ان مناظر سے لطف اٹھا رہے تھے ہم یہاں تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ رہے لیکن بھوک نے ستانا شروع کیا چنانچہ ہم اسی چوک کے قریب ایک چائے خانے میں چلے گئے جب کھانا آیا تو بالکل اپنا ہاتھ کا کھانا، کباب، کلچہ اور شوربہ کھانے کو ملا، یہاں مرچ نہیں ہوتی وہ اب ساتھ مل جاتی ہے، سبز چائے بالکل پشاور کے چائے خانوں کے انداز میں ملتی ہے اس میں دودھ قطعاً استعمال نہیں ہوتا، چینی بھی استعمال

نہیں ہوتی۔ چنانچہ رات گیارہ بجے کے قریب یہاں سے اُٹھے۔

تھک کر چور ہو گیا ہوں، کباب اور پھلکے نے تھوڑی سی تھکان کم کر دی ہے کیونکہ خاصے دنوں کے بعد اپنے ہاں کی غذا میسر آئی ہے

صبح ہو گئی ہے رات کو میں جلدی کمرے میں آگیا تھا لیکن سو نہیں سکا رات بھر شوکت عثمانی کی انگریزی کتاب " انقلابی کا دورہ روس " پڑھتا رہا۔ شوکت عثمانی کا شمار ان شروع کے کمیونسٹوں میں ہوتا ہے جو ۱۹۱۹ء میں ہجرت کی تحریک میں ہندوستان سے افغانستان ہوتے سوویت یونین میں آئے تھے اور یہاں پر کمیونسٹ افکار سے متاثر ہوئے اور اس کے بعد تمام عمر جیل کے اندر اور باہر ان افکار کی تبلیغ یا ان افکار کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں مصروف عمل رہے۔

اس کتاب نے خاصا لطف دیا۔ اب صبح کے چار بجے ہیں اٹھ کر نہایا شیو بنائی اور یہ سطور مکمل کی ہیں اب پونے چھ بجے ہیں تھوڑی دیر میں تاشقند کے لئے روانہ ہونا ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۷۷ء

صبح کے سات بجے ہیں نہا دھو کر تیار بیٹھا ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹے میں ناشتہ کیلئے روانہ ہونا ہے پھر "پیاسی زمین" یا جسے انگریزی میں HUNG LAND کہتے ہیں دیکھنے جاؤں گا۔ ۱۹ اگست کا پورا دن ہنگاموں میں گزرا اور اس بھاگم بھاگ میں ایک لمحہ فرصت کا نہیں ملا، کل علی الصبح سمرقند سے تاشقند کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں تاشقند میں سمرقند کے وقت کے مطابق ساڑھے آٹھ بجے پہنچ گئے تھے لیکن تاشقند کا وقت ایک گھنٹہ آگے ہے چنانچہ یہاں پر اس وقت ساڑھے نو بجے تھے اور سورج میں خاصی تمازت تھی اور اب میں وسطی ایشیا کی سب سے اہم جمہوریہ ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں ہوں وہی تاشقند جس کا نام سمرقند و بخارا کی طرح ہمارے حافظوں میں محفوظ ہے اور ہماری تہذیبی روایات کا عظیم ورثہ ہے۔ یہ شہر جو یہاں کے اہم دریا سیر سے نکلنے والی ندیوں میں سے ایک ندی پر واقع ہے اور نخلستان چرچک میں واقع ہے پرانی تاریخوں میں اسے تاشکنت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا چنانچہ عہد مغول میں سکوں پر جو نام کندہ ہوا وہ تاشکنت ہی تھا۔ اس شہر نے بھی سمرقند کے دوسرے اہم مقامات کی طرح عروج و زوال کے کئی ادوار دیکھے ہیں۔

سولھویں صدی کے شروع میں پہلی بار تاشقند ازبکوں کے زیر تحویل آیا۔ لیکن زیادہ دیر ان کے زیر تسلط نہیں رہا اور ازبک خاندانی شیبانی خاں کی وفات کے تھوڑی دیر بعد یہ علاقہ ان کے ہاتھ سے جاتا رہا بعد کی چند صدیوں میں تاشقند کبھی ازبکوں

کے اور کبھی قازان خوانین کی ماتحتی میں آتا جاتا رہا۔ ۱۷۲۳ء میں قلماقوں نے بھی اس کو فتح کر لیا تھا لیکن اس پر قبضہ نہ کیا بلکہ قازانی الاصل شہزادہ بدستور کو باجگذار بنا کر علاقہ اسی کی تحویل میں رہنے دیا۔ بعض اوقات اس علاقے پر خوجوں کی عملداری بھی رہی یہ خوجے ایک مقامی ولی اللہ کی اولاد میں سے تھے، یہ حالات اس لئے دلچسپ ہیں کہ جب یہ علاقہ روسیوں کی تحویل میں آیا تو اس وقت تک یہاں ازبکوں کے علاوہ قازانی، قرغیزی اور دوسری کئی ایک قبائل آ کر آباد ہو چکے تھے بالآخر ۲۷ جولائی ۱۸۶۵ء میں روسیوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور یہاں اپنی چھاؤنی بنائی اور سیر دریا کے کل علاقے کا اس شہر کو نہ صرف پایہ تخت بنایا بلکہ اسے ترکستان کے گورنر جنرل کا صدر مقام کا درجہ بھی عطا ہوا اور گورنر جنرل نے جب بہ نفس نفیس اس شہر میں رہائش شروع کی اور اس کے ہمراہ سرکاری حکام بھی ٹھہرنے پر مجبور ہوئے تو اس شہر کو زبردست ترقی ملی اور قدیم تاشقند کے ساتھ ساتھ ایک نیا شہر ہمارے ہاں کی سول لائن کی آبادیوں طرح یہاں بھی آباد ہو گیا اس طرح یہ شہر اور اس کے اردگرد کا علاقہ روسی اثر اور تہذیب کا مرکز بن گیا چنانچہ انیسویں صدی کے آخری سالوں کی مردم شماری کے مطابق ۱۸۹۷ء میں یہاں کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ۱۵۵٫۶۷۳ نفوس پر مشتمل تھی۔

بہرحال اس پرانے تاشقند کی جھلکیاں جہاں میں اس وقت بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں بہر حال ہوٹل پہنچتے، سامان رکھتے ہوئے کوئی ساڑھے دس ہو گئے۔ اب سورج کی تمازت اپنے شباب کو پہنچ رہی تھی ایسے میں ۱۱ منزلہ ہوٹل کے کشادہ کمروں میں آدھ گھنٹے آرام بہت پر لطف رہا، میرا کمرہ گیارہویں منزل پر ہے چنانچہ میں نے آدھ گھنٹہ آرام کیا اس کے بعد تیار ہو کر نیچے آیا تو ناشتے کا وقت گزر چکا تھا بالآخر گائیڈ نے کیفے ٹیریا دہی کی دو بوتلیں اور بسکٹ لا کر دیئے، یخ دہی اس موسم میں ایک نعمت غیر مترقبہ تھا اس کے بعد ہم ہوٹل سے نکلے تو سب سے پہلے جمہوریہ ازبکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے اخبار کے دفتر میں گئے۔ یہاں ہر جمہوریہ کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا اپنا اخبار ہے جس کی

حیثیت وہی ہوتی ہے جو پورے سوویت یونین کی سطح پر پراودا، کی ہوتی ہے اور یہ اخبار سب سے اہم تصور ہوتا ہے، اس اخبار کے چیف ایڈیٹر سے ملاقات ہوئی یہ ازبک ہیں ان کا نام مقصود کریم ہے ان سے کافی دیر گپ ہوتی رہی اور وہ پاکستان سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے رہے اور کہنے لگے کہ یہاں پر پاکستان سے دوستی کے جذبات پائے جاتے ہیں اور یہ دوستی ہمارے تہذیبی ورثے اور اسلام کے حوالے سے بھی ہے۔

ان کے ہاں سے نکلے تو تاشقند کا وہ حصہ دیکھا جو ۱۹۶۶ء کے زلزلے کی وجہ سے بالکل تباہ ہو گیا تھا اب یہاں تباہ شدہ عمارتوں کی جگہ پر فلک بوس عمارتیں اور فلیٹ وجود میں آگئے ہیں اس زلزلے سے رونما ہونے والی تباہی اور پھر اس تباہی سے ابھرنے والے جذبہ تعمیر کی یاد میں ایک عجائب گھر تعمیر کیا گیا ہے یہ بالکل گول عمارت ہے اور اس گول عمارت کے اندر دیواروں کو تصویروں سے سجایا گیا یہ تصویریں تاشقند کی تباہی اور تعمیر کی مرحلہ وار منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ عجائب گھر کے باہر ایک بہت بڑا مجسمہ تراشا گیا ہے جس میں وسطی ایشیا کا مخصوص مرد، عورت اور بچہ دکھائے گئے ہیں یہ زندگی تخلیق اور جدوجہد کا مظہر ہیں یہ عجائب گھر کا پورا منصوبہ بہت دل ادیز اور خوب صورت ہے، چاروں طرف سبزہ اور فلک بوس درختوں کے سائے ہیں، اور ان کے درمیان نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان کے کنارے درختوں کے سائے پڑ رہے ہیں اور یہاں بنچیں بچھی ہوئی گرد و نواح میں بیس بیس منزلہ فلیٹوں کے بلاک ہیں۔ یہ بھی تباہی کے بعد تعمیر ہوئے اور اس تعمیر میں سوویت یونین کی مختلف جمہوریتوں کے کمیونسٹ نوجوانوں نے حصہ لیا اور اب فلیٹوں کے بلاک مختلف جمہوریتوں کے نام منسوب کئے گئے ہیں، کیونکہ یہ بلاک ان جمہوریتوں کی امداد سے تعمیر ہوئے ہیں اپنی جمہوریتوں نے سامان بھیجا اور رضا کار بھیجے تھے یہ بھائی چارے اور اخوت کی زندہ مثال ہے جو آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔

اس کے بعد ہوٹل آئے، کھانا کھایا اور پھر تین بجے پرانے تاشقند میں گئے، وہی ٹیڑھی میڑھی تنگ گلیاں اور تنگ بازار، پرانے زمانے کی یک اور دو منزلہ مکان ہماری طرح جگہ جگہ لوگ دکانوں پر جمع ہو کے گپ کر رہے تھے، چائے خانوں کے باہر بھی کرسیاں بچھی

ہوئی تھیں وہاں بھی بڑے بوڑھے چائے نوش کر رہے تھے ہم اپنی ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور بازاروں سے ہوتے ہوئے مسلم بورڈ کے دفتر پہنچے یہ دفتر تاشقند کی مشہور مسجد میں واقع ہے جب ہم پہنچے تو مسجد میں مرمت کا کام بڑے زوروں پر تھا اور چونکہ ہم اطلاع کے بغیر یہاں پہنچے تھے اس لئے کوئی انتہام نہیں تھا لیکن بورڈ کا جو آفس سیکرٹری تھا اس سے ملاقات ہوئی اور کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے میری اس سے خاصی تفصیلی بات چیت ہوئی اور میں نے سوویت یونین میں مسلمانوں کی زندگی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی یہ واقع ہے کہ سوویت یونین کے مسلمان ایک بہت وسیع علاقے میں رہتے ہیں اور درجنوں قومیتوں سے ان کا تعلق ہے۔ سوویت یونین میں مسلمانوں کی اکثریت سُنّی العقیدہ ہے جب کہ شیعہ مسلک اور اسمعیلی فرقہ کے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ سوویت یونین میں مسلمانوں نے مذہبی ادارے کافی تعداد میں ہیں، ان کو چار خود مختار مسلم بورڈز چلاتے ہیں۔ پہلا مسلم بورڈ برائے وسط ایشیا کزاخستان کا ہے جس کا صدر دفتر تاشقند میں واقع ہے جو کہ سوویت سوشلسٹ جمہوریۂ ازبکستان کا دارالخلافہ ہے۔ دوسرا مسلم بورڈ یورپین سوویت سوشلسٹ جمہوریہ اور سائبیریا کا ہے جو اُفا نامی شہر جو کہ سوویت سوشلسٹ جمہوریہ باشکیریا کا صدر مقام ہے، میں واقع ہے۔ تیسرا مسلم بورڈ شمالی قفقاز کے لئے مخاچکالا میں جو کہ جمہوریۂ داغستان کا صدر مقام ہے، میں واقع ہے اور چوتھا مسلم بورڈ برائے ماورائے قفقاز باکو شہر میں جو کہ جمہوریہ آذربائیجان کا صدر مقام ہے، میں واقع ہے ہر ایک مسلم بورڈ کا ایک چیئرمین ہوتا ہے جس کو ایک کانگریس منتخب کرتی ہے جو کہ مشہور علمائے دین پر مشتمل ہوتی ہے۔ تین بورڈ جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کہ سربراہ "مفتی" کہلاتے ہیں جب کہ چوتھے بورڈ جو کہ ماورائے قفقاز کا مسلم بورڈ ہے، کا سربراہ "شیخ الاسلام" کہلاتا ہے اور اس کا نائب مفتی ہوتا ہے اس بورڈ کا کام شیعہ اور سُنّی مسلک کے مسلمانوں کو اکٹھا کرتا ہوتا ہے۔ مسلم بورڈ کا دائرہ اختیار کافی وسیع ہے اور یہ علماء کی تربیت، اماموں، مؤذنوں کی اہلیت کو جانچنا اور مساجد میں ان کی تقرری کرنے کے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ مسلم بورڈ دینی مسائل پر فتوے جاری کرتے ہیں

اور ان فتووں کو مساجد میں اماموں کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچاتے ہیں۔ مسلم بورڈز کانگریسوں اور کانفرنسوں کا اہتمام کرتے ہیں جہاں علماء کو مدعو کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ دینی لٹریچر کی اشاعت کا اہتمام بھی یہی بورڈ کرتے ہیں اور دوسرے مسلم ممالک کے مسلمان بھائیوں سے روابط رکھتے ہیں۔

جو مسلمان حج پر جانے کے خواہشمند ہوتے ہیں اُن کے انتظامات بھی ان ہی بورڈوں کے دائرہ اختیار میں شامل ہے۔ مسلم بورڈوں کے اغراض و مقاصد کے باقاعدہ قواعد بنائے گئے ہیں جنھیں ملک بھر کی مساجد کے نمائندوں نے کانگرس میں منظور کیا ہے۔ مسلم بورڈ کی طرف سے شائع کردہ اسلامی کیلنڈر مساجد میں لگائے جاتے ہیں، ان کیلنڈروں سے سن ہجری کی تاریخ جاننے، مذہبی تہواروں کے دنوں کا پتا لگانے اور طلوعِ فجر اور مغرب کے اوقات جو کہ سوویت یونین کے شہروں کے مطابق بنائے جاتے ہیں، کو بھی جاننے کے بارے میں مدد ملتی ہے، یہ کیلنڈر عام مسلمانوں کو مساجد کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔

وسط ایشیا اور کزاخستان کے مسلم بورڈ کے زیر اہتمام ایک بہت بڑی لائبریری دینی کتابوں سے مزین ہے، اس میں تیس ہزار کے قریب کتابیں ہیں جن میں سینکڑوں ایسی ہیں جو کہ صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں یہ لائبریری دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور اس میں نت نئی کتابوں کا اضافہ ہو رہا ہے، یہ کتابیں عام لوگ تحفتاً بھیجتے ہیں، اس کے علاوہ کتابیں بیرونی ممالک سے خریدی بھی جاتی ہیں۔ اس لائبریری میں لیبیا، مصر، عراق، شام، لبنان، اردن، سعودی عرب، پاکستان اور مراکش کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ یہاں ہزارہا اخبارات اور رسائل درجنوں اسلامی ممالک سے آتے ہیں۔ یہ لائبریری عام لوگوں کے علاوہ علمائے دین اور اسلام پہ تحقیق کرنے والے طالب علموں کے لئے بنائی گئی ہے، اس لائبریری کو مفتی باباخان ابن عبدالماجد خان جو کہ مسلم بورڈ کے سربراہ تھے نے بنوایا تھا۔ اس مسلم بورڈ نے علماء کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک خاص گروپ تشکیل دیا ہے، یہ گروپ تاشقند کے بڑے مدرسہ جس کا نام امام بخاریؒ کے نام پر ہے اور میرِ عرب مدرسہ جو کہ بخارا میں واقع ہے کی تعلیم اور کام کی نگرانی کرتا ہے۔ یہاں کی آبادی کے تمام حصوں سے طالب علم آتے ہیں، ان مدرسوں میں داخلہ امتحان

کے ذریعہ ہوتا ہے اور یہاں قرآن کریم پڑھنے، قرآن پاک کی تفسیر، شریعتِ محمدیؐ احادیث نبویؐ اور اسلامی تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ عربی زبان پر خاص زور دیا جاتا ہے اور قرآن پاک حفظ کرنا یہاں کی دیرینہ روایت ہے جس کی تمام مذہبی ادارے حوصلہ افزائی کرتے ہیں مفتی ضیاء الدین خان ابن ایشا بابا خان جو کہ مسلم بورڈ برائے وسط ایشیا اور کزاختان کے سربراہ ہیں ۱۳ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر چکے تھے، جو طالب علم قرآن پاک حفظ کر چکے ہوتے ہیں ان کو "قاری" کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ یہاں حُسنِ قرأت کے مقابلے بھی ہوتے ہیں اور قاری حضرات رمضان المبارک میں نماز تراویح کے دوران امامت فرماتے ہیں۔

ان مدرسوں میں دینی تعلیم کے علاوہ جغرافیہ، سماجی سائنس اور اُزبک زبان کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ شمالی قفقاز کے مسلم بورڈ کے سربراہ مفتی محمود گیگئی نے بخارا کے مدرسہ سے تعلیم حاصل کی ہے اور ماسکو شہر کی مسجد کے امام صاحب ریاضت دین بسرو بھی یہاں کے فارغ التحصیل ہیں۔

مفتی ضیاء الدین خان ابن ایشاں بابا خان اور ان کے دو نائب شیخ عبدالغنی اور ڈاکٹر یوسف خان شکرو امام بخاریؒ مسلم مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں جو طلبا خاص اہلیت اور ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کو عرب ممالک کی مشہور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی بھیجا جاتا ہے، ان میں جامعہ الازہر قاہرہ اور عمان اور شام کی اسلامی یونیورسٹیاں قابلِ ذکر ہیں۔

سوویت مسلمان جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ان یونیورسٹیوں سے واپس اپنے وطن لوٹتے ہیں تو ان کا تقرر مسلم بورڈوں کے اہم شعبہ جات میں کیا جاتا ہے۔ شیخ عبدالغنی، عبداللہ اور ڈاکٹر یوسف خان شکرو جامعہ الازہر قاہرہ میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور کازان کی مسجد کے امام تلخت تعجیفو بھی اسی یونیورسٹی سے گریجویشن کر کے آئے ہیں، جبکہ اعتراب یونسوف جو مسجد طلا شیخ کے امام ہیں، الغراوین یونیورسٹی مراکش کے گریجویٹ ہیں جبکہ عطا قل علیا نوکوف البیدہ یونیورسٹی لیبیا سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم بورڈ برائے وسط ایشیا کزاختان کے انٹرنیشنل ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں۔

مسلم بورڈز کے انتظامی ادارے مالی امور کے معاملات اور بورڈ کے بجٹ کی نگرانی کرتے ہیں جہاں سے اسلامی تعلیمی اداروں کو رقوم مہیا کی جاتی ہیں۔ ضعیف العمر اور سبکدوش مذہبی علماء کو پینشن دینے کا انتظام بھی ادارے کرتے ہیں۔ اسلامی تاریخ سے وابستہ اہم عمارات کی دیکھ بھال بھی انہی کے ذمے ہے، ان عمارات میں مساجد اور مدرسے جو کہ بخارا اور سمرقند، خیوا، تاشقند، باکو اور دوسرے بڑے شہروں میں صدیوں پہلے بنائے گئے تھے اور جو فن تعمیر کے نادر نمونوں میں سے ہیں کو سوویت یونین اور وہاں کے عوام اپنی اصل حالت میں محفوظ کرنے اور مرمت کرنے کی طرف پوری تندہی سے توجہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد ہمارا پروگرام تاشقند یونیورسٹی جانے کا تھا چنانچہ جب ہم تاشقند یونیورسٹی کی چھ منزلہ عمارت میں پہنچے تو سہ پہر ہو چکی تھی اور سورج کی تمازت میں کمی آ رہی تھی اور یونیورسٹی کا سبزہ زار اور آسمان کو چھوتے ہوئے درختوں کے سایے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے، اس وقت یونیورسٹی میں کوئی ہنگامہ نہ تھا کہ یہ گرمیوں کی چھٹیوں کا زمانہ تھا، فقط تحقیق کرنے والے اساتذہ اور طالب علم یونیورسٹی آتے تھے لیکن اس وقت وہ بھی جا چکے تھے اس لئے میں یونیورسٹی کے مختلف شعبے تو نہ دیکھ سکا البتہ تاشقند یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور ہندی ضرور دیکھا۔ جب ہم چوتھی منزل پر پہنچے اور کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے روسی میں آواز آئی لیکن جب دروازہ کھلا اور انہوں نے مجھے دیکھا تو فوراً مسکرا کر کہنے لگے۔

آیئے آیئے، تشریف لایئے، اس وقت صرف تین اساتذہ یہاں موجود تھے لیکن تینوں باغ و بہار آدمی تھے، ان سے مل کر بے پناہ خوشی ہوئی اولاً یہ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ ازبک یا تاجک ہیں، کچھ دیر تو میں ان تینوں کو ہندوستانی سمجھتا رہا کیونکہ ان کے چہرے مہرے نین نقش تو بالکل ہماری طرح کے تھے اور ان کی زبان، ان کا لب و لہجہ کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ یہ اپنی طرف کے نہیں ہیں بالآخر جب ذرا تفصیلی تعارف ہوا تو مجھے بے پناہ حیرانی ہوئی کہ کس طرح اردو پر اتنا عبور حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ ان کی ش ق ذ بے پناہ حد تک درست تھی۔ اور یہ تینوں بہت فصیح اردو

بول رہے تھے اس کی بنیادی وجہ تو ازبک اور تاجکی پس منظر ہے اور چونکہ یہ فارسی عربی آشنا ہے اس واسطے انکے لئے اردو لب و لہجہ کو درست طور پر اپنانا کوئی چنداں مشکل کام نہیں ہے چنانچہ ان میں سے ایک مرزا طاش اصرار کر کے ہمیں اپنے گھر لے گیا یہ یونیورسٹی کا عطا کردہ فلیٹ ہے، پانچویں منزل پر ہے کافی پرانی عمارت ہے لیکن گھر میں تمام سہولتیں موجود تھیں، اس کو ۱۵۶ روبل تنخواہ ملتی ہے۔ یہ ابھی حال ہی میں ملازم ہوا ہے جیسے جیسے اپنی استعداد اور قابلیت بڑھاتے جائیں گے ویسے ہی ان کی تنخواہوں میں اضافہ ہوتا جائے گا یہاں پر سالانہ ترقیوں کا رواج نہیں ہے۔ بہر حال اساتذہ کی تنخواہ عام طور پر تین سو ساڑھے تین سو روبل تک پہنچ جاتی ہیں لیکن چونکہ روزگار کے مواقع بے پناہ ہیں اس لئے جب کسی کا جی چاہتا ہے یا ایک ملازمت سے اکتا جاتا ہے تو وہ کسی دوسری جگہ بڑی آسانی سے جا سکتا ہے اس لئے غالباً MONOTONY کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا مرزا طاش کی بیگم سے ملاقات بھی ہوئی بچی بھی دیکھی، بچی کا نام نگار ہے لیکن چونکہ یہاں پر نام کو مونث میں تبدیل کرنے کے لئے ہ کا لگانا ضروری سمجھا جاتا ہے اس لئے اس کو نگارہ پکارا جاتا ہے۔ خاصے اہتمام سے چائے، پھل، بسکٹ وغیرہ کھلائے اس کے مشروبات کا دور چلا، وہاں ایک گھنٹہ بیٹھنے اور گپ کرنے کے بعد ہم ریڈیو اسٹیشن چلے گئے جہاں میں نے اپنے تاثرات ریکارڈ کروائے اور اس کے ۳۵ روبل معاوضہ اسی وقت مل گیا۔ وہاں سے نکلے تو سورج غروب ہو رہا تھا اور شام کو اندھیرا چھا رہا تھا، ہم ہوٹل پہنچے وہاں کتابیں وغیرہ رکھیں اور پیدل APN کے دفتر گئے یہ خاصے فاصلے پر تھا راستے میں کھانے کی چیزیں خریدیں خیال تھا کہ دفتر میں بیٹھ کر گپ کریں گے لیکن دفتر میں بلا کی گرمی تھی چنانچہ وہاں سے ٹیلی فون ماسکو کیا اور وہاں سے تاشقند ہوٹل کی اوپر کی کھلی چھت پر چلے گئے وہاں رات کے گیارہ بجے تک محفل جمی رہی شروع میں تو تھکان کی وجہ سے میرا موڈ خاصا خراب رہا لیکن بعد میں بالکل ٹھیک ہو گیا اور رات ٹھیک سے نیند آ گئی،

۲۱۔۔۔ اگست کی تاریخ اور اتوار کا دن ہے۔ صبح کے پونے آٹھ بجے ہیں میں خوب جی بھر کے سویا اور کوئی سات بجے اٹھا، دراصل کل کا سارا دن تاشقند سے ڈیڑھ دو سو میل دیہا

علاقوں کے منظر اور اجتماعی اور مملکت کے کھیت دیکھنے گئے اُن کی زندگی کی جھلکیاں دیکھی یہ
کھیت جہاں ہم نے پورا دن گزارا۔ سیم زدہ زمین تھی جو صحرا میں تبدیل ہو چکی تھی اور جس کو صدیوں
سے بھوکے صحرا کے نام سے پکارا جاتا تھا اس کو پھر سے زیر کاشت لانے کے لیئے جو جتن کیئے گئے
ہیں اور جو کامیابیاں ہوئیں اس سے سوویت روس والے خوش اور مسرور ہیں اس خوشی اور
مسرت میں شریک کرنے کے لئے سیاحوں کو یہاں عموماً لاتے ہیں ویسے یہ کامیابی بھی واقعی قابل
فخر ہے ہم صبح کو پونے آٹھ بجے نیچے آئے تو ابھی نہ کوئی ریسٹورنٹ کھلا تھا نہ کیفے ٹیریا خدا خدا
کرکے کیفے ٹیریا کھلا تو وہاں سے ایک ایک بوتل دہی کی لی اور ساتھ بند کھایا اور بعد میں کافی
پی کر روانہ ہو گئے، شروع میں ابر تھا لیکن بعد میں خاصی زور کی بارش شروع ہو گئی اور تین
چار گھنٹے مسلسل بارش ہوتی رہی، ہمیں پورا راستہ بارش میں ہی جانا پڑا۔ راستے میں سردریا
دیکھا، پھر اسی دریا کے نام پر ایک پورا سردریا ضلع ہے جس کا ضلعی صدر مقام گلستان ہے۔
اور بالآخر فرینگیر پہنچے۔ یہی بھوکے صحرا کا صدر مقام ہے اس کے نام کے معنی بھی نئی زمین
ہے۔ سب سے پہلے اس پورے پراجیکٹ کو سمجھانے کے لئے اس پراجیکٹ کے متعلق عجائب
گھر میں لے گئے جہاں تصاویر اور ماڈلوں اور خاکوں کے ذریعے اس پورے منصوبے کی تاریخ
بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن عجائب گھر کمیٹی روم میں ہم کو عجائب گھر کے انچارج
نے ۴۵ منٹ لیکچر دیا جس میں اس نے صحرا کی تاریخ اور اس کو قابل کاشت بنانے کی جدوجہد
کی تاریخ پر روشنی ڈالی، یہ جدوجہد زاروں ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے شروع ہو گئی تھی لیکن بہرحال
زاروں کے زمانے میں یہ جدوجہد بہت تیز کردی گئی اور جب انقلاب ہوا تو لینن نے
باقاعدہ اس صحرا کو قابل کاشت لانے کے لئے حکمنامہ جاری کیا۔ یہ حکمنامہ
۱۷ مئی ۱۹۱۸ء کو جاری کیا گیا۔ اور اس کام کے لئے ابتدا میں ۵ کروڑ روبل وقف کیئے گئے۔ اس
تمام باتوں سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ اس صحرا کو زیر کاشت لانا کتنا اہم تھا۔ بہرحال اب
ان کو نمایاں کامیابی ہوئی اور اب تک پچھلے بیس برس میں ۳ لاکھ ہیکٹر اراضی زیر کاشت لائی
جا چکی ہے جن کو ۵۰ بڑے بڑے مملکتی کھیتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اتنی ہی بستیاں یہاں آباد
کی گئی ہیں چنانچہ ہم نے ان بستیوں کو بھی دیکھا۔ ان بستیوں میں ان کھیتوں پر کام کرنے والے

کسان رہتے ہیں۔ یہ جھونپڑی نما مکان تھا مگر گو یہ مکان کچھ پکا کچھ کچا تھا لیکن صاف ستھرے دو تین کمروں پر مشتمل تھا لیکن ہر گھر کے اوپر ٹیلی ویژن کا انٹینا موجود تھا، ویسے جلد ہی نئے فلیٹ ان کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ وسیع و عریض کھیتوں کی بستیاں زیادہ بہتر ہیں۔ پھر ان کسانوں کے لئے آرام کرنے کے لئے ایک بہت بڑی اراضی کے لئے ٹکڑے پر ایک منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے جو ہمیں دکھایا گیا یہاں ایک سو بیس کمرے بمعہ کچن اور غسل خانے بنائے گئے یہاں پر ایک مہینہ یہ کسان آرام کرنے کے لئے رہ سکیں گے یہاں حمام ہیں، کلب گھر ہے، ناچ گھر ہے، سینما ہے اور ہسپتال ہے۔ غرضیکہ آہستہ آہستہ کسان کو بے پناہ آرام اور سہولتیں حاصل ہوتی جا رہی ہیں اور اس کا درجہ بھی شہر کے صنعتی مزدور کے برابر ہو گیا ہے آمدنی کے لحاظ سے تو یہ صنعتی مزدور سے بھی بہتر ہیں۔

یہاں پر میں نے COLLECTVE اور STATE FARM کا فرق بھی سمجھا STATE FARM پر کام کرنے والے کسانوں کا درجہ بالکل صنعتی مزدور کا ہے اور اس کو لگی بندھی تنخواہ ملتی ہے، لیکن اجتماعی کھیتوں میں بھی اراضی تو مملکت کی ہی ہوتی ہے لیکن وہ کسانوں کو مل جل کر کھیتی باڑی کے لئے دی گئی ہے یہاں پر کسانوں کو نئے مکانوں کے آگے اراضی کے ٹکڑوں پر سبزیاں یا پھل وغیرہ کاشت کرنے کی اجازت ہے اور اس کاشت کو وہ بازار میں رکھ کر فروخت کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک اجتماعی کھیت کی فصل کا تعلق ہے وہ پوری کی پوری STATE FARM کی طرح حکومت کے ہاتھ فروخت کر دی جاتی ہے اور حکومت جو قیمت دیتی ہے وہ کام کے مطابق کسانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، کچھ رقم اجتماعی کھیتوں کی ترقی، مشینری کے لئے رکھی جاتی ہے۔

بہر حال یہاں پر بجھے بجھے، مایوس چہرے مفقود ہیں، ہر نوجوان، عورت، مرد بوڑھا کسی نہ کسی کام میں جتے ہوئے دکھائی دیئے گپ کرنا، قہوہ پینا یہ بھی کام ہے جس کو یہاں پر بہت ہی سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کے چائے خانے جتنے خوب صورت اور جاذب نظر دیکھے ہیں وہ کہیں نہیں دیکھے، شہروں کے چائے خانوں پر ہی نہیں دیہات کے چائے خانوں پر بھی دل ریجھنے لگتا ہے ان کے بڑے بڑے پیڑے نما پلنگ ان پر رنگا رنگ کے بچھے ہوئے گدے

اور اس پر چوکری مار کر بیٹھے ہوئے تاجک اور ازبک اور دوسری قومیتوں کے لوگ چائے پی رہے ہیں، بیئر پی رہے ہیں، کرسیاں بھی بچھی ہوئی ہیں انگور کی بیلیں چاروں طرف اوپر چڑھی ہوئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی ہیں اور ان پر قہوہ خانے ہیں۔

دوپہر کا کھانا اس ٹیم کے انچارج ابراہیم نے اسی ریسٹ ہاؤس کے کھانے والے کمرے میں کھلایا، سب سے پہلے پھل آئے یہاں کے بگوگوشے، آڑو اور انگور غرضیکہ یہاں پھل دیکھ کر نیت بھر جاتی ہے، پھر شوربہ آیا، پھر جام نوش کئے گئے اس طرح ہم تین بجے وہاں سے چلے راستے میں کہیں سے گرما خریدا کہیں سے مچھلی خریدی اور چھ بجے تاشقند پہنچے، یہاں آکر A P N کے دفتر سے TARSK کو ٹیلی فون کی کوشش کی تاکہ عائشہ کی خیر خیریت معلوم ہو سکے لیکن اس کے گھر سے کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔

عائشہ کے متعلق اکثر فکر رہتا ہے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ سرمد ہے، اشفاق ہے۔ ناریکی جب یہ دیکھ بھال کر لیں گے اور پیسے بھی ہیں۔ بہر حال وقت کٹ ہی جائے گا۔ آہستہ آہستہ مجھ میں تبدیلی آرہی ہے کام کرنے کی عادت جو بھول گیا تھا وہ اب پھر سے عود کر رہی ہے۔ اب غنودگی بھی کم ہوتی ہے اور آگے جو گھومنے پھرنے سے گریزاں ہوتا تھا وہ بھی کم ہے دراصل اس دورے کے اہتمام کا مقصد بھی یہی تھا کہ زندگی سے بیزاری جو مسلط ہوتی جا رہی ہے اور یہی حال عائشہ کا ہے معلوم نہیں اس میں کوئی تبدیلی آئی ہو گی۔

اس وقت پونے چھ بجے ہیں اور ۲۱ راگست ہی ہے اور اتوار کا ہی دن ہے اس تاشقند کے ازبکستان ہوٹل میں آخری لمحے ہیں اور ان لمحوں میں یہ جاتی دفعہ کی سطور لکھ رہا ہوں، آج کا دن بھی خاصا مصروف اور کارآمد گزرا۔ صبح نو بجے ناشتے کے لئے گئے کیونکہ ۱۰ بجے صبح کا وقت تاشقند کو یونیورسٹی کے اردو کے استاد مرزا طاش کو وقت دیا ہوا تھا، خیال تھا کہ اس سے اردو کی نشوونما کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون کے لئے نوٹس حاصل کروں گا اور کسی فرصت کے اوقات میں لکھ کے یہیں سے ماہِ نو کے لئے کشور ناہید کو بھیج دوں گا۔ چنانچہ مرزا طاش ٹھیک دس بجے آگیا اس کو ساتھ لے کر میں ایک کمرے میں آگیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اس سے تفصیلی گفتگو کی۔

تاشقند میں اُردو

سب سے پہلے تو طاش مرزا سے ان کے نام سے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ ان کا پورا نام طاش مرزا خان مرزا ئیف ہے طاش کے معنی پتھر کے ہوتے ہیں ان کے ہمراہ دو اور استاد اردو پڑھاتے ہیں۔ رحمٰن بردی محمد جائف اور آزاد شاہ عاطف۔

اُردو کے شعبے کے قیام کا فیصلہ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے تو یہاں برصغیر کے علاقہ کے بارے میں شعبے کے قیام کا فیصلہ ہوا اور اس شعبے میں سب سے پہلے زبان اردو کا اجرا ہوا اس شعبے کے بانی دو روسی اساتذہ تھے

SEREBRYAKOV IGOV اور MASKALEV VLADIMIR

ان دونوں نے ماسکو میں اردو پڑھی تھی اور اس وقت یہ تاشقند میں تھے چنانچہ یہی اردو کے پہلے اساتذہ ٹھہرے اور اردو زبان سیکھنے کے لئے سب سے پہلا طالب علم جو آگے آیا وہ موجودہ استاد رحمٰن بردی ہی تھا بردی کا مطلب دیا ہوا ہے۔ یعنی رحمٰن کا عطا کردہ۔ ہندوستانی زبانوں کے شعبوں میں اس وقت کل تیرہ استاد ہیں یہاں پر اُردو، ہندی، بنگلہ، پنجابی سب زبانیں پڑھائی جا رہی ہیں چونکہ ان زبانوں کے لئے پاکستان اور ہندوستان سے کوئی نصاب موصول نہیں ہوتے ہیں اس لئے یہاں پر ہی ان اساتذہ نے ان زبانوں کی تعلیم کے لئے نصاب مرتب کئے ہیں چنانچہ ان سالوں میں روسی اور اردو کی ایک بڑی لغت مرتب کی گئی ہے اس لغت کا دیباچہ فیض احمد فیض نے رقم کیا ہے۔

یہاں زبان کی تعلیم کے سلسلے میں گرامر کے ساتھ ساتھ برصغیر میں ادب کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے اور اردو اور ہندی ادب پر خاصا زور دیا جاتا ہے اگر اردو کا طالب علم ہے تو اسے تعلیم کے تیسرے سال کے بعد دوسری زبان کے طور پر ہندی پڑھائی جاتی ہے اسی طرح ہندی کے طالب علم کو اردو پڑھائی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے

کہ یہاں کا فارغ التحصیل طالب علم اردو اور ہندی دونوں میں خاصی مہارت رکھتا ہے۔ مزید براں اُردو والوں کے لئے عربی اور فارسی لازمی ہوتی ہے اور ہندی والوں کے لئے سنسکرت جاننا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں ساتھ ساتھ تاریخ، تہذیب و ثقافت صنعت کی تاریخ غرضیکہ برصغیر کی پوری معاشرتی اور سماجی زندگی سے واقفیت کرائی جاتی ہے۔

یہ طلبا تحقیقی کام بھی کرتے ہیں۔ طالب علم کو دوسرے سال ایک پرچہ تیار کرنا ہوتا ہے، مثلاً پاکستان وہندوستان میں اردو یا ہندی میں شائع ہونے والی کسی اہم کتاب کا تفصیلی جائزہ۔

تیسرے سال میں جو زبان طالب علم پڑھ رہا ہوتا ہے اس زبان کی گرامر کی بنیاد پر تحقیق کرنا ہوتی ہے مثلاً فلاں ضرب المثل کا منبع کیا ہے، ماخذ کیا ہے ان اصطلاحات کی وجہ تسمیہ کیا ہیں، یہ ایک طرح کا تھیسس THESIS ہوتا ہے جس کو اساتذہ کے سامنے DEFEND کرنا ہوتا ہے۔

چوتھے سال طالب علم ادب پر مقالہ لکھتا ہے۔ پڑھائی کل پانچ سال کی ہوتی ہے اور پانچویں سال تفصیلی تحقیقی مقالہ لکھنا ہوتا ہے جو کسی استاد کی رہنمائی میں ترتیب دیا جاتا ہے اور اسی میں کامیابی کے بعد ڈگری عطا ہوتی ہے۔ اس ڈگری کے بعد طالب علم مزید تحقیق کا کام بھی جاری رکھ سکتا ہے اور اس مزید تحقیق پر اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملتی ہے۔

پڑھائی کے لئے روسی اور ازبک دونوں زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جاتا ہے داخلے کے وقت جو امتحان لیا جاتا ہے وہ دونوں زبانوں میں ہوتا ہے اگر طالب علم فقط روسی جانتا ہے تو اسے ایک سال تک پہلے ازبک سیکھنا ہوتی ہے اگر صرف ازبک جانتا ہے تو اسے ایک سال روسی پڑھائی جاتی ہے۔

اس وقت یہاں تاشقند یونیورسٹی پر جو تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں ان میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض پر کام ہو چکا ہے اس کے علاوہ

مسلم لیگ پر مقالہ لکھا گیا ہے اسی طرح پاکستان کے نظام تعلیم پر بھی مقالہ لکھا گیا ہے علامہ اقبال پر تو کوئی ایک درجن مقالے ترتیب دیئے جا چکے ہیں۔

تاشقند میں ایک اور تجربہ بہت زوروں سے ہو رہا ہے۔ تقریباً ایک ربع صدی پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ تاشقند کو مشرقی زبانوں کی درس گاہ کا ایک اعلیٰ مرکز بننا چاہیئے چنانچہ اب یہاں تین ایسے مدرسے ہیں جہاں پرائمری سے ہی اردو پڑھائی جاتی ہے، پانچ پرائمری سکول ہیں جہاں ابتدا سے ہی عربی پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح فارسی کے لئے ہندی کے لئے بھی اسکول وقف ہیں۔ ان پرائمری مدارس کے لئے اساتذہ اسی تاشقند یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبا کو لیا جاتا ہے۔

طاش مرزا آج کل ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیق کر رہے ہیں وہ زبانوں پر مختلف اثرات دکھانا چاہتے ہیں اور انہی اصولوں کی روشنی میں وہ پچھلے ۲۵ برسوں میں پاکستان کے اندر اردو میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ان کا خاص موضوع ہے۔

اسی طرح سے رحمٰن بردی نے اردو، ہندی پڑھنے والے بچوں کے لئے دوسرے اساتذہ کی مدد سے نصاب تیار کیا ہے یہی نہیں غالب کی غزلوں کا ترجمہ کیا۔ پریم چند کے گئودان کا ازبک میں ترجمہ کیا ہے اسی طرح راجندر سنگھ بیدی کی ایک چادر میلی سی کا ترجمہ کیا ہے۔

آزاد شاہ عاطف نے دکنی زبان پر کام کیا ہے اور وہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

اسی طرح بنی محمد وف نے امراؤ جان ادا کا ترجمہ کیا ہے، اسی حوالے سے پاکستانی فلم امراؤ جان ادا کو پورے ازبکستان میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

اس وقت دوپہر کے بارہ بجے ہیں چنانچہ اس سے گفتگو کے دوران ایک اور فلسفے کے استاد اسد اللہ کا ذکر آ گیا، وہ اقبال پر کام کے سلسلے میں لاہور میں رہ چکے ہیں اور میں ان سے متعارف تھا چنانچہ طاش مرزا نے ان کو ٹیلی فون کیا اور کسی ہوٹل میں ملاقات کا وقت طے ہوا۔ چنانچہ میں طاش مرزا، میرا گائیڈ اور اس کا

ایک دوست ایک خالص ازبک ہوٹل میں گئے اس ہوٹل کا نام ہی نیلہ گنبد ہے۔ بے پناہ خوب صورت، اس کی چھت گنبد نما ہے اور یہ گنبد نیلی چینی اور پتھر کی ٹکڑیوں سے مزین کیا گیا ہے اور اس پر جب سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو یہ جگ مگ جگ مگ کرتی ہیں۔ اندر چھتیں بھی منقش ہیں، یہ یہاں کے پرانے ارٹ ہیں جن کی آج پوری طرح دیکھ بھال کی جا رہی ہے اور ان کو محفوظ کیا جا رہا ہے اور ان کی با قاعدہ سرپرستی کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسداللہ یہیں آ گئے ان سے خوب پیار و محبت کی باتیں ہوتی رہیں وہ لاہور کے دوستوں کی خیر خیریت معلوم کرتے رہے وہ اصرار کرنے لگے کہ میں آج شام ان کے ہاں افطاری کی دعوت میں شریک ہوں لیکن اگر میری روانگی طے نہ ہوتی تو میں ضرور رکتا اور دیکھتا کہ یہاں افطاری کی دعوتیں کیسے ہوتی ہیں لیکن یہی واقعہ کافی ہے کہ یہاں افطاری کا اہتمام ہوتا ہے کیا یہ اہم بات نہیں ہے کہ تہذیبی طور پر اسلامی روایات کیسے محفوظ ہیں اور سوشلسٹ معاشرے میں ان کا کیا رنگ روپ ہے۔ اس ہوٹل سے اٹھ کے ساتھ ہی چائے خانے میں گئے وہاں پر پلنگ نما پیڑوں پر ازبک چوکری مار کر بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے اور ہیں ایک کونے میں شطرنج کی بازی لگی ہوئی تھی اور لوگ اپنی چالیں بتا رہے تھے میں بھی ان میں شریک ہو گیا اور یہ لوگ، یہ اجنبی لوگ مجھے مل کر بے پناہ مسرور ہوئے۔

اس محفل میں ازبک شاعر بھی مدعو تھے چنانچہ تاشقند کا یہ آخری دن خاصا ہنگامہ پرور ثابت ہوا اور یہاں سے جانے پر خاصی جذباتی کیفیت رونما ہوئی اور اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے طاش مرزا اور اسداللہ ازبک شاعری شروع کی چنانچہ موسیقار نظمیں سناتے رہے۔

مثلاً مقصود شیخ زادہ کی نظم جو تاشقند سے متعلق تھی وہ سنائی اور اس کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ کیا جاتا رہا۔ شیخ مقصود زادہ ازبکی زبان کے بہت ہی مقبول شاعر ہیں اور ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ان کی نظم کا ترجمہ کچھ یوں ہے مقصود شیخ زادہ کی تاشقند پر یہ نظم ازبکی ادبیات میں بہت ہی اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

ہماری زندگی فانی ہے لیکن شہر باقی ہے
بہا کرتا ہے پانی، اور دریا جاودانی ہے
یہاں چھوڑی ہے ہر انساں نے اک یادگار اپنی
کسی تعمیرِ نو میں اُس نے صنّاعی دکھائی ہے
کوئی اچھا فسانہ گڑھ لیا یا شعر لکھے ہیں
کوئی فرزند پالا، پیڑ سینچا، پل بنایا ہے
دوا ایجاد کی کوئی کہ مکتب میں پڑھایا ہے
غرض کوئی نہ کوئی کارِ نیک اس نے کیا ہوگا
نگہ داری ہی کی ہو اس نے شاید ایک مکتب میں
ستائش کی تھی اک دن شہر کی اپنے، بہت تم سے
تامّل کرکے کچھ تم نے کہا تھا "کیا یہ سب سچ ہے؟"
مگر دل میں یہ سوچا، "دیکھ کر خود ہی بتاؤں گا"
جو دیکھا تم نے میرا شہر تو خود ہو گئے قائل
کہا تم نے "مرا گھر خوش نما ہے" پر یہ کچھ کم تھا

زباں پر میری جب بھی تاشقند کا نام آتا ہے
تو تابستان کا سورج مرے دل میں سماتا ہے
یہ سورج ہے جو انسانوں کی عمروں کو بڑھاتا ہے
ہمارے شہر میں جب بھی دعا دیتے ہیں جینے کی
تو کہتے ہیں کہ تم سورج بنو اور تا ابد چمکو
مگر اے دوست! کیا گرمی کے موسم میں ہمارے شہر
کی تم نے زیارت کی ہے؟ دیکھا ہے اسے دم بھر؟
اگر دیکھا نہیں تو موسم گرما نہیں دیکھا

مرا یہ شہر جو آباد ہے چرچق کے ساحل پر
یہاں سورج بہت تڑکے کمر کس کر نکلتا ہے
شروع کرتا ہے اپنا کام وہ ہم سے بھی کچھ پہلے
مشقّت کر کے دن بھر، شام کو وہ
پھینک دیتا ہے قبائے زر سمندر میں
یہ خواہش ہے کہ اس کی رحمتوں کے گیت گاؤں میں
قصائد لکھ کے اس کے روبرو ہر دن سناؤں میں
مرے اس شہر میں جو شخص بھی اک بار آتا ہے
وہ اس کی دلبری کا نقشِ رنگیں لے کے جاتا ہے
یہ ایسا شہر ہے جو دل کی دستاویز پر اکثر
عجب اک آفتابی مُہرِ الفت ثبت کرتا ہے
کہا کرتے ہیں جو طائر پیے اس شہر کا پانی
وہ مکّے اور مدینے سے بھی اک دن لوٹ سکتا ہے
کھلا ہے اس کا چہرہ، اس کی باتیں اس کی آنکھیں بھی
مقدس خاک پر اس کی بچھا رہتا ہے سیم و زر
ضیائے مہر کو لوگوں نے دن کا نام بخشا ہے
اسے تشبیہ دی کچھ شاعروں نے اک حسینہ سے
مگر سچ ہے کہ وہ مزدور اک، باعزم و ہمت ہے
ہمارے ملک و ملت کا وہ اک بازوئے قوت ہے
میں اپنے شہر کے سورج کے کتنے نام بتلاؤں؟
یہ لالہ بھی ہے، گل بھی، اک عروسِ نور و مشعل بھی
مگر تاریخ ہے معمور اس کے کارناموں سے
ابھی تک جو بہت دھندلے ہیں شاعروں کی بیاضوں میں

کھُردرے ہاتھوں سے اس کے ہے تراوش نور کی
اس کی آنکھوں میں جنم لیتے ہیں نغماتِ حسیں
اس کے شریانوں میں جلتے خون کا وہ جوش ہے
نقش جس کا کھینچنے کو رنگ ملتے ہی نہیں

بے کراں جراُت کو کیسے رنگ میں ظاہر کروں؟
اس کی دانائی کی وسعت کے لئے کیا لفظ ہے؟
سُن رہی ہوں اُس کی باتیں دیر سے میں اس طرح
جیسے کوئی شعر خوانی کر رہا ہو، رو برو
روح افزا اس کی باتیں، دلربا اس کی صدا
جسم ہے جیسا توانا ویسی ہے بختِ رسا
دیکھتی ہوں میں فضاؤں میں اسے پَر تولتے
زندگی اُس سے ہے وہ خود ہے سراپا زندگی
کھینچتا اُس زندگی کا نقش میری زندگی
اس کے پیکر کا مرقع میں بناؤں گی ضرور
وہ جو روئی، پیار، محنت کی طرح ہے محترم
وہ جو مٹی ابر سورج کی طرح خلّاق ہے
نت نئی فطرت کے یہ انساں ہیں شہ کارِ فن
یہ وطن ہے میری ہستی، میری شہرت ہم وطن

اور پھر اُٹھتے اٹھتے ہمیں زلفیہ کی ایک نظم سنائی کہا جاتا ہے کہ اس کی مقبول ترین نظم ہے۔

اے دلبر محبوب مرے، یار دلآرا!
آجا مرے پہلو میں، اسی پیار سے آجا

ہر شب تو خیالوں میں مرے آتا ہے
اور تا بہ سحر رہتا ہے نزدیک مرے
یوں میری شبِ ہجر، مری درد کی رات
ہر روزِ گریزاں سے کہیں بہتر ہے
شبہائے زمستاں میں کوئی رشتۂ پنہاں
لاتا ہے مرے پاس ترا چاند سا مکھڑا
آنکھوں سے تری جذبِ محبت ہے چھلکتا
بس جاتا ہے نظروں میں مری تیرا سراپا
کل رات جو کھڑکی سے مجھے تو نے بلایا
بستر سے اٹھی اپنے میں سودائی و مدہوش
طاہر کی طرح اپنے پر و بال کو بکھرائے
ترساں کہ ترا جلوہ نگاہوں سے نہ چھپ جائے
ہر سو چمن و باغ کی پُر کیف فضا تھی
سائے کی طرح میں بھی ترے ساتھ رواں تھی
آہستہ سے بڑھتے ہوئے گلزار میں پہنچے
ہاتھوں میں چنے تو نے گل و غنچۂ نورس
پھر تو نے کہا مجھ سے عجب پیار سے ہنس کے
"لے پھول! یہ سب ہیں ترے رخسار پہ صدقے"
جو پھول دئے تو نے، وہ دامن میں لئے تھی
شرمائی نگاہیں تھیں ترے رُخ کو تھی تکتی
ان آتشیں پھولوں میں ترا عشق بسا تھا
ارمان تھا لیتی ترے رخسار کا بوسہ
اتنے میں اُٹھا مرغِ سحر، بانگ لگائی

میری شب و رویائے سحر ختم پہ آئی
میں ہو گئی بیدار مگر آنکھ نہ کھولی

وہ دیدۂ بیدار ہو یا عالم رویا
میں ہوں ترے دیدار، ترے وصل کی جویا

اسی طرح ازبکستان کی شہرۂ آفاق شاعرہ زلفیہ کی نظمیں نہیں، زلفیہ کا نیا مجموعۂ کلام "وصال" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے -

میں ہوں اک سیاح سیلانی، مرا بے چین دل
نت نئی خوشیوں، نئے گیتوں کا پیاسا ہے سدا
ہر جگہ جانا ہے مجھ کو، دیکھتا ہر چیز ہے
جیسے ہر شے، ہر جگہ میرے لئے بیتاب ہو

دُور اُفتادہ دیہاتوں میں بھی مَیں پھرتی رہی
ہے وہاں رونق، وہاں ہر لمحہ معنی خیز ہے
بخشتا ہے جو دلوں کو اک نشاطِ دائمی
ہموطن! اے ہموطن! تو میری خوشیوں کا جہاں
یہ مری ہستی، یہ میرے گیت، یہ نغمے مرے
کچھ نہیں، تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

میں نے "رہبرو" کو صدا دی تو زراعت گاہ کی
... عورت مُسکراتی آئی میرے روبرو
... چہرہ شوخ آوارہ ہواؤں کا ڈھلا
... یہ دیکھی میں نے اک ایسی غزل

جو مرے اُس گیت سے ہے خوب تر
جس کو لکھنے کے بے چین ہے میرا قلم
اس کے سانولائے ہوئے چہرے کا ہالا ہے رومال
پاؤں ہیں کیچڑ سے لت پت بھاری بھاری بوٹ ہیں
تیکھی نظریں، نے جھجک انداز، دل میں عزم و شوق
وہ ہے اپنے دَور کا اک زندہ و تابندہ نقش
دَور — جس کی الجھنوں میں بھی عجب ہے بانکپن

شام کے چھ بجے ہیں تاشقند کو خیرباد کہہ رہا ہوں، ہوائی اڈہ پر تمام ازبک دوست خدا حافظ کہنے کے لئے آئے ہوئے ہیں اور ہم چشم پرنم کے ساتھ دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔

حیف در چشم زدن محبت یار افسر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار افسر شد

اب بھی سائبیریا کا سفر ہے، وہی سائبیریا جس کے متعلق ہمارے ہاں عجیب و غریب قصے مشہور ہیں۔

روزنامچہ

۲۸؍جون ۷۹ء

۲۸ جون ۱۹۷۹ء

۱۹۷۷ء اگست کے دنوں کا روزنامچہ قارئین پڑھ چکے اب پھر دو سال سے بھی کم عرصے کے بعد اسی وسطی ایشیا کو دیکھنے اور گھومنے آیا ہوں، ان دو سالوں میں ان جہاں رنگ و بو میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور مسلسل رونما ہو رہی ہیں، افغانستان میں انقلاب ہو گیا، ایران میں شہنشاہیت دم توڑ چکی ہے ان تبدیلیوں نے سامراجی اور سرمایہ دار ممالک کو پریشان کر دیا ہے اور وہ ان انقلابوں کو، ان تبدیلیوں کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرار دیتے ہیں اور مغرب والے امراء اگر رہے ہیں کہ بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا جانا اور خمینی کی قیادت میں ایران کے اندر اسلامی انقلاب سوویت یونین کی مسلم جمہوریتوں کو بھی ان اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں سے متاثر کرے گی اور ان میں بھی سوویت یونین کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہوں گے جو بالآخر آزادی کی تحریکوں پر منتج ہوں گے، میں نے ان خطوں کی پوری تاریخ کو کھنگالا ہی اس لئے ہے کہ یہ ثابت کر سکوں کہ ان خطوں کے مسلمان ہوں یا عیسائی یا لادین عناصر کوئی بھی محرومی اور اقتصادی یا جذباتی دباؤ کا شکار نہیں ہے تو پھر ان خطوں میں علیحدگی کی تحریک کیوں ابھرے گی اگر متحدہ پاکستان سے بنگلہ دیش والوں کے اندر علیحدگی کا جذبہ ابھرا تو اس لئے کہ ہم نے ان کی جائز آسوں پیاسوں اور تمناؤں کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالی ان کی اقتصادی

ترقی میں مزاحمت کی، وہاں انتظامی طور پر غیر صوبے والوں کی بالادستی قائم کی۔

اسی طرح ایران میں جو بغاوت ہوئی وہ ایک جابر شہنشاہیت اس کے استحصال اور بدترین قسم کی تشدد دانہ کارروائیوں کے خلاف تھی اور چونکہ سیاسی آزادی نہ تھی اس لئے جہاں سیاسی آزادی نہ ہوگی وہاں بغاوت کی تحریکوں کو جو زبان ملے گی وہ مذہب کی زبان ہی ہوگی اور مذہب کے بھی وہ نعرے ہوں گے جو عوام کی محرومیوں کے ازالے کا باعث بن سکیں گے لیکن وسطی ایشیا کی ان جمہوریتوں میں مسلم آبادی ہو یا عیسائی آبادی، تاجک ہوں، یا ازبک، قفقازی ہوں یا قرغیزی یا پھر آذربائیجان کسی کو بھی نہ مذہبی طور پر، نہ قومیت کی بنیاد اور سب سے بڑھ کر نہ اقتصادی سطح پر کسی قسم کی محرومی اور دباؤ کا سامنا نہیں ہے تو پھر مزاحمت اور بغاوت کس امر کے خلاف ہوگی۔

یہ درست ہے کہ مغرب کا پورا ذرائع ابلاغ اس قسم کے پراپیگنڈے میں مصروف ضرور رہے اور وہ مختلف طریقوں سے سوویت یونین کے خلاف پراپیگنڈہ کرتا ہے، سب سے زیادہ تو مذاہب کے حوالے سے کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان خطوں میں مذہب کی عبادت کی پوری پوری آزادی ہے اور اگر کوئی عبادت کرنا چاہتا ہے تو اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بلکہ مادی آسائشیں اتنی حاصل ہیں کہ وہ زیادہ دلجمعی اور خشوع وخضوع سے عبادت کر سکتا ہے۔ یہاں کا بسنے والا روٹی روزگار کے حصول کی دعاؤں کے لئے عبادت کرنے پر مجبور نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ایک عبادت کرتا ہے تو اس لئے کہ اس کے رب کا حکم ہے۔

دوسرے ان خطوں کی اور پورے سوویت یونین کی حکومت اور کمیونسٹ پارٹی خود ان خطوں کے لوگوں کے اسلامی تشخص کی نشوونما میں ممد ہوتی ہے، اس کو اسلامی تشخص کے نشوونما سے قطعاً کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔ دراصل مذہب کے نام لیوا غلط راستے اس وقت اختیار کرتے ہیں جب سرمایہ داری اور جاگیرداری

نظام زندہ ہوتے ہیں، یہ لوٹنے والے طبقے مذہب کے نام پر لوٹنے کے عمل کو جائز قرار دینا چاہتے ہیں اس کے لئے وہ ملاں، مولوی کو اقتصادی جبر کے شکنجے میں جکڑ کر اس کو مذہب کی غلط توجیہات پر مجبور کرتے ہیں اور ہر عادلانہ نظام کو غیر اسلامی قرار دے دیا جاتا ہے اور ہر سماجی تبدیلی جس سے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ پر چوٹ پڑتی ہو اس کو اسلام کے منافی عمل قرار دے دیا جاتا ہے لیکن سوویت یونین کی ان جمہوریتوں میں صورت حال مختلف ہے وہاں پر سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ نہ صرف ختم ہو چکا ہے بلکہ غربت، بے روزگاری، جہالت، بیماری ان سب کا خاتمہ ہو چکا ہے اس لیئے اب وہ طبقہ ہی موجود نہیں جو مذہبی لوگوں کو اکسائے اور ورغلائے اس لئے اب یہاں کے لوگوں کو اسلامی تشخص کے ابھرنے سے وحشت نہیں ہوتی بلکہ روشنی ملتی ہے جب وہ خسرو، فردوسی، ابن بینا اور امام بخاری کی یاد مناتے ہیں تو ان یادوں سے وہ علم کی نئی شمعیں روشن کرتے ہیں۔ آج یہاں کے ازبک اور تاجک قرغیزی اور آذر بائیجان اپنے ماضی کو کھنگال رہے ہیں، وہ رومی کو بھی پڑھتے ہیں اور نظامی گنجوی کو بھی اس لئے اس دفعہ جب میں ان جمہوریتوں میں گیا تو میں نے خاص طور پر ان کی مادی زندگیوں کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیبی اور روحانی زندگیوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کو بھی قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے اور اس میں کمیونسٹ کوئی دھوکہ نہیں دیتے کہ جہاں تک کمیونسٹ پارٹی اور ان کی حکومت کا تعلق ہے ان کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ ایک سیکولر حکومت ہے وہ کسی مذہب سے رو رعایت نہیں کرتی ہے مذہب کے پیروکار کو اپنے مذہب پر کاربند رہتے عبادت کرنے کی پوری آزادی ہے اور اس کی ضمانت باقاعدہ طور پر انہیں دی گئی ہے لیکن مذہب کے نہ ماننے والوں کو بھی پوری آزادی ہے اور اس ضمن میں کمیونسٹ پارٹی اپنے موقف چھپاتی نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں باقاعدہ اعلان کرتی ہے۔

ویسے یہ موقع نہیں ہے وگرنہ جی چاہتا ہے کہ تفصیل سے اس موضوع پر لکھا جائے کہ آج مغرب کو سعودی عرب کے تشددانہ مذہبی رجحانات کیوں زیادہ پسند ہیں اور الجزائر یا شام یا لیبیا کے اندر رونما ہونے والی اسلامی احیاء کی تحریکیں کیوں پریشان کرتی ہیں، ان مغرب والوں کو خمینی کا اسلام ایک آنکھ نہیں بھاتا لیکن ضیاء الحق کا "اسلام" بہت ہی محبوب ٹھہرتا ہے۔ یہ دلچسپ موضوع ہے انشاء اللہ بشرطے زندگی جلد ہی اس پر تفصیل کے ساتھ لکھوں گا۔

ہاں تو یہ ۲۸ جون ۱۹۷۹ء ہے میں بلغاریہ کے دارالحکومت صوفیہ کے ہوائی اڈے کے مسافروں کی لاونج میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں، دوپہر کے ۱۱ بجے ہیں ابھی ابھی صوفیہ پریس کے تمام دوست مجھے الوداع کہہ کے گئے ہیں بلغاریہ میں بیس دن کا قیام ختم ہوا، ان بیس دنوں میں مجھ پر کئی قیامتیں گزریں، کئی پریشانیاں دیکھیں، کئی راتیں آنکھوں میں کاٹ کر گزاریں، دراصل عائشہ کی طبیعت کی یکایک خرابی نے قیامت ڈھادی، ہسپتال میں چیک اپ، پھر طبیعت کا سنبھلنا، اس کی روانگی، اس کے حفاظت سے گھر پہنچنے کا تذبذب، پھر اطلاع ملنے میں تاخیر اور اس کی وجہ سے عجیب وغریب قسم کے وسوسے غرضیکہ یہ عجیب وغریب حالت میں یہ دن گزارے اور اپنی کیفیات کا اظہار ایک نثری نظم میں کیا تھا۔

۲۹ جون ۷۹ء اس وقت صبح کے پونے آٹھ بجے ہیں، ماسکو کے ایک ہوٹل جسے کیو ماسکوایا کہتے ہیں کے ایک کمرے میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں، کل صوفیہ سے ماسکو کا سفر بخیر وخوبی کٹ گیا لیکن جہاز کو کچھ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہوائی اڈے پر اترنے میں خاصی تاخیر ہوئی، پہلے تو میں ڈرا کہ ابھی اعلان ہوگا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہم واپس جارہے ہیں یا کسی اور شہر میں اتر رہے ہیں لیکن خدا خدا کر کے بالآخر جہاز ماسکو کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ پاسپورٹ چیک کرنے والوں نے آج تو رلا رلا دیا۔ اس لئے کہ پاسپورٹ پر ٹوپی کے ساتھ تصویر ہے اور میں

نکلے تھا تو یہ مجھے گھورتے رہے، کبھی کوئی پاسپورٹ لے جاتا اور کبھی کوئی اور افسر غور سے گھورتے کہ ابھی کھا ہی جائیں گے، سخت کوفت اور وحشت ہو رہی تھی، خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا اور سامان بدست پھولے ہوئے سانس کے ساتھ باہر نکلا اور آگے مرزا اشفاق کے ہمراہ سرمد کا دوست شاہ نواز بھی موجود تھا اتنے میں میرا گائیڈ بھی آگیا۔ روسی پریس نے اس دفعہ ایسا گائیڈ بھیجا تھا جو نہ مجھے جانتا تھا نہ پہچانتا تھا اور تو اور اس نے میری تصویر تک نہیں دیکھی ہوئی تھی اگر اشفاق اور شاہ نواز نہ ہوتے تو ہم کو ایک دوسرے کو ڈھونڈنے میں خاصی پریشانی ہوتی۔ خیر اس کے بعد ٹیکسی میں بیٹھے اور ہوٹل آ گئے، یہ ہوٹل میرے لئے نیا ہے اس سے پہلے میں یہاں کبھی نہیں ٹھہرا ہوں یہ ماسکو ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے ہے ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے میں خاصی دیر لگی اور اس انتظار کے دوران اشفاق نے بہت پتے کی بات کہی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کمرہ ملا تو کمرے میں سامان رکھا اور اطمینان سے مرزا اشفاق بیگ سے گفتگو شروع ہوئی اور فیض کا حال معلوم کیا وہ ماسکو سے باہر گیا ہوا ہے اور اس نے آٹھ دس جون کو واپس آنا ہے۔

ہم نے شام کا کھانا اکٹھے کھایا اور پھر ہوٹل کے بارہ بجے تک گپ ہوتی رہی۔ چنانچہ یہ تھی کل کی روئیداد۔ آج میرا پروگرام صبح دس بجے کسی سے ملنے کا ہے لیکن یہ کون ہے اس سے متعلق مجھے علم نہیں کہ اس ملک میں زندگی گزارنے کے لئے صبر ایوبی درکار ہے بہرحال ابھی گائیڈ آئے گا اور اس کے ساتھ جاؤں گا۔

۲۹ جون ۷۹ء آج ماسکو میں پہلا دن ہے اور کام باقاعدگی سے میں نے شروع کر دیا ہے ناشتے کے بعد کوئی ساڑھے نو بجے ہوٹل سے میں، گائیڈ اور شاہ نواز نکلے اور سوویت یونین میں مذہبی امور کی کونسل کے دفتر میں گئے اور اس کا چیئرمین نور اللہ سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ کچھ دیر دفتر کے باہر کمرہ استقبالیہ میں انتظار کیا اس کے بعد ان کے کمرے میں گئے یہی کوئی چالیس سال ان کی عمر ہو گی گورا چٹا رنگ، ان کا سرکاری عہدہ "وزیر برائے کونسل مذہبی امور سپریم سوویت ہے۔

ان سے کوئی دو اڑھائی گھنٹے نہایت ہی بے تکلفی سے گفتگو ہوئی چونکہ یہ خود ایک تاتاری مسلمان گھرانے کے فرد ہیں اس لئے ان کو میرے مافی الضمیر کو سمجھنے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوئی میں نے ان سے یہی کہا کہ بحیثیت کمیونسٹ ریاست کے آپ کا مذہبی امور عبادات اور مذہبی آزادیوں کے بارے میں کیا رویہ ہے؟

نور اللہ نے کہا کہ ہمیں سب سے پہلے تاریخی پس منظر اور اکتوبر انقلاب کے سیاق وسباق کو پوری طرح سمجھ لینا چاہیئے کیونکہ پاکستان ہی کیا دوسرے اسلامی ممالک میں بھی مغربی پراپیگنڈہ نے یہ بات وہاں کی آبادی کے ذہنوں میں سختی سے بٹھادی ہے کہ وسط ایشیا میں انقلاب لوگوں کی اپنی مرضی اور جدوجہد سے نہیں آیا بلکہ روسی فوجوں نے یہاں پر بالجبر ایک نظام نافذ کر دیا ہے حالانکہ تاریخی اور واقعاتی طور پر یہ بالکل غلط ہے اس لئے وہاں پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو جاننے کے لئے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھنا چاہیئے چنانچہ یاد رکھنا چاہیئے۔

وسط ایشیا کئی دہائیوں تک زار روس کا ایک دور افتادہ پسماندہ علاقہ تھا۔ نوآبادیاتی حکمرانوں نے جان بوجھ کر اس کی معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں اور اسے خام مال پیدا کرنے والے علاقے میں تبدیل کر دیا۔ زار کے مطلق العنان حکومت اور خود اس علاقے کے زمینداروں اور ابھرتے ہوئے قومی بورژوازیوں نے مقامی آبادی کا بے دردانہ استحصال کیا۔

قومی اور مذہبی امتیازات نے ان کی حالت اور بھی تباہ کر دی۔ مثلاً یکساں تعلیم اور ہنر مندی کی سطح کے باوجود مقامی قومیتوں کے مزدوروں کو روسی مزدوروں کے مقابلے میں چالیس سے لے کر پچاس فیصدی تک کم اجرت ملتی تھی۔ بعض صنعتی شعبوں میں تو یہ فرق اور بھی زیادہ تھا۔ زار روس کے دور میں روسی آرتھوڈکس چرچ کو سرکاری مذہب تسلیم کیا جاتا تھا جب کہ دیگر مذاہب پر، جن میں اسلام بھی شامل تھا، پابندیاں عائد تھیں اور ان کے پیروں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی جاتی تھی۔

ترکستان (وسط ایشیا ان دنوں اسی نام سے موسوم تھا) کے محنت کش عوام کی

ابتر صورت حال نے روس پرولتاریہ کی انقلابی تحریک کو ایک نیا خیال دیا اور اس نے وسط ایشیا کی قومی آزادی کی تحریک سے اپنا ناطہ جوڑ دیا۔

ترکستان میں ۱۹۱۷ء کے موسم بہار سے محنت کش مسلمانوں کی سوویتیں قائم ہونے لگیں جو "اتفاق" کہلاتی تھیں۔ یہ مزدوروں اور کسانوں کی قومی انقلابی جمہوری تنظیمیں تھیں۔ سوویتوں اور روسی مزدوروں کی ٹریڈ یونینوں کے ساتھ اتفاق کے روابط اور مشترکہ دشمن کے خلاف ان کی متحدہ جدوجہد نے کثیر الاقوامی سوویتوں اور مزدوروں کی دیگر جمہوری تنظیموں کو جنم دیا۔

فرمان امن اور فرمان زمین، جنہیں سوویتوں کی دوسری کل روسی کانگریس میں ۸ نومبر ۱۹۱۷ء کو منظور کیا گیا تھا اور جس میں کسانوں کو مفت زمینیں دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، مسلمانوں کے مفادات کے مطابق تھے کیونکہ ترکستان کی تقریباً ساٹھ لاکھ کی آبادی میں سے تقریباً بارہ لاکھ بے زمین اور غریب کسان صرف ازبکستان کی سرزمین پر آباد تھے۔

مسلمان آبادی سوویت حکومت کے روسی قوموں کے حقوق کے اعلان نامے سے بے حد متاثر ہوئی۔ اس اعلان نامے کے تحت ہر قسم کی قومی اور مذہبی مراعات اور پابندیوں کا خاتمہ کر دیا گیا، مذہب کی نابرابری یعنی، اعلیٰ اور ادنیٰ کے خانوں میں مذہب کی تقسیم ختم کر دی گئی۔ سماجی زندگی سے "بدتر" اور "کم تر" قوموں کی تقسیم کی پالیسی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا اور قوموں کے درمیان مذہبی اور قومی بنیادوں پر منافرت کی جڑیں اکھاڑ دیں گئیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۱۷ء کو تاشقند میں (جو اب ازبکستان کا دارالحکومت ہے) مزدوروں فوجیوں اور غریب کسانوں کی مسلح جدوجہد کامیاب ہوئی۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر تک تقریباً سارے علاقے میں سوویت حکومت قائم ہو گئی تھی جسے وسط ایشیا کے عوام کی سرگرم حمایت حاصل تھی۔ یہاں مختلف جلسوں اور اجتماعات میں سوویت حکومت کی حمایت میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ مثلاً وسط ایشیا کے ریلوے کے مزدوروں نے جو قرارداد منظور کی اس میں یہ الفاظ درج تھے۔ "ہم مسلمان مزدور متفقہ طور پر مزدور حکومت کی

ہمہ گیر حمایت کرتے ہیں... ہم روسی پرولتازیہ کی جانب دست تعاون بڑھاتے ہیں کیونکہ ہم انھیں مزدوروں اور محنت کش طبقہ کا سچا محافظ سمجھتے ہیں جنھوں نے ہمیں افسروں اور زمینداروں سے نجات دلائی۔

۳، دسمبر ۱۹۱۷ء کو و۔ ای لینن نے، روس اور مشرق کے تمام محنت کش مسلمانوں کے نام " اپیل پر دستخط کئے جس کا مسلمانوں نے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اس اپیل میں لکھا تھا، "آج سے آپ اپنے عقائد اور رسم ورواج میں آزاد ہیں، آج سے آپ کے قومی اور ثقافتی اداروں کو آزاد اور قابل احترام قرار دیا جاتا ہے۔

مذہبی عقائد کی جانب سوویت حکومت کا طرز عمل اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے حضرت عثمان کی لکھی ہوئی قرآن شریف کے نادر نسخے کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا جسے۔ زار روس کا ایک جنرل وسط ایشیا کی ایک مسجد سے اٹھا کر لے گیا تھا سوویت اقتدار کے قیام کے بعد مسلمانوں نے عوامی کیساروں کی کونسل سے اس نسخے کو واپس کرنے کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ حکومت نے ایک خصوصی فیصلہ منظور کیا جس پر لینن نے دستخط کئے۔ اس فیصلے میں کہا گیا تھا کہ "روس کے تمام مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے حکومت نے حضرت عثمان کے لکھے ہوئے قرآن پاک کے نسخے کو واپس کرنے کا فیصلہ کیا ہے"۔

۲۳ جنوری ۱۹۱۸ء کو عوامی کیساروں کی کونسل نے آزادی ضمیر، چرچ اور مذہبی تنظیموں کی آزادی کا فرمان منظور کیا۔ اس دستاویز میں مذہب کو ہر شہری کا نجی معاملہ قرار دیا گیا تھا۔ اس فرمان میں یہ کہا گیا تھا کہ ہر شہری کو کوئی بھی مذہب اختیار کرنے یا نہ کرنے کی آزادی ہے۔ اس میں تمام مذاہب کی برابری کے جمہوری نظریے کو قانونی شکل دی گئی تھی۔

اور پھر لینن نے نومبر ۱۹۱۹ء میں ترکستان کے کمیونسٹوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "ساتھیو! مجھے اجازت دیجئے کہ میں عوامی کیساروں کی کونسل اور دفاعی کونسل کے صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پارٹی ممبر کی حیثیت سے آپ سے مخاطب ہوں۔

یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہوگا کہ روسی سوشلسٹ وفاقی سوویت ری پبلک کے لئے ترکستان کی قوموں سے صحیح قسم کے تعلقات قائم کرنا اس وقت نہایت اہم کام ہے اور اس کی اہمیت عہد آفریں ہے۔

ان قوموں کی طرف جواب تک کمزور مظلوم اور دبی کچلی تھیں، مزدوروں اور کسانوں کی سوویت ری پبلک کا رویہ پورے ایشیا کے لئے دنیا بھر کی تمام نوآبادیوں کے لئے کروڑوں انسانوں کے لئے بہت بڑی عملی اہمیت رکھتا ہے۔

میں تہ دل سے آپ لوگوں سے پرزور اصرار کرتا ہوں کہ اس سوال پر بہت گہری توجہ دیجیے، ترکستانی عوام کے ساتھ برادرانہ تعلقات کی موثر مثال قائم کرنے کی دل وجان سے کوشش کیجئے اور اپنے عمل سے ان کو اس بات کا ثبوت دیجئے کہ ہم لوگ واقعی، خلوص دل سے ہمارے روسی سامراج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے خواہش مند ہیں اور اسی طرح عالمی سامراج کے خلاف جس کی قیادت برطانوی سامراج کرتا ہے، ڈٹ کر، تند وتیز جدوجہد کرنے کے پورے خلوص سے خواہاں ہیں۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ ہمارے ترکستانی کمیشن پر پورا پورا اعتماد رکھیں اور اس کی ہدایات پر سختی سے کاربند رہیں۔ ان ہدایات پر جن کی ترتیب وتشکیل کل روسی مرکزی مجلس عاملہ نے ٹھیک اسی اسپرٹ میں کی ہے۔

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اس خط کا جواب دیں اور اس میں مجھے اپنے رویہ سے مطلع کریں۔

اس عظیم جدوجہد کے پس منظر میں آزادی ضمیر سے متعلق قوانین کی اشاعت نے سوویت اقتدار کے دشمنوں کی افترا پردازیوں کا پردہ چاک کر دیا کہ سوویت حکومت تمام مذاہب کو ممنوع قرار دینا چاہتی ہے۔ نہ تو کسی نے مسلمانوں کے مذہبی تہواروں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں اور نہ ہی ان کی مسجدیں بند کی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان فقہانے، جنھوں نے ابتدا میں سوویت حکومت کی جانب محتاط رویہ اختیار کیا تھا، بتدریج اپنے طرز فکر میں تبدیلی پیدا کی، سوویت حکومت سے وفاداری کا مظاہرہ کیا اور اس کی حمایت کرنے لگے۔ اس کے بعد ان کے پیروں کے طرز فکر میں اور بھی تیزی سے تبدیلی آئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ

نئی حکومت نے جو اقدامات کئے تھے وہ کسی لحاظ سے بھی اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہیں تھے، جن میں سماجی انصاف کی تعلیم دی گئی ہے۔

یہ ہے پس منظر! اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان خطوں کے غریب، مجبور اور مقہور مسلمان محنت کشوں نے از خود انقلابی عمل کا اجرا کیا، اس عمل نے روسی مزدوروں کے ساتھ کندھا ملانے پر مجبور کیا اور ایک عظیم انقلابی تحریک وجود میں آئی اور اس تحریک نے انقلاب کے لئے زمین ہموار کی اور جب روس کے مزدوروں، کسانوں اور فوجیوں نے انقلاب بپا کر دیا تو اس انقلاب نے وسطی ایشیا کے علاقوں میں بھی انقلاب کے شعلوں کو بھڑکا دیا۔ اب اس انقلاب کو بپا ہوئے ۶۰ برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے اس دوران پلوں کے نیچے سے بے بہا پانی بہہ چکا ہے، زندگی بالکل بدل گئی ہے اب یہاں پر سوشلسٹ نظام قائم ہو چکا ہے۔ ذرائع پیداوار، کارخانوں اور کھیتوں پر محنت کرنے والوں کا قبضہ ہے۔ ہر خطے کے بسنے والوں کی اپنی مادری زبان سرکاری زبان بن چکی ہے، جہالت دور ہو چکی ہے چاروں کور علم کی شمعیں جگمگا رہی ہیں۔ عدم تحفظ کی پوری فضا ختم ہو گئی ہے کیونکہ اب کوئی بے روزگار نہیں ہے، کوئی بھوکا نہیں ہے، کسی کو بیماری میں بے علاج مر جانے کا ڈر نہیں ہے۔ عورتیں آزاد ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں تو جب اس تیزی سے تبدیلیاں آ رہی ہوں اور معاشرہ کمیونزم کی حدود میں داخل ہو رہا ہے تو انسانوں کی روحانی اقدار میں بھلا کیوں تبدیلیاں نہیں آئیں گی؟ ان کے مذہبی رویے کیوں نہیں بدلیں گے؟ توہم پرستی بھلا کیسے باقی رہے گی؟ اب ہوتا کیا ہے کہ ہم ایسے ترقی یافتہ سوشلسٹ معاشروں کو جانچتے ہیں اپنے پیمانوں سے اپنے معیاروں سے! وہ معیار، وہ پیمانے جو ایک پسماندہ، جاہل، غریبی، بے روزگاری اور بیماری سے ستائے ہوئے لوگوں کے پیمانے ہیں جہاں قدم قدم پر توہم پرستی ہے۔ شرک ہے، بدعتیں ہیں جہاں منہ سے کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے وہی مختارِ کل ہے اس کا کوئی نہ تو شریک ہے اور نہ ہی ثانی لیکن اس کے باوجود ہر فقیر اور ہر پیر کو خدا سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس سے حاجتوں کی تکمیل کے طالب ہوتے ہیں کیوں، اسلئے ہمارا اپنا سماج، اپنا معاشرہ

اپنا سماج، اپنی دنیا، اپنی حکومت، اپنے نمائندے ہماری کوئی حاجت پوری نہیں
کرتی ہماری محرومیوں کا ازالہ نہیں کرتا تو ان محرومیوں کی فضا میں ہم مذہب پرستی کی
میں گڈمڈ کر دیتے ہیں اور جن معاشروں میں تبدیلیاں آگئی ہیں ان کو ہم
ہیں، غیر روحانی قرار دیتے ہیں اور ہماری اس پس ماندگی اور جہالت کی آڑ سے
سامراجی بھی اس قسم کے پراپگنڈے کو ہوا دیتے ہیں اور ہم سوشلسٹ معاشرے
کو سمجھ ہی پاتے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ

سوویت عوام نے ان دیکھے راستوں پر چلتے ہوئے بے پناہ مشکلات
پاتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی کی زیرِ قیادت سوشلزم کی تعمیر کے لئے
اور اس طرح کو سوشلزم کو سوویت یونین میں مکمل اور حتمی فتح حاصل ہوئی
اب سوویت عوام کا براہ راست عملی فریضہ بن گئی ہے۔

کمیونزم کیا ہے؟

پارٹی پروگرام کے الفاظ میں:

"کمیونزم ایک غیر طبقاتی سماجی نظام ہے جس میں وسائل
کی ایک ہی شکل ہوتی ہے اور سماج کے تمام اراکین کو مکمل سماجی مساوات
کے تحت عوام کے ہمہ جہتی نشوونما کے ساتھ ساتھ، سائنس اور
ذریعے پیداداری قوتوں کو بھی ترقی حاصل ہوگی۔ اجتماعی دولت
زور و شور کے ساتھ بہیں گے اور اس عظیم اصول کو عملی جامہ پہنایا
اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت
کمیونزم آزاد اور سماجی لحاظ سے باشعور محنت کش کسانوں کا ایک
جس میں عوامی حکومتِ خود اختیاری قائم کی جائے گی ایک ایسا
کے لئے محنت ہر شخص کے لئے زندگی کی اول احتیاج بن جائے گی
جائے گی جسے ہر شخص تسلیم کرے گا، اور ہر شخص کی صلاحیت کو عوام
استعمال کیا جائے گا۔

کیمونزم تمام انسانوں کو سماجی عدم مساوات سے، ہر قسم کے استبداد استحصال سے اور جنگ کے خوف سے نجات دلانے کے تاریخی مشن کی تکمیل کرتا ہے اور کرۂ ارض کے تمام انسانوں کے لئے امن، محنت، آزادی، مساوات، اخوت اور مسرت لاتا ہے۔

دنیا میں کیمونزم کا قیام نوعِ انسانی کی طویل تاریخ کا عظیم ترین انقلاب ہوگا اور یہ زندگی کے تمام شعبوں، یعنی پیداوار، محنت کی نوعیت اور حالاتِ محنت، سماجی تعلقات اور طرز زندگی، لوگوں کے خیالات و نظریات میں گہری تبدیلیاں لائے گا۔ کیمونزم سماج کے تمام اراکین کو ایسے حالاتِ زندگی فراہم کرے گا جو انسان کی عزیز ترین امنگوں کے عین مطابق ہوں اور اعلیٰ ترین انسانی آدرشوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

کیمونسٹ سماج کی سب سے بڑی خصوصیت مسلسل وسیع ہوتی ہوئی پیداوار کی نہایت اعلیٰ سطح اور محنت کی پیداواری صلاحیت کی فقید المثال سطح ہوگی جو تیز رفتار سائنسی اور فنی ترقی کا نتیجہ ہوگی۔ کیمونسٹ سماج منصوبہ بند معیشت کی اعلیٰ ترین منزل کو حاصل کرے گا اور مادی دولت اور قدرتی وسائل کے انتہائی بامقصد اور معقول استعمال کو یقینی بنائے گا۔ عوام بہترین اور طاقت ور ترین ٹکنولوجی سے لیس ہوں گے اور قدرت پر انسان کی طاقت رفیع الشان بلندیوں تک جا پہنچے گی جس سے انسان اس قابل ہو جائے گا کہ قدرت کی خودرو قوتوں کو بڑی حد تک کنٹرول کرے اور انھیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کرے۔ کیمونسٹ پیداوار کا مقصد مسلسل سماجی ترقی کو یقینی بنانا، سماج کے ہر فرد کو مادی اور ثقافتی ضروریات اور آرام پہنچانا اور اس کی مسلسل بڑھتی ہوئی ضرورتوں مفادات اور ذوق کی تکمیل کرنا ہوگا۔

لیکن کیمونزم کوئی زراجیت کاہلی اور آرام طلبی کا سماج نہیں ہوگا۔ محنت کیمونسٹ سماج کی مادی اور روحانی دولت کا اصل سرچشمہ ہوگی۔ کیمونزم کے تحت ہر شخص رضاکارانہ طور پر اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور سماج کی دولت اور قوت میں اضافہ کرے گا۔ کام کی نوعیت ہی بالکل بدل جائے گی۔ محنت ایک ذریعہ معاش نہیں رہے گی بلکہ زندگی کی بنیادی ضرورت بن جائے گی، حقیقی، تخلیقی سعی بن جائے گی، خوشی اور مسرت کا سرچشمہ بن جائے گی۔

کیمونزم، سماج کے طبقوں اور سماجی گروہوں میں تقسیم کا خاتمہ کر دے گا۔ جب سماجی اور

معاشی دائروں میں اور ثقافت اور طرز زندگی میں شہر اور گاؤں کے درمیان فرق کا خاتمہ ہو جائے گا اور جب سوشلسٹ ملکیت کی دو قسمیں ایک کمیونسٹ ملکیت میں مدغم ہو جائیں گی تو مزدور اور کسان طبقوں کی حیثیت سے باقی نہیں رہیں گے۔ جسمانی محنت کرنے والے مزدور دانش وروں کی ثقافتی اور فنی سطح حاصل کرلیں گے اور اس طرح کمیونزم کے تحت دانش وروں کا ایک علیحدہ سماجی گروہ کی حیثیت سے کوئی وجود نہیں ہوگا۔ سماج کا ہر رکن دماغی اور سماجی محنت کرے گا اور کام میں دماغی اور جسمانی مساعی نا میاتی طور پر متحد ہو جائیں گی۔

کمیونسٹ سماج کے تمام اراکین، وسائل پیداوار کے ساتھ یکساں تعلق رکھنے کی بنا پر، ایک ہی جیسی حیثیت کے حامل ہوں گے، انھیں کام اور تقسیم کے یکساں حالات حاصل ہوں گے اور سماج کے امور کا نظم ونسق کرنے میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیں گے۔ فرد اور سماج کے درمیان اہم آہنگ تعلقات ایک ضابطہ بن جائیں گے کیونکہ سماجی اور ذاتی مفادات مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں گے۔

انسانی ثقافت فقید المثال بلندیوں تک جا پہنچے گی؛ کمیونسٹ سماج کی ثقافت، عالمی ثقافت کی تخلیق کردہ بہترین چیزوں کو ورثے میں لیتے ہوئے اور انھیں فروغ دیتے ہوئے، نوع انسان کی ثقافتی ترقی میں ایک نئے اور اعلیٰ تر مرحلے کی نمائندگی کرے گی۔ اس میں نئے سماج کی جمالیاتی زندگی کا سارا تنوع اور دولت اعلیٰ آئیڈیالوجی اور انسان دوستی شامل ہوگی۔ یہ ساری نوع انسانی کی ایک غیر طبقاتی، بین الاقوامی ثقافت ہوگی۔

کمیونزم کے تحت ایک نیا انسان ظہور پذیر ہوگا جو روحانی دولت کو اخلاقی پاکیزگی اور جسمانی کاملیت کے ساتھ ہم آہنگ کرے گا، یہ انسان محنتی، تنظیم یافتہ اور سماج کے مفادات کا وفادار ہوگا اور یہ ساری چیزیں مل کر کمیونسٹ شعور کی تخلیق کرتی ہیں۔ کمیونسٹ تعمیر انسان سے جس عظیم تنظیم اور قطعیت کا مطالبہ کرتی ہے اس کی ضمانت جبر کے ذریعے نہیں بلکہ گہرے شہری احساسِ فرض کے ذریعے فراہم کی جائے گی۔ انسان کا نشو ونما جامع اور ہم آہنگ ہوگا۔ اس کی صلاحیتوں اور ذکاوتوں کو پوری آزادی ملے گی اور وہ مکمل طور سے ابھریں گی، اس کی نفیس ترین روحانی اور جسمانی خوبیاں مکمل طور پہ اپنا اظہار کریں گی۔

...زم کی تعمیر کمیونسٹ پارٹی کے اس اعلیٰ ترین مقصد کے حصول کی علامت ہو گی کہ ...یک سماج تعمیر کیا جائے جس کے پرچم پر یہ لکھا ہو۔

...شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے ...ا دیا جائے۔ پارٹی کا یہ نعرہ کہ "ہر چیز انسان کے لئے، انسان کی بھلائی کے لئے" مکمل طور ...ست پائے گا۔ چنانچہ اب یہ عمل پورے زور شور سے سوویت یونین میں جاری وساری ...ور اس عمل کے دوران نئی اقدار، نئی روحانیت نئی ثقافت نئی تہذیب جنم لے رہی ہے ...ونسٹ اس امر پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ مادی دولت کی پیداوار کا طرز سماجی نشو و نما ...ں فیصلہ کن قوت ہے۔ پیداوار کا طرز اور پیداواری تعلقات کس طرح دیگر تمام سماجی ...(سیاسی، قانونی، اخلاقی وغیرہ) کی تشکیل کرتے ہیں اور یہ موخر الذکر تعلقات اپنی ...ف سے سماج کی معاشی ترقی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں یہ وہ سوالات ہیں جن کے ...ت "بنیاد اور بالائی ڈھانچہ کا مارکسی۔ لیننی نظریہ" دیتا ہے۔

بنیاد اور بالائی ڈھانچہ کیا ہیں؟ تمام متنوع سماجی تعلقات میں سے تاریخی مادیت مادی ...اواری تعلقات کو اصل اور فیصلہ کن تعلقات کی حیثیت سے الگ کرتی ہے ان پیداواری ...ت کا مجموعہ ہی سماج کے معاشی ڈھانچے کی یعنی اس کی بنیاد کی تشکیل کرتا ہے۔ پیداواری تعلقات کے مجموعے سے ملکیت کی شکلیں اور پیداواری سلسلۂ عمل میں انسانوں کے درمیان ...ہمی تعلقات جو ملکیت کی ان شکلوں سے پیدا ہوتے ہیں اور مادی دولت کی تقسیم کا طریقہ کار ...راد لینا چاہیئے۔

ہر سماج کی اپنی ایک بنیاد ہوتی ہے۔ پیداواری تعلقات کے مجموعے کی حیثیت سے ...نیاد کی قسم کا انحصار پیداواری قوتوں کی حالت پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی بنیاد اس وقت تک عالم ...جود میں نہیں آسکتی جب تک کہ مطابقتی مادی حالات یعنی اس بنیاد کی پیدائش کے لئے ضروری پیداواری قوتیں، پرانے سماج کے اندر پیدا نہ ہو جائیں۔

بنیاد ایک مرتبہ صورت پذیر ہو جانے کے بعد سماج کی زندگی میں زبردست کردار ادا ...رتا ہے۔ یہ انسانوں کو مادی دولت کی پیداوار اور تقسیم کی تنظیم کرنے کا اہل بناتی ہے۔ آپس

میں معاشی تعلقات قائم کئے بغیر انسان پیداوار نہیں کر سکتے اور نتیجۃً وسائلِ معاش کو تقسیم بھی نہیں کر سکتے۔

بنیاد اہم اس لئے ہے کیونکہ یہ بالائی ڈھانچے (یعنی سماج کے سیاسی، قانونی، فلسفیانہ، اخلاقی، جمالیاتی مذہبی نظریات اور ان سے مطابقت رکھنے والے تعلقات اداروں اور تنظیموں کے لئے اساس کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ بنیاد طرزِ پیداوار کا وہ پہلو ہے جو سماج، اس کے خیالات اداروں کی نوعیت کا براہ راست تعین کرتا ہے۔

بالائی ڈھانچہ بھی سماجی ترقی میں ایک اہم حصہ ادا کرتا ہے۔ ایک خاص معاشی بنیاد پر استوار ہو کر یہ بالآخر اس بنیاد کی جانب انسانوں کے رویے کا اظہار کرتا ہے۔ متعدد خیالات انسانوں کے رویے کا اظہار کرتا ہے۔ متعدد خیالات انسانوں کے لئے اس تمام بنیاد کو مستحکم کرنے یا اُسے تباہ کر دینے کی ضرورت کے جواز کا کام دیتے ہیں جب کہ ادارے اور تنظیمیں (ریاست سیاسی پارٹیاں وغیرہ) انسانوں کو ان کے خیالات کو بروئے کار لانے کا اہل بناتی ہیں۔ بالائی ڈھانچہ بنیاد کے ذریعے ہی پیداواری قوتوں کے نشوونما پر اثر ڈالتا ہے۔ مثلاً اس بات سے سبھی لوگ واقف ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی سوویت ریاست، مجموعی طور پر پورا سوشلسٹ بالائی ڈھانچہ، کمیونزم کی مادی اور فنی بنیاد کی تعمیر کرنے میں اور کمیونسٹ پیداواری قوتوں کو فروغ دینے میں کتنا اہم رول ادا کرتا ہے۔

بالائی ڈھانچہ کو بنیاد ہی وجود میں لاتی ہے اور یہ بنیاد کے ساتھ ناقابلِ شکست طور پر بندھا ہوا ہوتا ہے۔ بالائی ڈھانچے کا انحصار بنیاد پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قدیم سماج کی بنیاد کو لیجئے۔ ذاتی ملکیت اور طبقات کی عدم موجودگی اور نتیجۃً طبقاتی تضادات کی عدم موجودگی ہی وہ سبب تھی جس کی بنا پر قدیم سماج کے بالائی ڈھانچے میں نہ تو ریاست موجود تھی، نہ تو سیاسی اور قانونی خیالات موجود تھے اور نہ ہی اُن سے متعلق ادارے موجود تھے۔

ذاتی ملکیت اور طبقات کی پیدائش نے، یعنی غلامی کے سماج کی بنیاد کے ظہور نے ایک مختلف قسم کے بالائی ڈھانچے کو جنم دیا۔ ایسے خیالات پیدا ہوتے جو غلاموں پر آقاؤں کی حکمرانی کو جائز ثابت کرتے تھے اور ایسے ادارے بھی پیدا ہوئے (ریاست اور دیگر ادارے)

حکمرانی کا تحفظ کرتے تھے۔

مخاصمانہ طبقاتی سماج کی بنیاد متضاد ہوتی ہے۔ وسائلِ پیداوار کے ساتھ انسانوں کے مختلف تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بنیاد طبقاتی مفادات کے ٹکراؤ کی۔ ظلم سہنے والوں اور ظلم کرنے والوں کے درمیان مخاصمت کی عکاسی کرتی ہے۔ مثلاً سرمایہ داری کی معاشی بنیاد بورژوازی اور پرولتاریہ کے درمیان مخاصمت کی عکاسی کرتی ہے۔ اگرچہ بورژوا کا معاشی ڈھانچہ صرف ان دو، اہم مخاصمانہ طبقات کے درمیان تعلق باہمی تک محدود نہیں ہے سرمایہ دارانہ سماج میں بورژوازی اور پرولتاریہ کے علاوہ دیگر طبقات اور سماجی گروہ بھی ہوتے ہیں (محنت کش کسان، شہر اور گاؤں کے کاریگر اور پیٹی بورژوازی جن کے مفادات اجارہ دار بورژوازی کے مفادات سے ٹکراتے ہیں۔)

چونکہ ایک مخاصمانہ طبقاتی سماج کا بالائی ڈھانچہ بنیاد میں موجود تضادات کا عکس ہوتا ہے اس لئے اس بالائی ڈھانچے میں بھی تضادات موجود ہوتے ہیں۔ اس میں مختلف طبقات اور سماجی گروہوں کے خیالات اور ادارے شامل ہوتے ہیں لیکن اسی طبقے کے خیالات اور اداروں کو بالادستی حاصل ہوتی ہے جو معاشی لحاظ سے غالب ہوتا ہے مارکس اور اینگلز نے لکھا ہے "وہ طبقہ جو سماج کی حکمراں مادّی قوت ہوتا ہے، وہی سماج کی حکمراں دانشور قوت بھی ہوتا ہے۔"

سرمایہ داری کے تحت بورژوازی کو معاشی غلبہ حاصل ہوتا ہے اور اسی لئے بورژوا خیالات اداروں کو بالادستی حاصل ہوتی ہے اور بورژوازی انھیں خود حکمرانی کو دائمی بنانے کے لئے اور پرولتاریہ سے لڑنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔

تاہم سرمایہ دارانہ سماج میں بورژوازی کے مدمقابل پرولتاریہ ہوتا ہے جو خود اپنے خیالات کی تشکیل کرتا ہے اور خود اپنے ادارے قائم کرتا ہے۔ مزدور بتدریج سرمایہ داری کی ماہیت سے واقف ہونے لگے ہیں اور اسے ختم کرنے کی ضرورت سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بورژوازی سے لڑنے کے لئے خود اپنی تنظیمیں یعنی ایک سیاسی پارٹی، ٹریڈ یونینیں کوآپریٹو انجمنیں وغیرہ بناتے ہیں۔ انقلابی جدوجہد کے دوران پرولتاریہ مارکسی نظریئے پر

عبور حاصل کرتا ہے۔ خود اپنی اخلاقیات کی، خود اپنے سیاسی، قانونی اور جمالیاتی نقطہ ہائے نظر کی تخلیق کرتا ہے۔

بنیاد بالائی ڈھانچے کی نوعیت کا تعین کرتی ہے۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ یہ اُسے جنم دیتی ہے، بلکہ اس لئے بھی کیونکہ معاشی نظام کی تبدیلیاں لازمًا بالائی ڈھانچے میں تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً قبل اجارہ داری سرمایہ داری سے سامراج میں منتقلی کے دوران سرمایہ دارانہ معیشت میں ایک اہم تبدیلی پیدا ہوئی، یعنی آزاد مقابلے کی جگہ اجارہ داری نے لے لی۔ بورژوا بالائی ڈھانچہ بھی اسی کے مطابق بدل گیا بہت سے ممالک میں سرمایہ دار طبقے نے حکومت کی بورژوا جمہوری شکلوں کے بجائے رجعت پرست فاشسٹ یا نیم فاشسٹ شکلیں اختیار کرلیں اور اب بھی اختیار کر رہا ہے۔ محنت کش عوام کے حقوق کو روز افزوں طور پر کم کیا جا رہا ہے اور کمیونسٹ پارٹیوں اور ترقی پسند تنظیموں کو تعزیری کارروائی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ بورژوا آرٹ اور فلسفہ انحطاط کا شکار ہیں اور عینیت کی انتہائی رجعت پرستانہ شکلیں فروغ پا رہی ہیں۔

بالائی ڈھانچے میں تبدیلیاں اس وقت خاص طور پر زیادہ ہی ہوتی ہیں جب سماجی انقلاب کے نتیجے میں ایک معاشی بنیاد دوسری معاشی بنیاد پر غالب آجاتی ہے۔ انقلاب کے عمل کے دوران پرانے طبقے کے سیاسی اقتدار کی جگہ نئے طبقے کا اقتدار قائم ہوجاتا ہے ایک نئی ریاستی مشینری (سیاسی اور قانونی اداروں کا نظام) پرانی ریاستی مشینری کی جگہ وجود میں آجاتی ہے۔ سماجی شعور میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے، پرانی آئیڈیالوجی کی جگہ نئی آئیڈیالوجی لے لیتی ہے جو نئی بنیاد سے مطابقت رکھتی ہے۔ لینن نے لکھا ہے "پرانا ڈھانچہ ٹوٹ جاتا ہے اور ایک نیا ڈھانچہ انتہائی متنوع سماجی قوتوں کے آزادانہ عمل کے ذریعے وجود میں آتا ہے"

بالائی ڈھانچے کی اضافی، آزادی اور اس کا فعّال کردار۔ بالائی ڈھانچہ جسے بنیاد وجود میں لاتی ہے، اضافی آزادی کا حامل بھی ہوتا ہے جس کا اظہار اس کے فروغ کے تسلسل میں ہوتا ہے۔ بالائی ڈھانچہ کا انقلاب جو اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب کہ پرانی

بنیاد کی جگہ نئی بنیاد لے لیتی ہے، یہ معنی نہیں رکھتا کہ پرانے بالائی ڈھانچے کی تمام خصوصیات خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ پرانی بنیاد کی تباہی کے ساتھ پرانا ڈھانچہ بحیثیت مجموعی، پرانے سماج کے نظریات اور اداروں کے نظام کی حیثیت سے باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس کی انفرادی خصوصیات بنیاد سے زیادہ زندہ رہتی ہیں اور نئے سماج کے بالائی ڈھانچے میں داخل ہو کر اس نئے سماج کے طبقات کے کام آتی ہیں اور ان کے مفادات پورا کرتی ہیں۔

ہر سماج کا بالائی ڈھانچہ غیر عبوری خصوصیت بھی رکھتا ہے جو ساری نوع انسانی کے لئے اہم ہوتی ہیں ان میں انسان کے عام اخلاقی معیارات اور فن و ادب کی نفیس ترین تخلیقات شامل ہوتی ہیں

اس تسلسل کی وجہ سے ہر سماج کا بالائی ڈھانچہ انتہائی پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس میں وہ خیالات اور ادارے بھی شامل ہوتے ہیں جو پرانے سماج سے ورثہ میں ملے ہوتے اور وہ خیالات ہیں جو اس کی نئی معاشی بنیاد پر ابھرتے ہیں۔

بالائی ڈھانچے کی اضافی آزادی اس کے اس فعال کردار میں بھی نظر آتی ہے جو یہ اس بنیاد کے فروغ میں ادا کرتا ہے جس کی یہ پیداوار ہوتا ہے۔ ایک مخاصمانہ طبقاتی سماج میں غالب حیثیت رکھنے والے خیالات اور ادارے اس کی بنیاد کو بچانے اور اس کی بنیاد کو بچانے اور اس کو مضبوط کرنے کا کام کرتے ہیں یہ خیالات اور ادارے اس طبقے کی حکمرانی کو جائز ثابت کرتے ہیں جس نے ان کو جنم دیا ہے اور جس کے مفادات کا یہ تحفظ کرتے ہیں، مخاصمانہ سماجوں میں یہ خیالات اور ادارے دیگر طبقات کے خلاف اور خاص طور پر محنت کش طبقات کے خلاف حکمران کی جدوجہد کو مقدس ثابت کرنے اور اس جدوجہد کو منظم کرنے کا نظریاتی وسیلہ ہوتے ہیں۔ وہ استحصال، نوآبادیاتی استبداد اور دیگر اقسام کے استبداد سے آزادی حاصل کرنے کی دوسرے طبقات کی خواہش کو کچلتے ہیں۔

جب سرمایہ دارانہ بنیاد جڑ پکڑ رہی تھی، تو اس وقت بورژوازی کے خیالات اور اداروں نے اس بنیاد کے فروغ اور استحکام میں بڑا فعال حصہ لیا اور جاگیردار طبقے کے

خلاف جدوجہد میں ایک طاقتور ہتھیار کا کام دیا۔ اس وقت بورژوا خیالات اور اداروں کو تمام ترقی پسند قوتوں کو کچلنے کے لیئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ سرمایہ دارانہ بنیاد کو ہر قیمت پر باقی رکھا جائے، سرمایہ داری کے انہدام کو روکا یا کم ازکم ملتوی کیا جائے۔ عصرِ حاضر کی سرمایہ داری کے بچے رہنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے مفادات کا تحفظ بورژوا ریاست قانون کے ذریعہ اور نظریاتی اثر و نفوذ کے تمام وسائل کے ذریعے کیا جاتا ہے جو سرمایہ داری کے دفاع میں ایک انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سوشلسٹ سماج کی بنیاد اور بالائی ڈھانچہ

ہم نے یہاں اب یک سوشلسٹ طرز پیداوار کے وجود میں آنے کی منفرد خصوصیات کا جائزہ لیا اور یہ بتایا کہ سوشلسٹ پیداواری تعلقات، جو سوشلزم کی معاشی بنیاد ہوتے ہیں، کس طرح صورت پذیر ہوتے ہیں۔ سوشلسٹ بنیاد سرمایہ داری کے اندر نہیں پیدا ہوتی، بلکہ صرف اس کی پیدائش کے لیئے ضروری حالات سرمایہ داری کے تحت وجود میں آتے ہیں۔

سوشلسٹ بنیاد از خود تعمیر نہیں ہو جاتی جیسا کہ اس سے پہلے کے مخاصمانہ طبقاتی سماجوں میں ہوتا تھا بلکہ یہ بنیاد سوشلسٹ ریاست کے اقدامات کے ذریعے تشکیل پاتی ہے۔ پرولتاریہ اور اس کی مارکسی۔ لیننی پارٹی کی زیر قیادت محنت کش عوام کی توانائی سے بھرپور اور سماجی لحاظ سے باشعور سرگرمی اس بنیاد کی تخلیق میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔

پرولتاریہ کی آمریت یعنی مزدور طبقے کا سیاسی اقتدار حاصل کر لینا، سوشلزم کی معاشی بنیاد کی تعمیر کے لیئے ایک لازمی شرط ہے۔ پرولتاری ریاست پیداوار کے بنیادی وسائل کو اپنے ہاتھوں میں مجتمع کر لیتی ہے اور شہر اور گاؤں میں سوشلسٹ پیداواری تعلقات کی ایک منصوبہ بند انداز میں تنظیم کرتی ہے۔ زراعت میں مشینوں کا استعمال اور زراعت کی اجتماعیت سوشلزم کی مادی بنیاد کی تعمیر کے اہم مراحل ہیں۔

جیسے جیسے سوشلسٹ بنیاد مضبوط ہوتی جاتی ہے، ویسے ویسے بالائی ڈھانچہ بھی مضبوطی حاصل کرتا جاتا ہے۔ ریاستی مشینری فروغ پاتی اور بہتر ہوتی ہے اور سائنس اور آرٹ ترقی

کی اعلیٰ سطح حاصل کرتے ہیں۔ عوام کے سماجی شعور کی ترتیب نو ہوتی ہے اور کمیونسٹ اخلاقیات کے اصول جڑ پکڑتے ہیں۔ سوشلزم کی فتح اور سوشلسٹ بنیاد کی مضبوطی کے ساتھ سوشلسٹ بالائی ڈھانچے کی تشکیل کا سلسلۂ عمل بھی ختم ہو جاتا ہے

بنیاد کے برخلاف، سوشلسٹ بالائی ڈھانچے کی انفرادی خصوصیات سرمایہ داری کے کے اندر ظاہر ہو جاتی ہیں مارکسی اور لیننی نظریہ، مزدور طبقے کی پارٹی ٹریڈ یونینیں، پرولتاری اخلاقیات، پرولتاری ادب و آرٹ اس وقت نمودار ہو جاتے ہیں جب کہ ابھی سرمایہ دارانہ بنیاد ہی موجود ہوتی ہے اس کے بعد یہ خصوصیات سوشلسٹ سماج کے بالائی ڈھانچے میں میں منتقل ہو جاتی ہیں اور سوشلسٹ سماج کا بالائی ڈھانچہ بھی سابقہ ادوار کی سائنس، ثقافت اور فلسفے کی نفیس ترین کامیابیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ تاہم یہ خصوصیات سوشلسٹ بالائی ڈھانچے کی کلیت کی، خیالات، اداروں اور تنظیموں کی مجموعیت کی تشکیل نہیں کرتیں۔ سوشلسٹ بالائی ڈھانچہ مجموعی طور پر صرف سوشلسٹ بنیاد کی تخلیق کے ساتھ ہی تشکیل پاتا ہے۔

آیئے اب دیکھیں کہ سوویت سوشلسٹ سماج کا بالائی ڈھانچہ کس طرح تشکیل پذیر ہوا تھا۔ سوشلسٹ بنیاد کے اہم ستونوں کی تخلیق سوویت اقتدار کے اولین مہینوں میں اسی وقت عمل میں آ گئی تھی۔ جب پیداوار کے اصل وسائل کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا۔ تقریباً اسی عرصہ میں پرانی ریاستی مشینری کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا اور پرولتاری ریاست جو سوشلسٹ بالائی ڈھانچے کی ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے، قائم کر دی گئی تھی ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو عوامی کمیساروں (وزیروں) کی کونسل قائم ہوئی۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں کل روس غیر معمولی کمیشن قائم کیا گیا جس کا مقصد انقلاب دشمنی اور سبوتاژ کے خلاف جدوجہد کرنا تھا۔ سرخ فوج کو منظم کرنے کے فرمان پر ۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو دستخط ہوئے اور سرخ بحریہ کے قیام کے فرمان پر ۱۴ فروری کو دستخط ہوئے۔ اس وقت مرکزی اور مقامی حکومتی ادارے بھی قائم ہو گئے۔

سوشلسٹ بالائی ڈھانچہ سوشلسٹ آئیڈیالوجی اور اس سے مطابقت رکھنے والے

اداروں، یعنی سوشلسٹ ریاست، کمیونسٹ پارٹی، ٹریڈیونینوں، نوجوان کمیونسٹ لیگ، نیز ثقافتی، تعلیمی، وخاص کھیلوں کی اور دیگر تنظیموں کے مجموعے پر مشتمل ہوتا ہے۔

یہ بالائی ڈھانچہ مخاصمانہ طبقاتی سماجوں کے بالائی ڈھانچوں، خاص طور پر عصرِ حاضر کے سرمایہ دارانہ بالائی ڈھانچے سے بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔

ترقی پسند سوشلسٹ بنیاد بالائی ڈھانچے کی نوعیت کا اس کی موثر، انقلابی، بدلتی ہوئی نوعیت کا بھی تعین کرتی ہے۔ یہ تاریخ کے حقیقی عمل کی، سرمایہ داری سے کمیونزم کی جانب نوعِ انسانی کی تابع قانونِ پیش قدمی کی عکاسی کرتی ہے اور اس پیش قدمی میں ہر طرح سے مدد بہم پہنچاتی ہے۔

سوشلسٹ سماج کے بالائی ڈھانچے میں کسی قسم کے مخاصمانہ تضادات نہیں ہوتے۔ اس کا تعین سوشلسٹ بنیاد کی وحدت اور اہم آہنگی سے ہوتا ہے۔ سوشلسٹ سماج میں ایسے طبقات وجود نہیں رکھتے جو رجعت پرستانہ خیالات کی تشہیر کا وسیلہ ہوں تمام محنت کش عوام سوشلسٹ سماج کی ترقی اور کمیونزم کی جانب اس کی پیش قدمی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ سب کے سب سوشلزم کی معاشی بنیاد کو مستحکم کرنے اور اس کے بالائی ڈھانچے کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

سوشلسٹ سماج میں بھی پسماندہ خیالات موجود ہو سکتے ہیں لیکن وہ سوشلسٹ بالائی ڈھانچے کا حصہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ سرمایہ داری سے ورثے میں ملے ہوتے ہیں اور سوشلسٹ بنیاد کی پیدا نہیں ہوتے۔

سوشلسٹ بالائی ڈھانچہ ایک حقیقی معنوں میں جمہوری کردار کا حامل ہوتا ہے۔ یہ محنت کش عوام کے مفادات کی نگرانی کرتا ہے اور ان مفادات کے پرچم کو بلند رکھتا ہے، اور جواباً اسے محنت کش عوام کی مسلسل حمایت حاصل رہتی ہے۔ یہ چیز سوشلسٹ بالائی ڈھانچے کی سرگرمی اور اس زبردست اثر کا سبب ہوتی ہے جو بالائی ڈھانچہ بنیاد کی ترقی اور سارے سوشلسٹ سماج کے فروغ پر ڈالتا ہے۔ جیسے جیسے سوویت سماج کمیونزم کی جانب پیش قدمی کرتا ہے، ویسے ویسے بالائی ڈھانچے کی اہمیت میں اور بنیاد اور

پورے سماج کی ترقی پر اس کے اثر پر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ سوشلسٹ بالائی ڈھانچہ اور بالخصوص اس کے بنیادی اجزائے ترکیبی، یعنی سوویت ریاست اور کمیونسٹ پارٹی جو ملک کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کی تنظیم کرتی ہیں۔ کمیونزم کی کامیاب تعمیر میں ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بنیادی باتیں میں نے اس لیے قلم بند کی ہیں تاکہ ہمارے جیسے ممالک میں سوشلسٹ روس کے اندر مذہبی رویوں اور ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھا جا سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں جہاں مختلف طبقے موجود ہیں، اور ان کے درمیان تضادات بھی ہیں اور مخاصمت بھی وہاں پہلے سو سال میں مذہبی رویوں میں کئی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور اب بھی مسلسل ہو رہی ہیں۔

۴ر جولائی ۷۹ء ۔ رات اپنے پرانے دوست طاش مرزا کے ہاں محفل بہت دیر تک جمی رہی جس کی وجہ سے صبح اٹھنے پر کافی تاخیر ہوئی۔ رات کی محفل بس یہی سمجھنا چاہیے کہ پاکستان میں بے تکلف دوستوں کی محفل تھی، تقریباً بارہ تیرہ مہمان تھے ان میں کوئی چھ گھنٹے یہ محفل رہی اور پورے چھ گھنٹوں میں ایک لمحے کے لئے بھی مترجم کی ضرورت نہیں پڑی اور پوری گفتگو اردو میں ہی ہوتی رہی۔ یہاں غالب کی غزلوں سے قتیل اور احمد فراز تک کی غزلیں ان ازبک اساتذہ نے گا کر سنائیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی اردو کی غزلیں اور گیت بھی سنائے اور اب اسداللہ کے ہاں رات کا کھانا ہے۔

اسداللہ کا گھر تاشقند کے پرانے محلے میں ہے اور یہ گھر بالکل ازبک کھاتے پیتے لوگوں کے گھروں سا ہے، پرانی طرز کا بالکل ازبک سٹائل ان گھروں کی وسعت اور زیبائش کا باہر سے اندازہ نہیں ہوتا یہ باہر سے بالکل حویلی نما ایک دروازہ تھا جس سے گذر کر ہم اندر گئے اندر صحن میں باغ تھا جس میں پھل، پھول، سبزیاں اگی ہوئی تھیں اور صحن نما باغ کے دونوں طرف برآمدے اور کمرے تھے۔ یہ کمرے سونے اور ایک طرح کے ڈرائینگ روم اور کھانے کے کمروں کے لئے استعمال ہوتے تھے، ہمارے لئے باغ کے کونے میں کھلے آسمان تلے کرسیاں ڈال کر اور میزیں بیٹھنے اور کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اسداللہ کی ماں سے ملاقات ہوئی، بزرگ خاتون نے پیار

گیا، دعائیں دیں کچھ دیر بیٹھی رہی، باتیں کرتی رہی۔ اسد اللہ ترجمہ کرتا رہا پھر نماز کے لئے اجازت چاہی اس کے بعد قریب ہی اس کی بیٹی اور داماد رہتا ہے بڑی بی نے بتایا کہ آج اس کے داماد کی سالگرہ ہے اس لئے اس کو مبارک دینے کے لئے جانا ہے۔

اسد اللہ نے بتایا کہ اس کی ماں کا سال پیدائش ۱۹۱۹ ہے ان کے باوا کا سال پیدائش ۱۹۰۹ تھا اور ان کا انتقال چار سال پہلے ہوا تھا۔ اسد اللہ کے دس بہن بھائی ہیں۔ آج یہاں کھانے کے دوران اور کل رات طاش مرزا کی دعوت سے ایک بات کا پتہ چلا کہ ازبک کے ہاں پرانے زمانے کی مہمان نوازی کے طور طریقے اب بھی رائج ہیں یعنی اتنے کھانے اور اتنی مقدار میں کہ مہمان دیکھ دیکھ کے ہی گھبرا جائے۔ چنانچہ اتنی مقدار اور اتنی تعداد سے زیاں کا بھی احساس ہوتا ہے چنانچہ ان سے پتہ چلا شادیوں پر بھی ہماری طرح کم ازکم سو ڈیڑھ سو افراد کا کھانا پکتا ہے اور اس میں اچھی طرح رنگا رنگ کے کھانے پکتے ہیں مرگ پر بھی ہماری طرح سوئم، جمعرات، دسواں، چالیسواں اور سال کا ختم ہوتا ہے میرا خیال تھا کہ ہم نے یہ رسومات ہندوؤں سے لی ہیں لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ عادات اور رسوم ہم کو ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کو ان خطوں سے ملی ہیں۔

اسد اللہ اور طاش مرزا کے دسترخوانوں پر کھانوں کی یکسانیت کا احساس ہوا بہت حد تک ہم سے ملتے جلتے ہیں ویسے یہاں کے مرغوب کھانے جو میں نے دیکھے ہیں ان میں پلاؤ، شیشلک یعنی سیخ کباب، شوربہ، لاگمانی یعنی سویاں اور اپنی طرح ازبک سموسے جنہیں پانتی کہتے ہیں عام استعمال ہوتے ہیں، اس کے علاوہ دسترخوان پر رنگا رنگ کے پھل بہت بڑی تعداد میں اور مقدار میں میسر آتا ہے، چنانچہ یہاں خربوزہ جو تربوز جتنا بڑا تھا کھایا بلا کا میٹھا تھا۔

رات کو بارہ بجے کے قریب محفل برخاست ہوئی تو اسد اللہ کی بیوی بیٹیاں سبھی بے حد تپاک اور جذبات سے ملیں اور خدا حافظ کہا چنانچہ میں راستے میں یہی سوچتا رہا کہ ازبکستان کے اجنبیوں سے ماسکو کے ہوٹل میں ملاقات ہوئی اور انہیں جب معلوم ہوا کہ پاکستان سے ہوں، مسلمان ہوں تو وہ گھل مل گئے اور خیریت معلوم کی اور

پیار کا اظہار کرنے لگے اور دو دن سے تاشقند میں ازبک دوستوں کے گھروں میں جس پذیرائی ہوئی، رات اسداللہ کی بیوی بچے بچیوں نے نصف شب کو جس طرح جذباتی انداز میں الوداع کہا اور سب بھاگم بھاگ باہر تک مجھے چھوڑنے آئے سب کی آنکھوں میں پیار اور جدائی کا احساس نمایاں تھا یہ سب کیوں ہے؟ یہ سوویت یونین کے دوسرے خطوں میں نہیں ہے۔ مہمان نوازی وہ بھی کرتے ہیں، پیار کا اظہار بھی ہوتا ہے لیکن اس میں جذبات کی یہ شدت نہیں ہوتی ایک دوستی اور نظریات کی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے لیکن وسطی ایشیا کے ان خطوں میں جو اپنائیت ہے اس میں تہذیبی اور تاریخی قربت کے ساتھ دینی رشتوں کا بھی احساس ضرور پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا اظہار بھی ہوتا رہتا ہے اور جیسے جیسے آمد و رفت بڑھے گی ایک دوسرے کو جانیں گے تو یہ رشتے یہ پرانی تاریخ اور تہذیب کی ہم آہنگی یہ سب اور نمایاں اور واضح ہوتے جائیں گے۔

۶ر جولائی ۹۰ء صبح کے پونے سات بجے ہیں یہ دوشنبے کا شہر ہے اس شہر میں بھی آگے ۱۹۷۷ء میں آچکا ہوں، اس کے حسن، سبزہ اور خاموش و پرسکون زندگی کے بارے میں بھی لکھ چکا ہوں لیکن اس دفعہ سب سے پہلے میری ملاقات یہاں تاجکستان کی جمہوریہ کی سپریم سوویت کی مجلس صدارت کی سیکرٹری سے ہوئی، یہ خاتون عبادت رحیم اللہ ہیں جو سیکرٹری کے اہم عہدے پر فائز ہیں اور اس لحاظ سے یہ پوری جمہوریہ کی سب سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان سے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گپ رہی مہمانوں نے بتایا کہ ۶۰ فیصد ہماری آبادی جوانوں پر مشتمل ہے اور اس ۳۸ لاکھ کی کل آبادی میں سے ۱۰ لاکھ سیکنڈری سکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور بہت بڑی تعداد مخصوص مضامین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اسی طرح ہر شعبے میں عورتوں کی نمایاں حیثیت حاصل ہے جمہوریہ کی ۳۸ لاکھ کی کل آبادی میں سے ۵۷ فیصد تاجک ۲۷ فیصد ازبک اور ۱۲ فیصد روسی ہیں اور تمام سرکاری احکام تاجکی، ازبکی اور روسی زبان میں جاری کئے جاتے ہیں۔

مادری زبان کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ہر قومیت کی آبادی

ہری زبان میں تعلیم دینے کا اہتمام ہے چنانچہ ذریعہ تعلیم ایک طرف تاجکی ہے تو اس کے ساتھ ہی ازبکی اور روسی میں بھی تعلیم دی جاتی ہے حتیٰ کہ کچھ علاقوں میں جرمن آباد ہیں وہاں جرمنی ہی ذریعہ تعلیم ہے چنانچہ جو زبان بھی ذریعہ تعلیم ہوتی ہے اس کے نصاب کی کتابیں انہی زبانوں کے علاقوں سے منگوائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں بھی تینوں زبانیں تاجک، ازبک اور روسی زبانیں استعمال ہوتی ہیں۔

جمہوریہ تاجکستان کی جمہوریہ کی سپریم سوویت کے اراکین کی کل تعداد ۳۵۰ ہے اور ان میں سے خواتین کی تعداد ۱۱۱ ہے اور جمہوریہ میں سوویتوں کی تعداد ۴۳۱ ہے۔ جمہوریہ میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد ایک لاکھ ہے سپریم سوویت کے اراکین کے ۴۴ فیصد کمیونسٹ ہیں جب میں نے اس چاک چوبند خاتون سے ذاتی سوال کئے تو مسکرا کر کہنے لگی کہ میری پیدائش ۱۹۲۲ء کی ہے اور میرا گھرانہ مزدوروں کا ہے، میں لینن آباد کی رہنے والی ہوں، میرا خاندان اسی علاقے سے تعلق ہے یہ علاقہ پہلے ہوجن کے نام سے مشہور تھا اور بہت انقلابی علاقہ تصور ہوتا تھا اور ۱۹۱۷ء میں انقلابی تحریک کا آغاز اسی علاقے سے ہوا تھا۔ میرے خاندان میں چھ بچے تھے، چار بہنیں اور دو بھائی یہ انقلاب کی برکتیں تھیں کہ ہمیں تعلیم کے حصول کے مواقع میسر آئے چنانچہ میں نے ۱۹۴۱ء میں اساتذہ کے تربیتی سکول سے ڈگری حاصل کی اور جنگ کے دوران میں ایک سکول میں استانی کے فرائض ادا کرتی رہی ۱۹۴۳ء میں جب میری عمر ۲۱ برس تھی تو میں نوجوان کمیونسٹ لیگ میں شرکت اختیار کی اور اسی زمانے میں میری شادی ہوگئی میرے میاں بھی کمیونسٹ ہیں اور سرکاری ملازم ہیں ۱۹۴۸ء میں نوجوان کمیونسٹ لیگ کی ضلع کمیٹی کی سیکرٹری منتخب ہوئی اور ۱۹۵۷ء میں جمہوریہ کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کی سیکرٹری چنی گئی، اس کے بعد مجھے پارٹی کام کی مزید تربیت کے لئے ماسکو میں پارٹی سکول میں بھیج دیا گیا جہاں میں نے دو سال تک پارٹی کام کے لئے اعلیٰ تعلیم اور تربیت حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں واپس آئی اور پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سیکرٹری کے طور پہ کام کرتی رہی ہوں ۱۹۵۱ء سے

نارکن چلی آرہی ہوں میری ایک لڑکی ہے لیکن تین نواسیاں ہیں میری لڑکی
خزکس کی پروفیسر ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ مغرب میں تو یہ پراپیگنڈہ عام ہو رہا ہے کہ وسطی ایشیائی جمہوریتوں میں آبادی کی رفتار بہت تیز ہے اور وہ دن دور نہیں جب ان کی آبادی رسیوں سے بڑھ جائے گی میرے سوال پر وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں کہ یہ درست ہے کہ یہاں آبادی کی رفتار بہت تیز ہے کیونکہ ہم آبادی کے اضافے کو ترجیح دیتے ہیں اور ہمارے اکثر جمہوریتوں میں پانچ، سات، دس بلکہ اس سے بھی زیادہ بچوں کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں تصور کی جاتی ۱۹۴۵ کے بعد سے یعنی جنگ کے بعد ۳۵ برسوں میں ۲۰ لاکھ سے زائد ازبک خواتین کو جنہوں نے سات یا اس سے زائد بچے پیدا کر کے ان کی پرورش کی "ماں کی شان" نامی آرڈر مل چکا ہے ان میں ۶۰۰ ہزار ازبک خواتین بھی ہیں جنہوں نے دس یا اس سے زائد بچے پیدا کر کے ان کی پرورش کی اور اپنی "ماں ہیروئن" نامی اعزازی خطاب ملا ہے اسی طرح سے عبادت فرما رہی تھیں کہ خود تاجکستان میں شرح پیدائش ایک طرح سے ازبکستان سے بھی زیادہ ہے چنانچہ پچھلے دس سال میں ہماری جمہوریہ کی آبادی میں ۳۱ فیصد اضافہ ہوا ہے چوتھے بچے کے بعد سے حکومت ہر بچے کی پیدائش پر خاندان کو خاص وظیفہ دینا شروع کر دیتی ہے اور دس بچوں کے بعد "ماں ہیروئن" کا خطاب دیا جاتا ہے اس وقت اس ۳۸ لاکھ کی آبادی والی جمہوریہ میں ۱۷ ہزار عورتوں کو ماں ہیروئن کا خطاب مل چکا ہے۔ ویسے جمہوریہ میں ۵۱ فیصد آبادی عورتوں پر مشتمل ہے اب خود ہی سوچئے کہ جہاں آبادی میں اضافے کے رجحان کو بڑھاوا دیا جا رہا ہو وہاں ڈر کس کو ہو گا اور روسی اس امر سے لرزاں و ترساں نہیں ہیں، دراصل یہ خوف اور ڈر سرمایہ داری نظام میں ہوتا ہے جہاں بے روزگاری کا ڈر ہر وقت ستائے رکھتا ہے پھر سرمایہ دار ممالک میں جہاں پر ایک سے زیادہ قومیتیں آباد ہوتی ہیں وہاں ایک قومیت جو عددی طور پر بڑی ہوتی ہے جس کے پاس ذرائع ہوتے ہیں وہ دوسری قومیتوں کو اپنی اکثریت اور دولت کی بنیاد پر لوٹتی ہے، استحصال کرتی ہے۔ اس لئے وہاں چھوٹی قومیتوں کے آبادی میں اضافے سے ڈر لگتا ہے لیکن یہاں پر تو خود روسیوں نے وسطی ایشیا کی

جمہوریتوں کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اس لئے ان کو ازبکوں یا تاجکوں کی آبادی میں اضافے سے کیا ڈر ہو سکتا ہے ؟

جمعہ کی نماز

اس وقت دو بجے ہیں اور میں دوشبنے کی جامع مسجد کے امام کے کمرے میں بیٹھا اس کا خطبہ سن رہا ہوں اور تقریباً تین چار سو نمازی اس مسجد میں جمع ہیں جو خطبہ سن رہے ہیں ان میں اکثریت درمیانی عمر کے ہیں یعنی چالیس پچاس سال کے درمیان یہ سب کے سب انقلاب کے بعد یعنی کمیونسٹوں کے اقتدار میں آنے کے بعد کی پیدائش ہیں جب میں مسجد میں داخل ہو رہا تھا تو لوگ میرا نام پوچھ رہے تھے جب میں نام بتایا تو یہ الحمداللہ کہتے ۔ حجرے میں امام کا لڑکا بھی ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور ہماری خاطر تواضع کر رہا ہے اس کا نام عباد اللہ ہے ، دوشبنے یونیورسٹی سے اس نے گریجویشن کی ہے ، عربی فرفر بولتا ہے ۔ انگریزی بھی ٹوٹی پھوٹی جانتا ہے خطبہ ختم ہو گیا ہے نماز شروع ہونے لگی دوسری اذان ہو رہی ہے ۔ نمازیوں کی اکثریت مخصوص تاجک لباس میں ملبوس ہیں عباد اللہ سے میں نے کہا کہ اب تم جیسے نوجوانوں کے ہاتھ میں اسلام محفوظ ہے تو وہ کہنے لگا کہ ہمارے مذہب کے لئے کوئی مجبور نہیں کر سکتا چنانچہ وہ ہمارے ساتھ بیٹھا رہا اور اس نے نماز ادا نہیں کی، نہ ہی اس نے ہمیں اپنی کسی بات سے خوامخواہ متاثر کرنے کی کوشش کی۔

اتنے میں امام مسجد الحاج عبداللہ مرزا کلاں کمرے میں داخل ہوتے ہی معذرت کی ، بڑی گرمجوشی سے معانقہ اور سینے سے لپٹا لیا ۔ کہنے لگے کہ جمعہ کی نماز کے بعد لوگ مسئلے مسائل پوچھنے لگ جاتے ہیں اس وجہ سے فراغت دیر سے ہوئی ہے وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے فارسی میں بولتے تھے جو میں سمجھ لیتا تھا زیادہ تر گفتگو فارسی میں ہی ہوئی ان کی عمر ۶۵ سال ہے یہ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے کہنے لگے ۔ میں قاضی ہوں اور پورے تاجک کے مسلمانوں کا دینی سربراہ ہوں ۱۹۵۸ء سے اس عہدے پر فائز ہوں ۔

میں کسان گھرانے میں پیدا ہوا، میں نے ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی، میرا والد ملا تھا اور حافظ قرآن کے ساتھ کاتب قرآن بھی تھا، دادا بھی حافظ اور کاتب قرآن تھا چنانچہ ان کے لکھے ہوئے نسخوں کی ہندوستان میں نمائش بھی ہو چکی ہے۔ ۱۲ برس کی عمر میں میرے والدین فوت ہو گئے۔ اور میری تربیت بابا خان مفتی ضیاء الدین کے والد نے کی تھی کیونکہ میرے والد بابا خان ضیاء الدین کے والد کے جگری دوست تھے۔ میں ۵ سال تاشقند میں رہا۔ ۱۰ سال سمرقند میں اور اب بیس برس سے دوشنبے میں ہوں“

وہ کہنے لگے ”میں سوویت پاکستان دوستی کی انجمن کا نائب صدر بھی ہوں سوویت عرب دوستی کی انجمن کا سرگرم رکن ہوں، اس طرح سے میں چھ مختلف شعبوں میں سرگرم عمل رہتا ہوں یہاں شیعہ اور اسماعیلیوں اور سنیوں کے درمیان تعلقات بہت اچھے ہیں ان کے اپنے امام ہیں لیکن بخارا اور تاشقند کے مدرسوں شیعہ اور سنی اکٹھے پڑھتے ہیں انقلاب سے پہلے شیعوں سنیوں اور اسماعیلیوں کے درمیان زبردست اختلافات تھے اور فسادات بھی ہوتے رہتے تھے لیکن اب کوئی ایسا مسئلہ نہیں رہا۔ تعلیم فقہ حنفی میں دی جاتی ہے اور دینی تعلیم کے ساتھ تاریخ عالم، جغرافیہ، روسی زبان، فلسفہ، فارسی اور عربی پڑھائی جاتی ہے“۔

ذاتی زندگی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے کہ پوتے پوتیاں والا ہوں تو نواسے بھی ہیں، میری چھ اولادیں ہیں۔ بڑا لڑکا حبیب اللہ لیبیا میں روسی سفارت خانے میں مترجم کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کی بیوی کا نام زینب ہے اور اس کے دو لڑکے ہیں عزیز اللہ اور عزت اللہ، یہ لڑکا انگریزی عربی اور روسی میں مہارت رکھتا ہے اس سے چھوٹا لڑکا عباد اللہ آپ کے ساتھ بیٹھا ہے یہ عراق میں سفارت خانے میں مترجم ہے اس کی بھی شادی ہو چکی ہے اور ایک لڑکا ہے دو لڑکے نعمت اللہ اور ذکر اللہ دوشنبے یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں۔ لڑکی کا نام عائشہ ہے دوشنبے یونیورسٹی سے اردو میں ڈگری لی ہے اور اس کی شادی ہو گئی اس کے خاوند کا نام مقصود ہے اور دو بچے ہیں فرخ مرزا اس سے چھوٹی لڑکی کا نام شاعرہ ہے اور وہ پڑھتی ہے۔

مسکرا کر کہنے لگے کہ تمہارے ملکوں میں تو یہی پراپیگنڈہ کے مذہب میں یقین رکھنے والوں کی اولادوں کو ملازمتیں نہیں دی جاتیں لیکن تم دیکھ لو کہ میرے دو لڑکے سوویت یونین کے سرکاری ملازم ہیں اور بیرون ملک نمائندگی کر رہے ہیں۔ افغانستان کے بارے میں بات چلی تو کہنے لگے کہ کل جو ہمارے متعلق پراپیگنڈہ کہ مذہب ختم ہو گیا ہے مسجدیں مقفل ہو گئی ہیں وہی آج افغانستان کے انقلاب کے بارے میں کہا جا رہا ہے لیکن سچ بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔

آخر میں بہت معذرت کے ساتھ ان کی آمدنی کے ذرائع اور خاندان کے بجٹ کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے کہ سوویت ریاست میں کوئی نہ تو بیکار ہے نہ بے روزگار اس کو مکان، تعلیم، طبی سہولت، بڑھاپے کی پنشن سب کی آئینی طور پر ضمانت حاصل ہے اب میں جو کام کرتا ہوں اس کے لئے مجھے معاوضہ مسلم بورڈ کی طرف سے ملتا ہے اور جو معاوضہ ملتا ہے وہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے بہت کافی ہے پرانے دنوں میں ہمارے ہاں کے پیروں اور فقیروں کو گزر بسر کے لئے نذر نذرانے پر تکیہ کرنا پڑتا تھا اور اس طرح سے پیر فقیر چاہیں یا نہ چاہیں امرا کے دستِ نگر ہو جاتے تھے اور اس سے ہر قسم کی آلائشیں پیدا ہوتی تھیں لیکن ہمارے ہاں صورت حال بدل گئی ہے۔ سارے سوویت عوام خواہ وہ کسی بھی مذہب کو ماننے یا نہ ماننے والے ہوں کام کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ لیتے ہیں جس سے بے پناہ خوشحالی آئی ہے اس لئے اب نذر و نذرانے کا رواج ختم ہو گیا ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے ہاں زکوٰۃ یا فطرانہ، یا خیرات یا قربانی ختم ہو گئی ہے نہیں بلکہ اب ان تمام مدات کی آمدنی میں نظم و ضبط پیدا ہو گیا ہے اور پھر جسم کی مدات کے لئے الگ الگ بنکوں کا اہتمام کیا گیا ہے مثلاً ایک بنک مساجد کی دیکھ بھال کے لئے رقوم جمع کرتا ہے اس مد میں حکومت کا محکمہ آثار قدیمہ بھی مدد کرتا ہے، اسی طرح سے غیر ملکی مسلمانوں سے تعلقات کے سلسلے میں بھی ہم چندہ لیتے ہیں، مذہبی لٹریچر بھی شائع کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہمیں اب کسی بھی مد میں سرمائے

کی کمی نہیں ہے۔ اب ایک ایک مسجد کے پاس اتنا سرمایہ ہوتا ہے کہ ہم بین الاقوامی کانفرنسوں کے اخراجات اور ان کانفرنسوں میں شریک ہونے والے مندوبین کے تمام اخراجات برداشت کرتے رہتے ہیں۔

جب میں نے خدا حافظ کہا تو کہنے لگے شما عبداللہ، من عبداللہ اور پاکستان کے تمام اللہ کے بندوں کو ہمارا اسلام محبت پہنچا دیجئے گا۔

عبداللہ ملک

کے

کیوبا سے چند خطوط

- کیوبا ایک ننھا سا خوبصورت جزیرہ ہے جو امریکہ سے فقط ۹۰ میل دور ہے۔
- اس ننھے سے جزیرے میں امریکی سامراج کی کاسہ لیس حکومت تھی۔ امریکی ارب پتی یہاں کے خدا تھے لیکن کیوبا جو چند لاکھ نفوس کی آبادی کا ملک ہے وہاں انقلاب بپا ہوا اور ایک سوشلسٹ جمہوریہ قائم ہوئی۔
- آج کیوبا دیس دیس کے حریت پسندوں اور انقلابیوں کی امداد میں پیش پیش ہے، تمام سامراجی کیوبا کے خلاف شور مچا رہے ہیں لیکن کیوبا کے انقلابی کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں، کہ "ہم جانبدار ہیں" "ہم انقلاب کے حامی ہیں"۔ ہر دیس جہاں کے انقلابی ہمیں امداد کے لئے بلائیں گے ہم وہاں موجود ہوں گے۔

عبداللہ ملک نے اس خوبصورت جزیرے کا ایک ماہ دورہ کیا۔ یہاں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کلچرل کانگرس میں شرکت کی۔

عبداللہ ملک اپنے اس دورے کے تاثرات ہی بیان نہیں کرتا بلکہ وہ اس جزیرے کی۔ کی، امریکی مداخلت کی پوری تاریخ بیان کرتا ہے۔

عبداللہ ملک یہ بھی بتاتا ہے کہ امریکہ کس طرح سماجی تبدیلیوں کو روکتا ہے اور انقلاب کی راہ میں کیسے رکاوٹ ڈالتا ہے وہ کیسے مختلف ملکوں میں کٹھ پتلی حکومتیں قائم کرتا ہے۔

غرضیکہ یہ صفحات کیوبا ہی کی نہیں بلکہ فیڈل کاسترو، چی گویرا اور عالمی انقلابی تحریک کی تفصیلی داستان ہے۔

صفحات:- ۲۲۵، ۱۸×۲۲/۸

قیمت:- ——— ۲۵ روپے

شوکت حیات کالونی، ماڈل ٹاؤن لاہور

ارضِ جنت

سوویت یونین

نیا آئین اور سفرنامہ

یہ عبداللہ ملک کی نئی کتاب ہے۔

سویت روس دنیا کا سب سے متنازعہ ملک ہے اور سب سے وسیع ملک بھی ہے۔
ایک عالم کے مجبور اور مقہور انسان اگر اس سے محبت کرتے ہیں تو امریکی جنگ بازوں سے لے کر پاکستان کے رجعت پسندوں تک سبھی اس کے خلاف تلوار بدست میدان کارزار میں اترنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔

آخر کیوں؟

کیا واقعی سوویت روس اتنا بُرا ملک ہے؟ کیا وہ ہمارا ہمسایہ نہیں ہے؟ کیا اس نے پاکستان کو توڑا ہے؟ کیا وہاں انسانی حقوق محفوظ نہیں؟ کیا وہاں جمہوریت نہیں ہے؟ کیا وہاں شہری آزادیاں نہیں ہیں؟ کیا وہ ایک عظیم سوشلسٹ ملک نہیں ہے؟ جس میں بیروزگاری ختم ہو گئی ہے جس میں مہنگائی نہیں ہے۔

ان تمام سوالوں کا جواب عبداللہ ملک نے اپنی اس کتاب میں دیا ہے۔ عبداللہ ملک نے پچھلے دنوں ایک مہینہ سوویت روس میں گزارا اور یہ ایسا وقت تھا جب سوویت روس اپنا نیا آئین منظور کر رہا تھا۔ چنانچہ عبداللہ ملک نے سوویت روس کے تمام پچھلے آئینوں یعنی ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۴ء، ۱۹۳۶ء کے آئینوں کی ایک طرف تاریخ اور وہ پس منظر بیان کر دیا ہے تو دوسری طرف ۱۹۷۷ء کے آئین کا پس منظر اور اس کی اہم خصوصیات کو شرح و بسط کے ساتھ قلم بند کر دی ہیں اور آئین بھی درج کر دیا ہے۔

سوویت یونین ایک عظیم سوشلسٹ ملک ہے۔ ہمارا عظیم ہمسایہ ہے اسی کے متعلق جاننا از بس ضروری ہے۔ امریکی اور مغربی ممالک یا ہمارے ہاں کے سرمایہ داروں کے ہمنوا اخباروں پر تکیہ کرنا اور یقین کرنا اپنی قوم سے اپنے پاکستان سے غداری ہے۔ یہ کتاب آپ کے علم میں اضافہ ہی نہیں کرے گی بلکہ آپ کے بہت سے شکوک اور غلط فہمیاں بھی دور کرے گی۔

قیمت ۲۵/ روپے

کوثر پبلشرز (۰) ۴۶ شوکت حیات کالونی نیو
ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔ فون ۸۵۱۴۰۰